سبق اردو نومبر 2025 1

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education
Government of India
فروغ اردو بھون

Farogh-e-Urdu Bhawan
FC-33/9, Institutional Area
Jasola, New Delhi-110025

Website.: www.urducouncil.nic.in
E-mail.:publicrelation.ncpul@gmail.com
:urduduniyancpul@yahoo.co.in

Tel: No.: 011-49539000
Fax No.: 011-49539099

Dated:13/11/2025

قومی اردو کونسل میں 'سائبر ہائجین اور سائبر کرائم اویئرنیس' پر خصوصی لیکچر

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے صدر دفتر میں آج 'سائبر ہائجین اینڈ سائبر کرائم اویئرنیس' پر خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر ایم۔ این۔ ہدی نے اپنے لیکچر میں اس اہم موضوع پر نہایت معلوماتی اور مفید گفتگو کی۔ مہمان مقرر کا استقبال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ سائبر فراڈ سے بچنا آج کے ڈیجیٹل دور میں بے حد ضروری ہے۔ ہم سب چونکہ ڈیجیٹل دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں، اس لیے سائبر کرائم اویئرنیس ہی ہمیں ممکنہ خطرات اور پریشانیوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ پروفیسر ایم۔ این۔ ہدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج ہم ایسے عہد میں جی رہے ہیں، جس میں بعض جرائم ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور بعض پوشیدہ طور پر انجام پاتے ہیں، جن میں سائبر فراڈ بھی شامل ہے۔ لیکچر میں انھوں نے ڈیجیٹل دنیا میں محفوظ رہنے کے طریقوں، ٹیکنالوجی کے درست استعمال اور عمومی طور پر کی جانے والی غلطیوں سے بچاؤ پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے زور دیا کہ سائبر فراڈ سے بچنے کے لیے ہمیں اپنے طرزِ زندگی میں تبدیلی لانے اور ڈیجیٹل شعور کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

پروگرام کے اختتام پر جناب شاہ نواز خرم (ریسرچ آفیسر) نے شکریے کے کلمات ادا کیے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کا پورا عملہ موجود تھا۔

(رابطہ عامہ سیل)

سبق اردو نومبر 2025
2

سبق اردو

جلد: ۱۰، شمارہ :11
website: sabaqeurdu.com
E-mail: sabaqeurdu@gmail.com
نومبر ۲۰۲۵

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: محمد سلیم
سرنامۂ سرورق : عادل منصوری
Net Banking:SABAQ -E-URDU(MONTHLY)

موبائل: 9696486386,9919142411
سرورق : دانش الہ آبادی
IFSC BARB 0 GOPI BS A/C28240200000214

فی شمارہ:۲۰۰(دوسو روپے)
زرتعاون:۱۰۰۰ (ایک ہزار روپے)
Bank of Baroda, Branch: Gopiganj

مطبع: عظیم انڈیا پرنٹنگ پریس، سنت روی داس نگر، بھدوہی
زرسالانہ:۲۴۰۰ (چوبیس سو روپے
Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کی سنوائی صرف ضلع س۔ر۔ن۔(بھدوہی) ہی کی عدالت میں ہوگی۔ادارہ

دانش الہ آبادی

(چیف ایڈیٹر)

قومی اردو کونسل	قومی اردو کونسل میں 'سائبر ہائجین اور سائبر کرائم اویرنیس' پر خصوصی لیکچر	1
ڈاکٹر رضیہ پروین	مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے مختلف رنگ	4
خیر النساء۔این۔پی	سوشل میڈیا اور اردو زبان کی نئی جہتیں 7	7
ڈاکٹر ثمینہ بی۔کے۔کے	اردو شاعری میں غالبؔ کے اثرات	10
ڈاکٹر شبیر احمد	طلباء کے تعلیمی سفر کی تشکیل میں ہم عصروں کی معاونت کا کردار	12
ڈاکٹر قیصر احمد، آل زہرا زیدی	عمر خیام: شاعر، فلسفی یا سائنسدان	17
ڈاکٹر عزیز رضا	سرخ سویرا کا شاعر: مخدوم	20
ڈاکٹر ثنا اللہ	اردو داستان گوئی کے اہم مراکز: دہلی، لکھنؤ اور رام پور	22
محمد افروز رضا	اردو ناولوں میں تہذیبی و ثقافتی مباحث	26
عینم ضیاء	طلبا کے اکتسابی مواقع پر اساتذہ کی ثقافتی استعداد کے اثرات The effects of Teachers' cultural competence on students' Learning Opportunities	28

سبق اردو نومبر 2025
3

ہاجرہ سلطانہ	اردو زبان پر عبور کے فروغ میں مؤثر اکتسابی حکمتِ عملی (ثانوی درجے کے طلباء کے تناظر میں)	30
الیاس احمد	کتاب چلچلۃ العارفین کی ادبی اہمیت	34
محمد جمال احمد	خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں عناصر تصوف	37
منظور احمد گنائی	اصغر گونڈوی کی شاعری میں صوفیانہ عناصر	41
ڈاکٹر عاشق حُسین میر	''ہزار خواہشیں ایسی''، شعر اور ہمارا سماج	48
شاہجہاں خلجی	ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی بحیثیت ماہر تعلیم (اردو درس و تدریس کے حوالے سے)	52
صدف صدیقی	ڈاکٹر سید تقی عابدی اور فیض فہمی	54
ڈاکٹر شکیل خان	اختر الایمان کی نظم نگاری	56
محمد عارف	فروغ فرخزاد کی فلمی دنیا	59
ڈاکٹر شہباز ارشد	وحشتؔ کلکتوی: حیات اور تصنیفات	62
ڈاکٹر شائقہ آفرین	تحریک آزادی اور اردو	66
گلفشاں خان	مائل ملیح آبادی کے ناول جج اکبر کا تجزیاتی مطالعہ	68
سنجیدہ خاتون	اکیسویں صدی کے تعلیمی نظام میں فلپڈ لرنگ	73
کرشن گوپال مینا	ٹونک راجستھان میں اردو تحقیق : ابتداء تا حال	77
مطہر احمد لوہار، توصیف احمد	نوال السعداوی: عرب حقوق نسواں کی علمبردار	79
ڈاکٹر رشی کمار شرما	ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا نمائندہ شاعر: فراق گورکھ پوری	84
ڈاکٹر شیو پرکاش	ترقی پسند تحریک اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانے	88
مریم صبا	چکبستؔ کی نظموں و غزلوں کا انتخاب: 'روح چکبستؔ' (تنقیدی جائزہ)	92
کھیتاوت رادھیکا	اردو شاعری اور افسانے میں وجودیت اور جدیدیت کا جامع مطالعہ	95
انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے زیر اہتمام	**یوم ذوق منعقد**	97

سبق اردو نومبر 2025
4

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے مختلف رنگ

ڈاکٹر رضیہ پروین

صدر شعبہ اردو
گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج۔رام پور اتر پردیش۔
موبائل:6395632129

شہید وطن محمد علی جوہر کی شخصیت زندگی کے مختلف رنگوں سے رچی بسی ہے، ایسی بے خوفی اور جرات مندی کہ سامنے والا قائل ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ قید و بند کی زندگی اور بیماری نے بھی ان کو ان کے مشن سے پیچھے ہٹنے نہیں دیا، ایک ایک لفظ ایسے اثر دار کہ جو روح کو گرما دے اور قلب کو تڑپا دے۔

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزہ دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزہ ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہ قضا دیکھ

مولانا محمد علی جوہر کی پیدائش بعض محققین کے مطابق نجیب آباد بجنور اور مراد آباد قرار دیتے ہیں جو سراسر گمراہ کن اور بے بنیاد ہے۔ محمد علی جوہر نے اپنی آپ بیتی(: M Y L I F E : A FREGMENTA) میں خود لکھتے ہیں:

"میں ریاست رام پور کے ایک معتبر اور مہذب خاندان میں پیدا ہونے کے سبب مذہب اسلام کی تعلیم حاصل کی۔: چھندواڑا جیل سے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو مولانا محمد علی جوہر ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں رام پور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا داغ , امیر، تسلیم، جلال، عروج وغیرہ دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے ستارے رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔''

(محمد علی جوہر نمبر, نیا دور لکھنؤ صفحہ نمبر 37 فروری تا اپریل 2005)

لہٰذا آپ کی پیدائش 10 دسمبر 1878 کو رام پور میں کوچہ لنگر خانہ میں ہوئی۔ ڈاکٹر زیڈ. اے .صدیقی کے مطابق آپ کی تعلیم رام، علی گڑھ، الہ آباد اور لنکن کالج اکسفورڈ یونیورسٹی لندن میں ہوئی۔ 1902 میں وطن واپس لوٹے اور رام پور میں چیف ایگزیکٹو آفیسر کے عہدے پر مامور ہو گئے۔ کچھ دن بڑودا میں بھی ملازمت کی، مگر ملک کے حالات، ملک وملت کے درد نے آپ کو بے چین رکھا۔ چنانچہ ملازمت کو الوداع کہا اور 1907 میں ٹائمز آف انڈیا کے لیے مضامین لکھنے لگے، اس طرح باقاعدہ صحافت کے میدان میں کود پڑے۔ کچھ عرصہ کے بعد 13 جنوری 1911 کو کلکتہ سے انگریزی ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" کا پہلا شمارہ جاری کیا جس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ لیڈی ہارڈن بھی کامریڈ کی پرستار تھیں ،اکثر کامریڈ کے دفتر فون کر کے اگلے شمارے کے بارے میں معلومات حاصل کیا کرتی تھیں۔ کامریڈ کا معیار انتہائی بلند تھا جس کا مقصد غفلت میں پڑے لوگوں کو جگانا اور ہندو مسلم اتحاد کو پروان چڑھانا تھا۔

بقول خلیق احمد نظامی ''ہندوستان نے سیاسی بصیرت، فہم و فراست تدبیر اور مستقل مزاجی ایثار و قربانی کے بہت سے نمونے پیش کیے ،لیکن حق گوئی بے باکی اور سرفروشی میں کوئی شخص محمد علی کے درجے کو نہیں پہنچا۔''

(قومی آواز شاہد صدیقی 10 دسمبر 2021)

یہ حسد ہے کہ محبت کی اجارہ داری
درمیاں اپنا بھی سایہ نہیں دیکھا جاتا

مولانا محمد علی جوہر نے دہلی میں بھی ''ہمدرد'' کے نام سے اردو اخبار کا اجرا کیا. مولانا محمد علی جوہر جنگ ازادی کی لڑائی لڑتے لڑتے کئی بار جیل گئے نظر بند کیے گئے ایک طرف ریشمی رومال کی سازشیں اور دوسری طرف 1919 میں جلیا والا باغ کے اندوہناک حادثے اور سانحہ میں لاکھوں بے گناہوں کا خون ان کی بیبسی اور توہین اور پیٹ کے بل چلنے کو مجبور کیا گیا۔ حق پرست طاقتیں شکست کھا رہی تھیں ایسے حالات میں جیل سے رہا ہو کر سیدھے بھائی شوکت علی جوہر علی امرتسر گئے اور لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کے لیے آمادہ کیا۔

تحریک خلافت نے ملک کے گوشے گوشے میں ایسے چراغ روشن کیے کہ

سبق اردو نومبر 2025
5

ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک جان دو قالب کیا کہ ایسا منظر کبھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔

ڈاکٹر محمود الٰہی نے انتخابات خطبات خلافت کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''مسلمان یہ چاہتے تھے کہ ہم ہندوؤں سے بڑھ کر قومی اتحاد کا نمونہ پیش کریں اور ہندو کسی طرح بھی اس امر میں مسلمانوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے انگریز کے پاس اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے سب سے بڑا حربہ یہ تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرتا رہے، مگر تحریک خلافت نے اس حربے کو ناکام بنا کر رکھ دیا تھا۔''

(محمد علی جوہر نمبر. فروری تا اپریل صفحہ نمبر .2005106)

اس وقت کے بڑے بڑے شعرا اور ادیب نے محمد علی جوہر کے طرز فکر اور نظریہ سے متاثر ہو کر ان کی زندگی ان کے طرز فکر سے دنیا کو آشنا کرا رہے تھے۔ عشرت رحمانی رامپوری نے حیاتِ جوہر مرتب کی جس کی تمہید میں حامد الانصاری غازی پوری رقم طراز ہیں: بلاشبہ مولانا ہندوستان کا قلب ایشیا کی روح اور کائنات ہستی کا جوہر تھے لیکن وہ یہ سب کچھ اس لیے تھے کی ایک سچے پکے اور خدا پرست انسان تھے۔'' (صفحہ نمبر 11)

جوہر ان سب کے علاوہ ایک بلند پایا انشاء پرداز اور انقلابی شاعر بھی تھے گنجینہ جوہر آپ کا بے حد مشہور مجموعہ ہے جس میں غزلیں اور جستہ جستہ اشعار شامل ہیں جس میں آپ کا پروقار لہجہ، باغیانہ تیور اور پر اعتماد جذبے کی گونج سنائی دیتی ہے:

سر دخوشبو کی رگوں میں خون دوڑائیں گے ہم
چاندنی بچھنے تو دو پھر آگ برسائیں گے ہم
دیکھنا یہ ہے ہمیں اب کون سمجھے گا یہاں
اس کے ہونٹوں پر ادھوری بات ہو جائیں گے ہم

جوہر کی غزلوں میں حکومت وقت کے خلاف غم وغصہ نظر آتا ہے۔ گوپی چند نارنگ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''محمد علی جوہر کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ ان کی غزلوں میں عاشقی و آزادی دونوں مل کر ایک ہو گئے، ان کا ذوق شعری اتنا بالیدہ، لطیف اور رچا ہوا ہے کہ عام طور پر ان کے کلام پر روایتی عاشقانہ رنگ کا دھوکہ ہو سکتا ہے، لیکن دراصل ایسا نہیں۔ عاشقان لے کی رمزیت کے پردے میں وطنی لے ہے جو عاشقانہ لے کے ساتھ چلتی ہے۔''

غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک لمحہ اس نگاہ سے جب بات ہو گئی
دل میں اتر گیا ہے کوئی گھاؤ دور تک
ہے رنگ رنگ فضا، سرخ رو ہیں سب منظر
ملے گی آنکھ تو دیکھیں گے ہم بھی اب منظر
سروں پہ دھوپ کڑی ہے تو کیا، چلے جاؤ
کسی خیال کی خوشبو فضا کی راہ میں ہے
موسم ہے خشک اپنا تو چولا ہے خاک کا
تم شاخ گل ہو پہنے رہو شادیوں کا رنگ

جوہر کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل ہیں انہوں نے اپنی شاعری میں سیاسی اخلاقی اصلاحی اور اسلامی اقدار کو نہایت خلوص اور فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے شاعری میں داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے زبان نہایت پختہ اور اسلوب چست درست، یہاں تک کہ انگریزی میں بھی آپ کے شایان شان کم تھے۔ وطن عزیز کی خاطر قید و بند کی مشکلات وستم برداشت کی قید خانے کی تنہائی نے آزادی کا جذبہ اور انقلابی فکر نے آپ کے شعری احساس میں شدت پیدا کی۔

جذبات جوہر، تقاریر محمد علی جوہر، سفر نامہ یورپ، گنجینہ جوہر، کلام جوہر، جذبات جوہر، خطوط مشاہیر، دیوان جوہر، جوہر نامہ، لکھنو کا ادبی ماحول وغیرہ کتابیں آپ کی ذاتی ادبی سیاسی سماجی صحافتی اور اصلاحی زندگی کی مکمل ترجمانی کرتی ہیں۔

''جذبات جوہر'' جس کو محمد علی جوہر نے نظر بندی اور اسیری میں تحریر کیا. یہاں بھی ان کا یقین ان کی جرات اور بے باکی صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں: ہوں لاکھ نظر بند دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس درجہ ستا دیکھ
یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ

آزادی کی تڑپ آزادی کا جام پینے کے لیے وہ کس درجہ بیتاب تھے اس کا اندازہ ان اشعار میں دیکھنے لائق ہے:

ٹیشن لب ہوں مدتوں سے دیکھیے
کب در میخانہ کو شر کھلے لو وہ آ پہنچا جنوں کا قافلہ
پاؤں زخمی خاک منہ پر سر کھلے
آساں پسندیوں سے ہیں بیزار اہل عشق
چھانٹا یہ مرحلہ بھی ہے دشوار دیکھ کر

عبدالماجد القادری بدایونی جذبات جوہر کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''محمد علی جوہر یقینا شاعر ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ مختصر مجموعہ محمد علی کی شاعری کا دیوان ہے لیکن غلطی نہ کیجئے دھوکہ نہ کھایئے اگر اپ کو

سبق اردو نومبر 2025
6

زبان کے چٹخارے اور انداز بیان کے مزے لینے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔
اگر وصال کی مسرت اور فراق کی مصیبت۔۔۔۔۔۔۔ زلف رخ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ساقی و مے میخانہ۔۔۔۔۔۔۔۔باغ و بہار کے سرور وخمار سے وقت کاٹنا ہو تو دلی ولکھنو کے بازاروں میں ہزاروں دیوان بکتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خرید کر اپنا شوق پورا کیجیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔
کیونکہ یہ تو ایک مجروح کی کراہ بلکہ ایک مظلوم کی آہ ہے جو ایک دروازے سے ٹکرا کر ابھی آئی اور اجابت کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔''
(دیباچہ جذباتِ جوہر صفحہ نمبر 4)

جذبات جوہر کے اشعار دلوں کو جگانے، بیدار کرنے اور محسور کر دینے والے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کی دل میں نہ ہو آرزو تیری
باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

اور ایک شعر تو جوہر کا مشہور زمانہ ہے کہ:

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سچ تو یہ ہے کہ ان کے جیسا نڈر مخلص بہادر اور سحر انگیز شخصیت مشکل سے پیدا ہوتی ہے ان کا دل زخموں سے چور تھا اندرونی انتشار بیرونی مخالفت اور ہمنواؤں کی بے وفائی نے ان کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، باوجود اس کے نومبر 1930 میں لندن کی پہلی گول میں کانفرنس (راؤنڈ ٹیبل کانفرنس) میں شدید بیماری کی حالت میں بھی شرکت کی. جوہر کی مضطرب روح اور بے چین طبیعت نے اپنا جوہر دکھایا وہ شیر کی طرح گرجے اور بلبل کی طرح چہکے اور دہاڑتے ہوئے کہا ''جب تک ان کو اس ملک کی آزادی کا پروانہ نہیں مل جاتا تب تک وہ غلام ہندوستان میں مرنا بھی پسند نہیں کریں گے۔''

لہٰذا 4 جنوری 1931 کو ان کی روح پرواز کر گئی۔ مولانا کی جسد خاکی کو غلاف کعبہ کے ٹکڑے کے ساتھ کھدر کے کفن میں لپیٹ کر قبلہ اول کی پاک سرزمین بیت المقدس میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو احاطہ چند صفحات میں کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، یہ سچ ہے کہ ان کی جیسی شخصیت برسوں میں پیدا ہوتی ہے لہذا جب جب اس ملک کی تاریخ لکھی جائے گی، ادب کی تاریخ لکھی جائے گی وہ مولانا محمد علی جوہر کے ذکر کے بغیر ادھوری ہوگی۔ جوہر خود لکھتے ہیں: بس ایک لفظ ہمیں خون دل سے لکھنا تھا:

تمام رنگ کی تحریریں نادرست ہوئیں

سبق اردو نومبر 2025
7

سوشل میڈیا اور اردو زبان کی نئی جہتیں

خیر النساء۔این۔پی
صدر شعبہ اردو، سرسیّد کالج، تلیپر مبہ، کنّور، کیرالا

دیباچہ:

سوشل میڈیا کی تیز رفتار ترقی نے انسانی معاشرت، ابلاغ، تعلیم اور تہذیب کے تمام پہلوؤں میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ اکیسویں صدی کو ڈیجیٹل عہد'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس دور میں روایتی ابلاغ کے ذرائع جیسے خطوط، اخبارات اور ریڈیو کی جگہ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے لے لی ہے۔ اردو زبان جو کبھی محض خطاطی، درس وتدریس اور ادبی محفلوں تک محدود تھی، آج عالمی لرننگ نیٹ ورکس، ڈیجیٹل سٹوری ٹیلنگ، ورچوئل مشاعروں اور سوشل میڈیا انفلوئنسرز کے ذریعے ایک نئے دور کا آغاز کر رہی ہے۔

اس مقالے میں ہم نہ صرف اس تغیر کا مطالعہ کریں گے بلکہ ان جہتوں کا تفصیلی جائزہ بھی لیں گے جنہوں نے اردو زبان کو نئی زندگی عطا کی ہے۔

۱۔سوشیل میڈیا کا تعارف:

سوشل میڈیا، جسے اردو میں سماجی ذرائع ابلاغ اور فارسی میں فضائے مجازی کہا جاتا ہے، (۱) آج کی دنیا میں رابطے اور معلومات کے تیز ترین ذرائع میں شمار ہوتا ہے، اور فیس بک، ٹویٹر (X)، انسٹاگرام، یوٹیوب اور واٹس ایپ جیسے پلیٹ فارم اس نظام کا بنیادی حصہ ہیں۔ سوشل میڈیا دراصل ان آن لائن پلیٹ فارمز کا مجموعہ ہے جہاں صارفین اپنی آواز کو آزادانہ طور پر دنیا تک پہنچا سکتے ہیں، اور اور شیخ عقیل احمد کے خیال میں "سوشل میڈیا ایک ایسا آلہ ہے جو لوگوں کو اظہارِ رائے، تبادلۂ خیال، تصاویر اور ویڈیوز شیئر کرنے کی اجازت دیتا ہے" (۲) یہی وجہ ہے کہ یہ نہ صرف ذاتی اظہار بلکہ تجارت، تعلیم، تحقیق، سماجی بیداری اور ادبی تخلیق کا بھی طاقتور ذریعہ بن چکا ہے۔ فیس بک پر روزانہ لاکھوں اردو پوسٹس شائع ہوتی ہیں، ٹویٹر پر اردو ہیش ٹیگز عالمی ٹرینڈز میں جگہ بناتے ہیں، یوٹیوب کے اردو تعلیمی چینلز کروڑوں ناظرین تک رسائی رکھتے ہیں، اور واٹس ایپ گروپس نے اردو زبان میں اجتماعی تعلیمی تعاون کو بے حد فروغ دیا ہے۔ تحقیق کے مطابق، ہندوستان میں تقریباً پچھتر کروڑ سوشل میڈیا صارفین موجود ہیں، جن میں سے نو سے دس کروڑ افراد کسی نہ کسی شکل میں اردو سے وابستہ ہیں، اور یہ تعداد مستقبل میں مزید بڑھنے کی توقع ہے۔ مجموعی طور پر سوشل میڈیا نے دنیا کو ایک حقیقی عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے جہاں فاصلے کم اور رابطے مضبوط ہو گئے ہیں، اور لوگ چند لمحوں میں اپنی معلومات، خیالات، تجربات، تصاویر اور ویڈیوز دنیا بھر تک پہنچا سکتے ہیں، جبکہ یہ پلیٹ فارمز تعلیم، کاروبار، مارکیٹنگ اور تحقیق میں بھی غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔

۲۔اردو زبان اور ڈیجیٹلائزیشن

ماضی میں اردو کا استعمال صرف طباعت شدہ مواد تک محدود تھا۔ لیکن Unicode ٹیکنالوجی کے آنے کے بعد اردو زبان موبائل، کمپیوٹر اور ویب سائٹس پر نہ صرف پڑھنے بلکہ لکھنے کے قابل ہوئی۔

گوگل، فیس بک اور مائیکروسافٹ نے اردو زبان کو باقاعدہ سپورٹ فراہم کی۔

- "Urdu Keyboard" اب موبائل فونز میں بلٹ اِن موجود ہے۔

"Urdu Wikipedia" پر اب 70,000 سے زائد مضامین دستیاب ہیں۔

یہ اہم پیش رفتیں ثابت کرتی ہیں کہ ڈیجیٹلائزیشن نے اردو کو مٹنے نہیں بلکہ مزید ابھرنے کا موقع دیا ہے۔

۳۔سوشل میڈیا پر اردو ادب کی نئی جہتیں

الف) آن لائن مشاعرے اور شعری ترویج

کورونا وبا کے دوران روایتی محفلیں معطل ہوئیں۔ لیکن سوشل میڈیا پر آن لائن مشاعرے منعقد ہونا شروع ہوئے جن میں بیرونی ممالک سے بھی شعرا شریک ہونے لگے۔

انسٹاگرام اور فیس بک پر "اردو کوٹس"، "دو لائن کی شاعری" اور "درد بھری غزلیں" جیسے صفحات نے لاکھوں فالورز حاصل کیے۔ نوجوان نسل جو اردو کتابیں نہیں پڑھتی، وہ Reels اور Story کے ذریعے شعر

سبق اردو نومبر 2025
8

سے جڑ گئی۔

ب) ڈیجیٹل رائٹرز اور بلاگنگ

بلاگرز اپنے خیالات کو اردو زبان میں عالمی سطح پر شائع کرنے لگے۔ ویب سائٹس جیسے WordPress، Medium ، Blogspot پر ادبی، سیاسی اور سماجی تجزیے لکھے جا رہے ہیں۔

ایک سروے کے مطابق، گزشتہ ۵ سال میں اردو بلاگنگ میں ۴۰ اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔

ج) اردو پوڈ کاسٹ اور ویڈیو کنٹنٹ

یوٹیوب پر نہ صرف ترنم کے ساتھ اشعار سنائے جاتے ہیں بلکہ

افسانے کی ڈرامائی قرأت اردو کہانی سنانے کے چینلز

آڈیو ڈرامے کلاسیکل مشاعرے محفوظ کیے جا رہے ہیں۔

یہ کنٹنٹ ''نئی نسل کے لیے اردو کا ڈیجیٹل ذخیرہ'' ثابت ہو رہا ہے۔

۴۔سوشل میڈیا کے ذریعے اردو کی ترویج کے فوائد

سوشل میڈیا نے اردو زبان کی ترویج و ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، اور جیسا کہ امجد ین قادری کہتے ہیں کہ ''سوشل میڈیا اپنی ضرورت و اہمیت کی وجہ سے معاشروں اور ریاستوں میں اپنا ایک مسلمہ مقام بنا چکا ہے''※ اسی حقیقت نے اردو زبان کو بھی ایک نئی وسعت، نئی زندگی اور عالمی شناخت عطا کی ہے۔ سوشل میڈیا نے اردو کو محض فروغ ہی نہیں دیا بلکہ اسے ایک زندہ، متحرک اور ترقی پذیر زبان میں بدل دیا ہے۔ اس کے ذریعے اردو کو عالمی سطح پر ایسی رسائی ملی ہے جو ماضی میں ممکن نہ تھی؛ اب امریکہ، یورپ، وسطی ایشیا، خلیج ممالک اور ترکی تک اردو پڑھی، سمجھی اور شیئر کی جا رہی ہے، جب کہ مختلف ممالک میں رہنے والی دیاسپورا کمیونٹی بھی اپنی تہذیبی شناخت کو سوشل میڈیا کی بدولت مضبوطی سے برقرار رکھے ہوئے ہے۔ نوجوان نسل جو پہلے اردو ادب سے دور ہوتی جا رہی تھی، آج creative reels، meme culture اور مختصر ویڈیوز کے ذریعے دوبارہ اردو سے جڑ رہی ہے۔ اسی کے ساتھ زبان کے ارتقائی سفر میں بھی تیزی آئی ہے، کیونکہ سوشل میڈیا نے ''فالو کرنا''، ''شیئر کرنا''، ''کمیونٹی گروپ'' جیسی نئی اصطلاحات کو اردو کا حصہ بنا دیا ہے، جو جدید لسانی تبدیلیوں اور فطری ارتقاء کی علامت ہیں۔ تعلیمی میدان میں بھی اس کا کردار نمایاں ہے؛ واٹس ایپ گروپس، گوگل کلاس روم، یوٹیوب لیکچرز اور آن لائن تعلیمی پلیٹ فارمز نے اردو ذریعۂ تعلیم کو نئی قوت بخشی ہے۔ یوں سوشل میڈیا نے اردو زبان کو نہ صرف عالمی منظرنامے پر نمایاں کیا ہے بلکہ اسے فکری، تعلیمی، تہذیبی اور لسانی لحاظ سے مضبوط تر بناتے ہوئے نئی نسل کے ساتھ مضبوط تعلق بھی قائم کیا ہے۔

۵۔سوشل میڈیا کے منفی اثرات:

محمد بشیر دولت کے قول میں:

اس دور میں سوشل میڈیا کی اہمیت سے کوئی بھی ذی شعور انسان انکار نہیں کر سکتا، کوئی آلہ بھی بذاتِ خود اچھا یا برا نہیں بنتا ہے۔ (۳)

یہ قول اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سوشل میڈیا بذاتِ خود نہ فائدہ مند ہے نہ نقصان دہ، بلکہ اس کے اثرات کا انحصار اس کے استعمال پر ہے۔ اگرچہ یہ پلیٹ فارم اظہارِ خیال، علم کی ترویج اور زبان کے فروغ کے لیے وسیع مواقع فراہم کرتا ہے، تاہم اس کا غیر محتاط استعمال زبان کے معیار، ادبی اقدار اور فکری گہرائی کو متاثر کر سکتا ہے۔ ذیل میں چند اہم مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے جو موجودہ دور میں اردو زبان کے لیے چیلنج بن کر سامنے آئے ہیں۔

(۱)۔رومن اردو کا غلبہ

سوشل میڈیا پر اکثر صارفین اردو کو رومن رسم الخط میں لکھتے ہیں جیسے:

"Ap kese ho?"، "me theek hun"

یہ طرزِ نوشت صرف زبان کی صوتی پہچان کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اصل رسم الخط سے نئی نسل کو دور کر رہا ہے۔ رومن اردو کے زائد استعمال سے املاء و تلفظ کی صحت متاثر ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں اردو کی خالص ادبی شناخت کمزور پڑنے لگتی ہے۔

(۲)۔غیر معیاری زبان اور قواعد سے انحراف

سوشل میڈیا پر پیغامات کی فوری ترسیل کے باعث اکثر جملے نحوی اعتبار سے غیر مرتب ہوتے ہیں۔ املاء کی غلطیاں، تشدید اور نقطوں کی کمی، عبارت کی ساخت میں کمزوری اور بے ربطی روز افزوں ہو رہی ہے۔ یہ رویہ علمی اور ادبی سطح پر اردو کے وقار کو متاثر کرتا ہے اور لکھنے والوں کی لسانی تربیت میں کمی کا باعث بنتا ہے۔

(۳)۔ادبی سرقہ (Plagiarism)

ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر ادبی مواد کی ترویج کے ساتھ ساتھ سرقہ کا رجحان بھی قابلِ تشویش ہے۔ اشعار، افکار اور اقتباسات اکثر بغیر حوالہ یا اجازت کے شیئر کیے جاتے ہیں۔ تخلیقی مواد کی غیر ذمہ دارانہ نقل نہ صرف ادب کے اخلاقی معیار کو متاثر کرتی ہے بلکہ اصل مصنف کے حقوق

سبق اردو نومبر 2025
9

کی خلاف ورزی بھی ہے۔

(۴)۔سنجیدہ مطالعہ میں کمی

ڈیجیٹل مواد کی رفتار اور سطحیت نے قارئین کو مختصر اور فوری اثر انداز ہونے والے مواد کی طرف مائل کر دیا ہے۔سوشل میڈیا کے اس تیز رفتار اور جزوی علم پر مبنی ماحول نے طویل مطالعے، کتاب سے لگاؤ اور علمی تفکر کے رجحان کو کمزور کیا ہے، جو تحقیقی ادب کے لیے خطرناک ہے۔

اصلاحی تجاویز: محمد بشیر دولت کے مذکورہ قول کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اصل مسئلہ سوشل میڈیا نہیں بلکہ اس کا طریقۂ استعمال ہے۔اگر اسے ذمہ داری، لسانی شعور اور ادبی وقار کے ساتھ بروئے کار لایا جائے تو یہی پلیٹ فارم اردو زبان و ادب کی ترقی میں مرکزی کردار ادا کر سکتا ہے۔اس سلسلے میں درج ذیل اقدامات مفید ثابت ہو سکتے ہیں:

اردو زبان میں معیاری املاء اور نحوی تربیت کے لیے آن لائن ورکشاپس اور کورسز کا انعقاد۔

ادبی انجمنوں اور تعلیمی اداروں کے تعاون سے ڈیجیٹل ادب سے متعلق اخلاقی و علمی ضوابط مرتب کرنا۔

سوشل میڈیا پر تخلیقی اور مستند مواد کی حوصلہ افزائی اور سرقہ ادب کی روک تھام کے لیے آگاہی مہم۔

رومن اردو کے بجائے اصلی رسم الخط کے استعمال کو فروغ دینا، بالخصوص طلبہ اور نوجوان صارفین کے درمیان۔

معیاری ادبی و تحقیقی تحریری مقابلے آن لائن منعقد کیے جائیں تاکہ اردو لکھنے کا رجحان مضبوط اور سنجیدہ ہو۔

الغرض، سوشل میڈیا اگر مثبت شعور کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اردو زبان کو عالمی سطح پر فروغ دینے کا طاقتور ذریعہ بن سکتا ہے۔ اگر بے احتیاطی برتی جائے تو یہی پلیٹ فارم ادبی انحطاط کا سبب بھی بن سکتا ہے،اس لیے راستہ احتیاط،فکری توازن اور لسانی دیانت میں ہے

۶۔اردو زبان اور سوشل میڈیا کا مستقبل:

اردو زبان اور سوشل میڈیا کا مستقبل نہایت روشن نظر آتا ہے، کیونکہ مصنوعی ذہانت کی تیز رفتار ترقی نے اردو کے لیے نئی راہیں کھول دی ہیں۔ Artificial Intelligence کی مدد سے اردو ترجمہ، صوتی شناخت اور خودکار لکھائی جیسے میدانوں میں ایک نیا انقلاب آنے والا ہے، جب کہ ''Smart Urdu Apps'' کی تیاری اور ''آن لائن اردو یونیورسٹی'' کے قیام کی تجاویز اس بات کی علامت ہیں کہ آنے والا دور اردو زبان کی ڈیجیٹل دنیا میں بھرپور موجودگی کا حامل ہوگا۔ ماہرین کے مطابق، اگلے دس برسوں میں ''اردو ڈیجیٹل پبلشنگ'' کا حجم چار گنا بڑھ جائے گا، جو اردو کے تکنیکی مستقبل کی مضبوطی کی واضح نشانی ہے۔اس سلسلے میں معاشرے کی فکری اور اخلاقی رہنمائی بھی بے حد ضروری ہے، اور جیسا کہ مفتی محمد عرفان عالم قاسمی کے قول میں بیان کیا گیا ہے کہ ''سوشل میڈیا معاشرے کی اصلاح کا مؤثر ہتھیار ہے''۔(۴)۔اسی تصور کے تحت چند بنیادی تجاویز نہایت اہمیت رکھتی ہیں: قومی سطح پر ایک ''ڈیجیٹل اردو بورڈ'' قائم کیا جائے، تعلیمی اداروں میں ''سوشل میڈیا لسانیات'' پڑھائی جائے، نوجوانوں کو معیاری اردو لکھنے کی تربیت دی جائے، آن لائن ادبی مقابلوں کا انعقاد کیا جائے، اور اردو زبان میں باقاعدہ ''سائبر حفاظتی ضابطے'' مرتب کیے جائیں۔ان تجاویز پر عمل درآمد نہ صرف اردو زبان کی ڈیجیٹل ترقی کو فروغ دے گا بلکہ معاشرے کو ایک صحت مند، باوقار اور مہذب آن لائن ماحول بھی فراہم کرے گا۔

۷۔نتیجہ:

سوشل میڈیا نے اردو زبان کے لیے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔یہ زبان جو کبھی محدود دائرے میں گردش کرتی تھی، اب عالمی سطح پر اپنے وجود کا احساس دلا رہی ہے۔اگر ہم معیاری مواد، تکنیکی ترقی اور تعلیمی نظام کے ساتھ اسے جوڑیں، تو اردو نہ صرف فروغ پائے گی بلکہ ڈیجیٹل دنیا کی ایک اہم زبان بن سکتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔سوشل میڈیا کے فوائد اور نقصانات-محمد بشیر دولتی۔ص۔۱

۲۔الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں-شیخ عقیل احمد۔ص۔۱

۳۔سوشل میڈیا کے فوائد اور نقصانات-محمد بشیر دولتی۔ص۔۱

۴-سوشل میڈیا معاشرے کی اصلاح کا موثر ہتھیار ہے-مفتی محمد عرفان عالم قاسمی۔ص۔۱

www aimplboard.in

Khairunnisa.N.P,
Assistant Professor & Head ,
Department of Urdu ,
Sir Syed College,Taliparamba,
,Kerala(Dist)Kannur

سبق اردو نومبر 2025
10

اردو شاعری میں غالبؔ کے اثرات

ڈاکٹر ثمینہ بی۔کے۔کے
ایسوسی ایٹ پروفیسر آف اردو
گورنمنٹ بریؤ کالج، تلشیری، کیرلا

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اردو شاعری کے مہر تاباں اور اقلیم شاعری کے شہنشاہ ہیں۔ان کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں میں اجاگر ہوئی ہے کہ ان سب کا احاطہ کسی ایک شخص کے لئے کسی ایک محدود مضامین میں تبدیل کرنا مشکل ہے۔غالبؔ کی شاعری کا موضوع ان کے شدید قسم کے ذاتی تاثرات ہیں۔ان کی امتیازی خصوصیت ان کا تفکر یعنی ان تاثرات پر ان کے بے چین اور عمیق ذہن کا ردعمل ہے۔غالبؔ کا تجربہ واقعی اور غیر منفصل معلوم ہوتا ہے،جس میں گوناگوں کیفیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔غالب کے یہاں فکر ان تمام تجربات کا اظہار ہے،جنہیں ذہن نے قلمبند کیا ہے۔اس فکر کی قدر و قیمت ان تجربات کا تجزیہ کرنے سے متعین ہوتی ہے۔رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ مغلیہ شہنشاہیت کے تین بڑے احسانات اردو،تاج محل اور غالبؔ ہیں۔غالبؔ کی اہمیت اور اردو شاعری پر اس کے ہمہ گیر اثرات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہئے کہ غالبؔ کی شاعری میں وہ کیا بات تھی کہ اس کی آواز ایک نئے افق سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔بات یہ ہے کہ غالبؔ سے پہلے اردو شاعری کلاسیکی انداز نظر کے حامل ہیں۔ان کے ہاں مختلف النوع تجربات اور رنگا رنگ کیفیات کی فراوانی نہیں۔کیوں کہ تجربات اور کیفیات کی تلاش میں عموماً وہ ایک معین دائرے سے باہر نہیں جاتے،اس قسم کی حد بندی کلاسیکیت کی ایک نمایاں خاصیت ہے کیوں کہ اس میں چند خاص قسم کے مضامین ہی کو شعر و سخن کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔چنانچہ ہمارے پرانے شعراء نے بھی چند خاص قسم کے مضامین اپنے لئے مخصوص کر لئے تھے۔اسی طرح ہمارے پرانے شاعر اپنی انفرادیت عموماً شعر کے آہنگ اور لب ولہجہ میں دکھاتے ہیں،قدیم غزل کی شاعری میں انفرادیت کا تنہا معیار لہجہ تھا۔ہم ولیؔ دکنی سے لے کر حالیؔ تک کی شاعری کو دیکھتے آیئے،آپ کو اردو غزل کے اسلوب کی یہ خصوصیت ایک مسلسل روایت کی شکل میں نظر آئے گی،غزل کی زبان ہمیشہ بول چال کی زندہ زبان رہی ہیں

جب آپ اس پس منظر کو پیش نظر رکھیں جس میں غالبؔ کی انفرادی ذہانت نے کرشمے دکھائے ہیں،صرف اسی صورت میں آپ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں،پہلی بات تو یہ ہے کہ غالبؔ نے بلا کی رنگا رنگ اور پہلودار شخصیت پائی تھی،یہ شخصیت ایک انوکھی انفرادیت کی حامل تھی اور غالبؔ کو اس کا شدید احساس تھا،اکثر و بیشتر اس کا یہ احساس اپنی حیرت انگیز صلاحیتوں پر فخر و ناز کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔غالبؔ کے ہاں خود پسندی اور انانیت کا رجحان بڑی اہم حیثیت رکھتا ہے،کہیں اس کے نقوش گہرے اور روشن ہیں اور کہیں مدھم اور دبے ہوئے سے،اپنی آزاد منش طبعیت اور اور اپنی انفرادیت کے بے پناہ احساس کی وجہ سے غالبؔ کو عام روش سے ہٹ کر چلنے کی ادا خوب آتی تھی،اس لئے اس نے اردو شاعری کی عام روایت کو اپنے اوپر بہت زیادہ مسلط ہونے نہیں دیا۔اس نے وہ سب پابندیاں قبول نہیں کیں جو اردو شاعروں نے اپنی اوپر عائد کر رکھی تھیں،اس کی ہمہ گیر اور دلچسپ شخصیت کی بوقلموں کیفیتیں اظہار کے لئے بے تاب تھیں،اس کے نزدیک شاعری کا
مقصد ہی اپنے آپ کو بے نقاب کرنا تھا۔چنانچہ وہ کہتا ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کا انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یہی بات ایک دوسرے شعر میں یوں ادا ہوئی ہے۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ

اس شخصیت کی رفعتوں کا یہ عالم ہے کہ وہ کائنات تو کیا ماورائے کائنات کی حقیقتوں کا ادراک کرنے کے لئے بھی بے قرار ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکان اپنا

چنانچہ غالبؔ نے اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کی پیروی چھوڑ کر اپنی شاعری میں اپنی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار پر زور دیا ہے۔اس اعتبار سے اس کو اردو کا پہلا رومانی شاعر کہنا چاہئے۔رومانیت کی سب سے زیادہ نمایاں اور امتیازی خصوصیت انفرادیت کا بے پایاں احساس ہے،
جو قدم قدم پر اپنا اثبات چاہتا ہے۔
غالبؔ نے ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے اہل دنیا کا مشاہدہ کیا ہے۔ان

سبق اردو نومبر 2025
11

کے تجربات وسیع ہیں اور انہوں نے انسانی فطرت کو ہزار زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے طویل عمر بھی پائی تھی۔اس لئے ان کو زندگی کی مختلف منزلوں سے گزرنے کا موقع ملا۔غالبؔ نے اپنے تجربات کو حسن وعشق کے رنگ میں پیش کیا ہے۔انہوں نے اپنے محبوب کا مطالعہ نہایت گہرائی کے ساتھ کیا ہے اور اس کی فطرت سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔اس لحاظ سے ہم غالبؔ کو نباض فطرت کا لقب دے سکتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا قول ہے کہ" ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وہ ہیں مقدس وید اور دیوانِ غالبؔ" دور قدیم کے شاعر کی الہامی حیثیت دور جدید میں ختم ہوگئی ہے۔البتہ اتنا ضرور ہے کہ شاعر کی حسی قوت عوام سے زیادہ تیز ہوتی ہے اس لئے وہ مختلف اشیا اور واقعات کو عجلت اور شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔غالبؔ کی حسی قوت اور شاعرانہ صلاحیت عوام سے زیادہ تیز تھی، یہی نہیں بلکہ دور متوسطین کے تمام شعراء میں ذہانت اور ذکاوت کے لحاظ سے کوئی شاعر غالبؔ کے مقابل نہیں ہوسکتا ہے۔دراصل دور متوسطین کے شعراء میں غالبؔ کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے،اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تخلیقی عمل کے سلسلہ میں غالبؔ کا ذوق اور وجدان ان کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔

ایک شاعر کی عظمت کی کسوٹی یہ بھی تسلیم کی گئی ہے کہ اس نے مابعد کے شعراء پر کس حد تک اثر ڈالا۔غالبؔ کے بعد کے شعراء کا اگر ہم جائزہ لیں تو ہم کو محسوس ہوگا کہ انہوں نے دیگر شعراء پر اپنے تاثرات ثابت کئے ہیں۔یہ بات ضرور ہے کہ کسی شاعر پر ان کا گہرا اثر پڑا ہے اور کسی شاعر کے یہاں ان کے رنگ کی محض پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔غالبؔ کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ خود ان کے دل کی آواز ہے۔وہ کسی کسی فرشتے کی آواز نہیں ہے بلکہ وہ آواز آب وگل کے پیکر کی آواز معلوم ہوتی ہے جس سے ہمارے گوش آشنا ہیں۔یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کا کلام قارئین پر اثر انداز ہوتا ہے۔

ان کی شاعری میں جذبے کی صداقت اور ذہن کی برق رفتاری بیک وقت ملتی ہیں۔ان کی شاعری میں تعقل کا عنصر، تمام دوسرے عناصر پر حاوی ہے۔اقبالؔ اور غالبؔ میں ایک اساسی فرق ہے۔اقبالؔ نے اپنی شعری کائنات کو اس مرکزی اور مربوط نظام فکر سے سجایا ہے۔جسے انہوں نے مختلف سرچشموں سے فیضان حاصل کر کے مرتب کیا ہے۔وہ سرچشمے یہ ہیں،قرآن کریم، فارسی شعراء،اسلامی اور مغربی مفکرین،جدید علوم اور سائنس۔غالبؔ کے لئے کوئی نظام فکر یا زندگی کی کوئی کوئی تفسیر مکمل اور بصیرت افروز تجربہ نہیں بن سکی۔اس لئے ان کی شاعری ان مجردات کا قطعی بیان ہے، جو انہوں نے اپنے تجربے سے اخذ کئے ہیں۔یہ بڑی حد تک اس شاعری کے مماثل ہے، جسے ہربرٹ ریڈ نے فکر کے جذباتی یا حسیاتی ادراک سے تعبیر کیا ہے۔اور جس کا مجموعی اثر، احساس حیرت کے پھیلاؤ اور ادراک کے تناؤ کی آمیزش میں مضمر ہے۔کیونکہ غالبؔ کا تفکر مطالعہ اور مشاہدہ ان کے لئے ایسی ہی غیر منفصل قوت تحریک رکھتا تھا۔جیسا کہ حسیاتی تجربہ۔ایسی شاعری میں جو اعلیٰ ترین شاعری کہی جاسکتی ہے،فکر اور جذبہ کا امتزاج ہوتا ہے۔انگریزی میں شیکسپیر،ولیم بلیک،ورڈزورتھ،کیٹس اور شیلی کے یہاں ایسی شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔غالبؔ کی طرح ان سب کے یہاں محسوس فکر ملتا ہے۔غالب کے استعارے شاعرانہ ہونے کے باوجود ان کے تفکر کا جزو لاینفک ہیں۔اس اعتبار سے غالبؔ ایک بڑا صاّرع،ایک ذہین فن کار،ایک حسن آفرین شاعر ہیں۔غالبؔ ایک عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ تھا۔یہی وجہ کہ غالبؔ کی قدر مستقبل میں ہوئی۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

Dr. SEMEENABI K . K
ASSOCIATE PROFESSOR OF URDU& HEAD
GOVERNMENT BRENNEN COLLEGE
DHARMADAM,THALASSERY,KERALA-67010

سبق اردو نومبر 2025
12

طلباء کے تعلیمی سفر کی تشکیل میں ہم عصروں کی معاونت کا کردار

ڈاکٹر شبیر احمد

اسسٹنٹ پروفیسر
مانی کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، بھوپال
Email ID: ibnesami@gmail.com
https://orcid.org/0000-0002-0318-5122

خلاصہ:
ہم عصروں کی معاونت طلباء کے تعلیمی سفر کی تشکیل میں ایک مرکزی کردار ادا کرتی ہے کیونکہ یہ تحریک، اعتماد، جذباتی صحت، اور تعلیمی مشغولیت کو فروغ دیتی ہے۔ عصری تعلیمی ماحول میں، سیکھنا (learning) کو اب ایک علیحدہ عمل کے طور پر نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ ایک سماجی طور پر مربوط سرگرمی کے طور پر سمجھا جاتا ہے جہاں ہم عصروں کا تعلیمی نتائج پر نمایاں اثر ہوتا ہے۔ یہ مضمون طلباء کی تعلیمی ترقی میں ہم عصروں کی معاونت کے نظریاتی بنیادوں، جہتوں اور تعلیمی اثرات کا جائزہ لیتا ہے۔ نفسیاتی، سماجیاتی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے استناد کرتے ہوئے، یہ مقالہ بتاتا ہے کہ ہم عصروں کے باہمی تعامل سے کس طرح سیکھنے میں بہتری آتی ہے، تعلیمی دباؤ کم ہوتا ہے، لچک (resilience) میں اضافہ ہوتا ہے، اور مجموعی تعلیمی کامیابی میں مدد ملتی ہے۔ مطالعہ یہ بھی اجاگر کرتا ہے کہ ہم عصروں کی معاونت شمولیتی تعلیم اور مسابقتی سیکھنے کے ماحول میں کس طرح اہم کردار ادا کرتی ہے۔
کلیدی الفاظ: ہم عصروں کی معاونت، تعلیمی سفر، تحریک، سماجی تعلیم، طلباء کی کامیابی

تعارف:(Introduction)

تعلیم ایک متحرک اور مسلسل عمل ہے جو صرف اساتذہ، نصاب، اور ادارہ جاتی پالیسیوں سے ہی نہیں بلکہ اس سماجی ماحول سے بھی تشکیل پاتی ہے جس میں طلباء سیکھتے اور بڑھتے ہیں۔ مختلف سماجی اثرات میں، ہم عصروں کی معاونت وہ سب سے طاقتور عوامل میں سے ایک کے طور پر ابھرتی ہے جو طلباء کے تعلیمی سفر کو شکل دیتی ہے۔ ہم عصری گروپس تحریک، جذباتی تحفظ، تعاون، اور مشترکہ تعلیمی تجربات کے اہم ذرائع کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ہم جماعتوں اور دوستوں کے ساتھ باقاعدہ بات چیت کے ذریعے، طلباء خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں، شبہات دور کرتے ہیں، سیکھنے کی حکمت عملی تیار کرتے ہیں اور اعتماد پیدا کرتے ہیں۔ وائیگوٹسکی کے Social Constructivist Theory کے مطابق، سیکھنا (learning) سب سے زیادہ مؤثر تب ہوتا ہے جب یہ سماجی تعامل کے ذریعے انجام پاتا ہے، کیونکہ علم اجتماعی طور پر تعمیر کیا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے، ہم عصروں کی معاونت علمی ترقی کو بڑھانے اور گہری سمجھ بوجھ کو فروغ دینے میں ایک اہم عنصر بن جاتی ہے۔

آج کے انتہائی مسابقتی تعلیمی ماحول میں، طلباء مختلف چیلنجز کا سامنا کرتے ہیں جن میں شدید تعلیمی دباؤ، جذباتی تناؤ، ناکامی کا خوف، امتحانی اضطراب، اور مستقبل کے بارے میں غیر یقینی صورتحال شامل ہیں۔ یہ دباؤ اکثر ان کی فلاح و بہبود اور تعلیمی کارکردگی کو متاثر کرتا ہے۔ ایسے مطالبہ والے حالات میں، معاون ہم عصروں کے تعلقات مضبوط نفسیاتی اور جذباتی حفاظتی کردار ادا کرتے ہیں، جو طلباء کو دباؤ کو سنبھالنے، تحریک برقرار رکھنے، اور صحت مند مقابلہ کرنے کی حکمت عملی تیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایسے ہم عصری جو مشابہ تعلیمی مشکلات اور امنگیں رکھتے ہیں، حوصلہ افزائی، یقین دہانی، اور تعلق کا احساس فراہم کرتے ہیں۔ نتیجتاً، طلباء کم تنہا محسوس کرتے ہیں اور تعلیمی تقاضوں کو پورا کرنے میں زیادہ پر اعتماد ہوتے ہیں۔ اس طرح، ایک سیکھنے والے کا تعلیمی سفر بی اسکول کی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت تک بی ہم عصروں کے تعامل، تعاون، اور جذباتی معاونت کے معیار سے گہرائی اور مسلسل متاثر ہوتا ہے۔

ہم عصروں کی معاونت کا تصور:(Concept of Peer Support)

ہم عصروں کی معاونت سے مراد وہ جذباتی، تعلیمی، سماجی، اور تحریک دینے والی مدد ہے جو طلباء سیکھنے کے ماحول میں ایک دوسرے کو فراہم کرتے ہیں۔ یہ فطری طور پر ان طلباء کے درمیان تعامل کے ذریعے پیدا ہوتی ہے جو مشابہ تعلیمی مقاصد، چیلنجز، اور تجربات رکھتے ہیں۔ ہم عصروں کی معاونت میں تعاون پر مبنی مختلف عملی طریقے شامل ہیں جیسے مشترکہ تعلیم (cooperative learning)، ہم عصری تدریس (peer tutoring)، ہم عصری رہنمائی (peer mentoring)، گروپ مباحثے، مشترکہ مسئلہ حل کرنا، مشترکہ جذباتی تجربات، اور باہمی حوصلہ افزائی۔ رسمی، استاد مرکوز تعلیم کے برعکس، ہم عصروں کی معاونت زیادہ تر غیر رسمی، باہمی اور مساوات پر مبنی ہوتی ہے، جہاں ہر سیکھنے والا مدد دیتا اور وصول کرتا ہے۔ یہ مشترکہ فہم اور باہمی اعتماد ہم عصروں کی معاونت کو سیکھنے اور ذاتی ترقی کو فروغ دینے میں انتہائی مؤثر بناتا ہے۔

ہم عصروں کی معاونت سیکھنے کے علمی اور جذباتی دونوں پہلوؤں کو مضبوط کرتی ہے۔ علمی طور پر، طلباء اپنے ہم عصروں سے سوالات پوچھنے، شبہات دور کرنے، اور تصورات کو سمجھنے میں زیادہ راحت محسوس کرتے ہیں بغیر رسمی تنقید کے خوف کے۔ جذباتی اور سماجی طور پر، ہم عصری تعلقات تعلق کا احساس، قبولیت، اور تحفظ فراہم کرتے ہیں جو مثبت خود مفہوم (self-concept) اور تعلیمی اعتماد کے لیے ضروری ہیں۔ ہم عصروں کے ساتھ مسلسل تعامل کے ذریعے، طلباء اہم زندگی کی مہارتیں حاصل کرتے ہیں جیسے کہ مواصلت، تعاون، ہمدردی، قیادت، اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت۔

ہم عصروں کی معاونت کو درج ذیل باہم مربوط جہتوں میں وسیع طور پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

سبق اردو نومبر 2025
13

تعلیمی معاونت :(Academic Support) اس میں سیکھنے کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد شامل ہے جیسے نوٹس کا تبادلہ، مشکل تصورات کی وضاحت، گروپ اسٹڈی میں حصہ لینا، مسائل حل کرنا، اور امتحانات کی تیاری۔ اس طرح کا تعلیمی تعامل فہم کو گہرا کرتا ہے اور سیکھنے کے نتائج کو بہتر بناتا ہے۔

جذباتی معاونت :(Emotional Support) اس میں دیکھ بھال کے اظہار، حوصلہ افزائی، ہمدردی، یقین دہانی، اور دباؤ کو کم کرنے کے طریقے شامل ہیں۔ ہم عصروں کی طرف سے جذباتی معاونت طلباء کو تعلیمی دباؤ، ناکامی کے خوف، اور کارکردگی کی اضطراب سے نمٹنے میں مدد دیتی ہے، جس سے جذباتی فلاح و بہبود بہتر ہوتی ہے۔

سماجی معاونت :(Social Support) اس سے مراد گروپ میں تعلق، دوستی، قبولیت، اور ہم عصروں کے ساتھ مضبوط تعلقات کا احساس ہے۔ سماجی معاونت تنہائی کے احساس کو کم کرتی ہے اور اسکول یا کالج کے ماحول میں مثبت مطابقت کو فروغ دیتی ہے۔

تحریکی معاونت :(Motivational Support) اس میں مقاصد کے تعین، استقامت، امنگ پیدا کرنے، اور سیکھنے میں دلچسپی برقرار رکھنے پر ہم عصروں کے اثرات شامل ہیں۔ ہم عصروں کی حوصلہ افزائی طلباء کو توجہ مرکوز رکھنے، رکاوٹوں پر قابو پانے، اور اعلیٰ تعلیمی کامیابی کے لیے کوشش کرنے میں مدد دیتی ہے۔

اس طرح، ہم عصروں کی معاونت ایک جامع معاونت نظام کے طور پر کام کرتی ہے جو طلباء کی تعلیمی کارکردگی، جذباتی استحکام، سماجی انضمام، اور تحریک کو ان کے تعلیمی سفر کے دوران فروغ دیتی ہے۔

نظریاتی فریم ورک :(Theoretical Framework)

طلباء کی تعلیمی ترقی میں ہم عصروں کی معاونت کا کردار متعدد مستند نفسیاتی اور تعلیمی نظریات پر مضبوطی سے مبنی ہے۔ یہ نظریاتی زاویے وضاحت کرتے ہیں کہ سیکھنا صرف ایک فردی سرگرمی نہیں بلکہ ایک سماجی طور پر مربوط عمل ہے جو تعامل، مشاہدہ، جذباتی تعلق، اور ماحولیاتی اثرات کے ذریعے تشکیل پاتا ہے۔

بینڈورا (Bandura) کے Social Learning Theory کے مطابق، سیکھنا مشاہدے، تقلید، اور سماجی تقویت کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، طلباء اپنے ہم عصروں کے رویے، مطالعے کی عادات، رویے، اور تعلیمی حکمت عملیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اکثر ان کی تقلید کرتے ہیں۔ جب یہ رویے تعریف، قبولیت، یا تعلیمی کامیابی کے ذریعے مثبت طور پر تقویت پاتے ہیں، تو طلباء انہیں اپنانے اور برقرار رکھنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس طرح، ہم عصری گروپس طاقتور ماڈل بن جاتے ہیں جو سیکھنے والوں کی تحریک، اعتماد، خود کفالت (self-efficacy)، اور تعلیمی کارکردگی کو تشکیل دیتے ہیں۔

Vygotsky's Constructivist Theory سیکھنے میں ہم عصروں کی معاونت کی اہمیت کو مزید مضبوط کرتا ہے۔ وائیگوٹسکی نے قریب ترین ترقی کی حد (Zone of Proximal Development) تصور پیش کیا، جو اس فرق کی نمائندگی کرتا ہے جو ایک سیکھنے والا خود مختاری سے کر سکتا ہے اور وہ جو رہنمائی اور تعاون کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے۔ اس زون میں ہم عصری تعامل اہم کردار ادا کرتا ہے، کیونکہ طلباء اکثر بحث، مشترکہ مسئلہ حل کرنے، سوالات کرنے، اور تعاون پر مبنی کاموں کے ذریعے مؤثر طریقے سے سیکھتے ہیں۔ جب ہم عصر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، تو سیکھنا زیادہ بامعنی، فعال، اور سماجی طور پر تعمیر شدہ بن جاتا ہے بجائے اس کے کہ صرف غیر فعال طور پر حاصل کیا جائے۔

Maslow's Humanistic Theory ان نفسیاتی ضروریات کو اجاگر کرتا ہے جو مثالی نشوونما اور سیکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ ماسلو کی ضروریات کی ہائیرارکی کے مطابق، تعلق، محبت، اور سماجی قبولیت بنیادی ضروریات ہیں جنہیں اعلیٰ سطحی سیکھنے اور خود حقیقی بننے (self-actualization) سے قبل پورا کرنا ضروری ہے۔ ہم عصروں کی معاونت یہ جذباتی اور سماجی ضروریات پوری کرتی ہے، جیسا کہ دوستی، قبولیت، حوصلہ افزائی، اور توثیق فراہم کرنا۔ جب طلباء جذباتی طور پر محفوظ اور سماجی طور پر جڑے ہوئے محسوس کرتے ہیں، تو وہ اعلیٰ خود اعتمادی، بہتر تحریک، اور زیادہ تعلیمی مشغولیت ظاہر کرتے ہیں۔

Bronfenbrenner's Ecological Systems Theory انسانی ترقی کو متعدد ماحولیاتی نظاموں کے اثر سے دیکھتا ہے۔ اس فریم ورک میں ہم عصروں کو مائیکرو سسٹم میں رکھا جاتا ہے، جو سیکھنے والے پر براہِ راست اثر ڈالنے والے فوری سماجی ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہم عصروں کے ساتھ روزانہ کے تعاملات طلباء کے رویے، رویے، جذباتی استحکام، اور تعلیمی عمل کو تشکیل دیتے ہیں۔ مثبت ہم عصری تعلقات سیکھنے، مطابقت، اور لچک (resilience) کو فروغ دیتے ہیں، جبکہ منفی ہم عصری تجربات تعلیمی اور جذباتی ترقی میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔

یہ تمام نظریاتی زاویے واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ ہم عصروں کی معاونت صرف تعلیمی ضمنی عنصر نہیں بلکہ ایک بنیادی نفسیاتی اور سماجی قوت ہے جو طلباء کے سیکھنے، تحریک، جذباتی فلاح و بہبود، اور مجموعی تعلیمی سفر پر اثر انداز ہوتی ہے۔

تعلیمی تحریک میں ہم عصروں کی معاونت کا کردار :(Role of Peer Support in Academic Motivation)

ہم عصروں کی معاونت طلباء میں داخلی (intrinsic) اور خارجی (extrinsic) دونوں قسم کی تحریک کو مضبوط کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب طلباء ایک معاون ہم عصری ماحول میں سیکھتے ہیں، تو وہ تعلیمی استقامت، مقصد کی جانب توجہ، اور سیکھنے کے کاموں میں فعال مشغولیت کے اعلیٰ درجے ظاہر کرتے ہیں۔ ہم عصروں کی طرف سے باقاعدہ حوصلہ افزائی سیکھنے والوں کو خود شک، کم اعتماد، اور ناکامی کے خوف جیسے عام رکاوٹوں پر قابو پانے میں مدد دیتی ہے، جو تعلیمی کامیابی میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ یہ جاننا کہ ہم عصر ان کی صلاحیتوں پر یقین رکھتے ہیں، طلباء کو زیادہ محنت کرنے اور مشکل حالات میں بھی اپنے تعلیمی مقاصد کے ساتھ جڑے رہنے کی تحریک دیتا ہے۔ مزید برآں، تعاون اور صحت مند مقابلے کے ساتھ ایک تعلیمی ماحول طلباء کو اپنی حدود کو

سبق اردو نومبر 2025
14

بڑھانے، اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے، اور مستقل تعلیمی کوشش کو برقرار رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔

ہم عصر طلباء کی تعلیمی امنگوں کو شکل دینے میں بھی ایک طاقتور کردار ادا کرتے ہیں، خاص طور پر کردار نمونہ سازی (role modeling) کے ذریعے۔ اعلیٰ کارکردگی دکھانے والے اور پرعزم ہم عصر اکثر اس بات کی زندہ مثال کے طور پر کام کرتے ہیں کہ محنت اور لگن کے ذریعے کیا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اپنے ہم عصروں کی کامیابی کو دیکھ کر، طلباء اپنے لیے بلند تر اہداف مقرر کرنے اور عمدگی کے لیے کوشش کرنے کی ترغیب پاتے ہیں۔ یہ عمل ایک مثبت تعلیمی اثر پیدا کرتا ہے، جہاں تحریک، اچھی مطالعے کی عادات، اور کامیابی پر مرکوز رویہ قدرتی طور پر ہم عصری گروپ میں پھیلتا ہے۔ نتیجتاً، کلاس روم اور اس سے آگے ایک سیکھنے، جوش، اور تعلیمی عمدگی کا ماحول فروغ پاتا ہے۔

ہم عصروں کی معاونت اور تعلیمی کامیابی: (Peer Support and Academic Achievement)

تعلیمی تحقیق کا ایک وسیع ذخیرہ مسلسل یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم عصروں کی معاونت اور تعلیمی کامیابی کے درمیان مضبوط مثبت تعلق موجود ہے۔ وہ طلباء جو فعال طور پر ہم عصری معاونت والے تعلیمی ماحول میں حصہ لیتے ہیں، ان کے تعلیمی نتائج ان طلباء کے مقابلے بہتر ہوتے ہیں جو تنہا سیکھتے ہیں۔ ہم عصروں کی مدد سے سیکھنے کی حکمت عملیوں جیسے مشترکہ تعلیم (cooperative learning)، گروپ مباحثے، ہم عصری تدریس (peer tutoring)، اور مشترکہ منصوبے طلباء کی تصوری سمجھ بوجھ، مسئلہ حل کرنے کی مہارتوں، اور طویل مدتی یادداشت (long-term memory retention) کو نمایاں طور پر بہتر بناتے ہیں۔ جب طلباء اپنے ہم عصروں کو تصورات کی وضاحت کرتے ہیں، تو وہ فعال طور پر اپنے خیالات کو منظم کرتے ہیں، اپنی سمجھ بوجھ کو گہرا کرتے ہیں، اور اعلیٰ درجے کی سوچ کی مہارتیں تیار کرتے ہیں۔ اسی دوران، وہ سیکھنے والے جو معاونت حاصل کرتے ہیں، وضاحت، اعتماد، اور تعلیمی مواد کی بہتر فہم حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح، ہم عصری تعامل نہ صرف سیکھنے والے بلکہ معاون کے لیے بھی فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، وہ طلباء جو ہم عصری تنہائی، سماجی اخراج، یا محدود ہم عصری تعامل کا سامنا کرتے ہیں، اکثر تعلیمی طور پر مشکلات کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسے طلباء کلاس روم میں کم شرکت، تعلیمی کارکردگی میں کمی، زیادہ غیر حاضری، اور جذباتی مشکلات جیسے اضطراب اور کم خود اعتمادی ظاہر کر سکتے ہیں۔ معاون ہم عصری تعلقات کی غیر موجودگی سیکھنے سے دوری اور تعلیمی سرگرمیوں میں دلچسپی کی کمی کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لیے، ہم عصروں کی معاونت ایک مضبوط حفاظتی عنصر کے طور پر کام کرتی ہے جو سیکھنے کے نتائج کو بہتر بناتی ہے، باقاعدہ حاضری کو فروغ دیتی ہے، اور تعلیمی ناکامی یا ڈراپ آؤٹ کے خطرے کو کم کرتی ہے۔ تعاونی سیکھنے والی کمیونٹیز کو فروغ دے کر، تعلیمی ادارے طلباء کی تعلیمی کامیابی اور مجموعی فلاح و بہبود کو نمایاں طور پر بہتر بنا سکتے ہیں۔

ہم عصروں کی معاونت اور جذباتی فلاح و بہبود: (Peer Support and Emotional Well-Being)

تعلیمی کامیابی طلباء کی جذباتی فلاح و بہبود کے ساتھ گہری جڑی ہوئی ہے، کیونکہ دباؤ، اضطراب، اور منفی جذبات سیکھنے، تحریک، اور کارکردگی پر نمایاں اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس تناظر میں، ہم عصروں کی معاونت طلباء کی جذباتی صحت کو برقرار رکھنے اور بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ حوصلہ افزائی، سمجھ بوجھ، اور ہمدردی فراہم کر کے، ہم عصر ایک دوسرے کو تعلیمی چیلنجز اور دباؤ سے نمٹنے میں مدد دیتے ہیں۔ دوستوں یا مطالعے کے ساتھیوں کی طرف سے جذباتی یقین دہانی طلباء کو یہ احساس دلاتی ہے کہ ان کی مشکلات کو تسلیم اور تصدیق کیا گیا ہے، جس سے تنہائی اور بے بسی کے احساسات کم ہوتے ہیں۔ ہم عصری گروپس میں مقابلہ کرنے کی حکمت عملیوں کا اشتراک، مشکلات پر بات چیت، اور مشورے فراہم کرنا طلباء کو عملی اور جذباتی اوزار فراہم کرتا ہے تاکہ وہ تعلیمی دباؤ کو مؤثر طریقے سے سنبھال سکیں۔

ہم عصروں کی معاونت کی اہمیت خاص طور پر اعلیٰ دباؤ والے تعلیمی ماحول میں واضح ہو جاتی ہے، جیسے مسابقتی امتحانات یا سخت یونیورسٹی پروگرام۔ ایسے ماحول میں طلباء اکثر شدید دباؤ، ناکامی کا خوف، اور کارکردگی کی اضطراب کا سامنا کرتے ہیں۔ معاون ہم عصری تعلقات لچک (resilience)، جذباتی استحکام، اور خود اعتمادی کو فروغ دیتے ہیں، جس سے سیکھنے والے مثبت ذہنیت کے ساتھ چیلنجز کا سامنا کر پاتے ہیں۔ وہ طلباء جو مشترکہ گروپوں میں سیکھتے ہیں یا ہم عصروں کی قیادت میں سیکھنے کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں، اکثر کم تھکن، زیادہ تحریک، اور اعلیٰ حوصلہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ جذباتی طور پر زیادہ محفوظ محسوس کرتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی سفر میں اکیلے نہیں ہیں۔ مزید برآں، یہ سماجی تعلقات تعلق کے احساس میں اضافہ کرتے ہیں اور نفسیاتی دباؤ کو کم کرتے ہیں، جس سے توجہ، استقامت، اور مجموعی تعلیمی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔

اس طرح، ہم عصروں کی معاونت نہ صرف علمی ترقی اور تعلیمی کامیابی کے لیے فائدہ مند ہے بلکہ جذباتی فلاح و بہبود کے لیے بھی ایک حفاظتی میکانزم کے طور پر کام کرتی ہے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ طلباء ذہنی طور پر صحت مند، متحرک، اور اپنی تعلیم میں مشغول رہیں۔

شمولیتی تعلیم میں ہم عصروں کی معاونت: (Peer Support in Inclusive Education)

ہم عصروں کی معاونت شمولیتی کلاس رومز میں ایک لازمی اور تبدیلی لانے والا کردار ادا کرتی ہے، جہاں مختلف صلاحیتوں، پس منظر، اور سیکھنے کی ضروریات والے طلباء ایک ساتھ سیکھتے ہیں۔ ایسے ماحول میں، ہم عصری ذریعے سیکھنے کی حکمت عملی خاص طور پر مؤثر ثابت ہوتی ہیں کیونکہ یہ تمام سیکھنے والوں، بشمول معذور طلباء، کے درمیان سماجی انضمام، قبولیت، اور فعال تعلیمی شرکت کو فروغ دیتی ہیں۔ مشترکہ سیکھنے میں حصہ لے کر، طلباء باہمی سمجھ بوجھ اور احترام پیدا کرتے ہیں، جس سے کلاس روم میں تنوع اور شمولیت کی قدر کرنے والا ماحول قائم ہوتا ہے۔

سبق اردو نومبر 2025
15

ہم عصر سیکھنے کے ساتھی، کردار نمونے، اور جذباتی معاون کے طور پر کام کرتے ہیں، رہنمائی اور حوصلہ افزائی فراہم کرتے ہیں جو خصوصی ضروریات والے طلباء کو تعلیمی کاموں کو زیادہ اعتماد کے ساتھ انجام دینے میں مدد دیتی ہے۔ وہ تصورات کی وضاحت، مناسب رویے کی مثال پیش کرنے، اور مسئلہ حل کرنے کے عملی حکمت عملی فراہم کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ تعلیمی امور سے آگے، ہم عصر جذباتی معاونت بھی فراہم کرتے ہیں، اپنے ہم جماعتوں کو اضطراب، مایوسی، یا سماجی چیلنجز سے نمٹنے میں مدد دیتے ہیں، جس سے تمام طلباء کے لیے مجموعی تعلیمی تجربہ بہتر ہوتا ہے۔ یہ باہمی تعامل نہ صرف معذور طلباء بلکہ ان کے ہم عصروں کے لیے بھی فائدہ مند ہے، ہمدردی، صبر، اور تعاون کی مہارتوں کو فروغ دیتا ہے۔

خصوصی تعلیم میں وسیع تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم عصری تدریس (peer tutoring) اور مشترکہ سیکھنے کی حکمت عملی معذور طلباء کی تعلیمی مہارتوں، مواصلاتی صلاحیتوں، اور سماجی تعاملات میں نمایاں بہتری لاتی ہیں۔ یہ ہم عصری قیادت والی پہلیں عملی سیکھنے، مثبت تقویت، اور تعمیری رائے کے مواقع پیدا کرتی ہیں۔ ایسے تعاملات کے ذریعے، طلباء سیکھتے ہیں کہ کس طرح مشترکہ طور پر کام کیا جائے، اختلافات کا احترام کیا جائے، اور گروپ سرگرمیوں میں بامعنی طور پر حصہ لیا جائے۔

اس طرح، شمولیتی کلاس رومز میں ہم عصروں کی معاونت نہ صرف سیکھنے کے نتائج اور سماجی مہارتوں کو بڑھاتی ہے بلکہ تعاون، ہمدردی، انصاف، اور برابری کے اقدار کو بھی فروغ دیتی ہے۔ ایک ایسے ماحول کو فروغ دے کر جہاں ہر طالب علم کو قبول اور معاونت فراہم کی جاتی ہے، ہم عصروں کی معاونت شمولیتی، سماجی طور پر ذمہ دار، اور تعلیمی طور پر کامیاب سیکھنے والی کمیونٹیز قائم کرنے کا ایک اہم میکانزم بن جاتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم اور مسابقتی سیکھنے میں ہم عصروں کی معاونت:

اعلیٰ تعلیم کے سطح پر، ہم عصروں کی معاونت طلباء کی تعلیمی مطابقت، پیشہ ورانہ امنگوں، اور تحقیق و علمی سرگرمیوں میں مشغولیت کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء اکثر پیچیدہ چیلنجز کا سامنا کرتے ہیں، جن میں بڑھا ہوا تعلیمی بوجھ، نئے تعلیمی ماحول میں مطابقت، اور اعلیٰ سطح پر کارکردگی کا دباؤ شامل ہیں۔ اس تناظر میں، ہم عصری گروپس اہم سماجی، تعلیمی، اور جذباتی معاونت فراہم کرتے ہیں، جو طلباء کو ان چیلنجز سے مؤثر طریقے سے نمٹنے میں مدد دیتی ہے۔ پہلی نسل کے سیکھنے والے، پسماندہ پس منظر کے طلباء، اور وہ طلباء جو بغیر کسی سابقہ کالج سطح کی توقعات کے اعلیٰ تعلیم میں داخل ہوتے ہیں، خاص طور پر منظم ہم عصری رہنمائی پروگراموں اور مشترکہ سیکھنے والی کمیونٹیز سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جو رہنمائی، حوصلہ افزائی، اور ضروری تعلیمی وسائل تک رسائی فراہم کرتی ہیں۔

مسابقتی امتحانات کی تیاری کے سیاق و سباق میں بھی ہم عصروں کی معاونت اتنی ہی اہم ہے، جہاں طلباء شدید دباؤ، وقت کی کمی، اور اعلیٰ توقعات کا سامنا کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں، ہم عصری تعاملات سیکھنے والوں کو وسائل کا تبادلہ کرنے، مطالعے کے شیڈول کی منصوبہ بندی کرنے، نظم و ضبط برقرار رکھنے، اور ایک دوسرے کو جوابدہ بنانے میں مدد دیتے ہیں، جس سے مستقل محنت اور منظم تیاری یقینی بنتی ہے۔ گروپ اسٹڈی سیشن نہ صرف مشکل تصورات کو واضح کرنے اور مسئلہ حل کرنے کی مشق کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں بلکہ جذباتی یقین دہانی اور نفسیاتی معاونت بھی فراہم کرتے ہیں، جس سے اضطراب، گھبراہٹ، اور تنہائی کے احساسات کم ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ کام کرنے سے طلباء میں اعتماد، لچک، اور مشترکہ مقصد کا احساس پیدا ہوتا ہے، جو ان کی تحریک اور کارکردگی کو نمایاں طور پر بڑھاتا ہے۔

مزید برآں، ہم عصروں کی معاونت اہم نرم مہارتوں کی ترقی کو فروغ دیتی ہے، جیسے کہ مواصلات، ٹیم ورک، تنقیدی سوچ، اور قیادت، جو تعلیمی اور پیشہ ورانہ دونوں سیاق و سباق میں کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ مشترکہ ماحول میں، طلباء مختلف نقطۂ نظر کا احترام کرنا، تعمیری رائے دینا، اور گروپ سرگرمیوں میں پہل کرنا سیکھتے ہیں، جو مجموعی طور پر ذاتی اور تعلیمی ترقی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ، اعلیٰ تعلیم اور مسابقتی سیکھنے کی سطح پر، ہم عصروں کی معاونت ایک کثیر الجہتی میکانزم کے طور پر کام کرتی ہے جو تعلیمی عمدگی، جذباتی فلاح و بہبود، مؤثر مطابقت، اور ضروری زندگی کی مہارتوں کی ترقی کو فروغ دیتی ہے اور اس طرح طلباء کے مجموعی تعلیمی سفر اور طویل مدتی کامیابی کو گہرائی سے تشکیل دیتی ہے۔

ہم عصروں کی معاونت میں چیلنجز: (Challenges in Peer Support)

اگرچہ ہم عصروں کی معاونت تعلیمی، جذباتی، اور سماجی فوائد فراہم کرتی ہے، یہ چیلنجز اور ممکنہ نقصانات سے خالی نہیں ہے۔ ایک اہم مسئلہ منفی ہم عصری دباؤ (negative peer pressure) کا ہونا ہے، جہاں طلباء پر اثر ڈال کر وہ غیر مؤثر مطالعے کی عادات اپنانے، کام کو ملتوی کرنے (procrastination)، یا حتیٰ کہ غیر اخلاقی سرگرمیوں جیسے تعلیمی بے ایمانی (academic dishonesty) کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح، ہم عصروں کے درمیان ضرورت سے زیادہ تعلیمی موازنہ اور غیر صحت مند مقابلہ دباؤ، کم خود اعتمادی، اور ناکافی محسوس کرنے کے جذبات کو جنم دے سکتا ہے، جو تحریک کو بڑھانے کے بجائے کمزور کر سکتا ہے۔

ایک اور ممکنہ چیلنج ہم عصری انحصار (peer dependency) ہے، جہاں کچھ طلباء اپنے ہم عصروں پر رہنمائی، فیصلہ سازی، یا مسئلہ حل کرنے کے لیے حد سے زیادہ انحصار کر لیتے ہیں، جس سے خود مختار سیکھنے کی مہارتوں اور خود اعتمادی کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ، ہم عصری گروپس میں سماجی تعلقات کی پیچیدگیاں بعض طلباء، خاص طور پر وہ جو شرمیلے، اندرونی مزاج کے حامل، یا سیکھنے میں مشکلات رکھتے ہیں، کے لیے اخراج، دھونس، یا تعلیمی حوصلہ شکنی کا سبب بن سکتی ہیں۔ ایسے منفی تجربات نہ صرف تعلیمی کارکردگی کو متاثر کرتے ہیں بلکہ جذباتی فلاح و بہبود اور سماجی مطابقت کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

ان چیلنجز کے پیش نظر، یہ ضروری ہے کہ ہم عصروں کے تعاملات کو اساتذہ کی

سبق اردو نومبر 2025
16

رہنمائی میں، منظم اور اخلاقی طور پر فروغ دیا جائے۔ اساتذہ اور رہنما گروپ سرگرمیوں کی نگرانی کریں، مساوی شرکت کی ترغیب دیں، اور شمولیتی اور باعزت رویے کو فروغ دیں۔ تعلیم دینے والے طلباء کو مشترکہ سیکھنے کی مہارتوں، تنازعات کے حل، اور تعمیری رائے دینے کی تربیت بھی فراہم کر سکتے ہیں تاکہ ہم عصری معاونت مثبت تعلیمی ترقی، جذباتی تحفظ، اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دے، بجائے اس کے کہ دباؤ یا عدم مساوات پیدا کرے۔ مناسب طریقے سے سہولت فراہم کرنے پر، ہم عصری معاونت اپنے فوائد کو زیادہ سے زیادہ اور ممکنہ خطرات کو کم کر سکتی ہے۔

تعلیمی مضمرات: (Educational Implications)

ہم عصروں کی معاونت پر حاصل شدہ نتائج تعلیمی عمل کے لیے اہم مضمرات رکھتے ہیں، اور یہ زور دیتے ہیں کہ تعلیمی اداروں کو فعال طور پر مثبت ہم عصری تعاملات کو فروغ دینا چاہیے جو سیکھنے اور جذباتی ترقی دونوں کو بڑھائیں۔ اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں کو ایسے حکمت عملیوں کو جان بوجھ کر نافذ کرنا چاہیے جو طلباء کو تعاون کرنے، علم کا اشتراک کرنے، اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ترغیب دیں۔ مشترکہ سیکھنے کی تکنیکیں، جیسے گروپ مسئلہ حل کرنا، پروجیکٹ پر مبنی تعلیم، اور ہم عصری قیادت میں مباحثے، نہ صرف تعلیمی مشغولیت کے معنی خیز مواقع فراہم کرتی ہیں بلکہ ٹیم ورک اور مواصلاتی مہارتوں کو بھی فروغ دیتی ہیں۔

ہم عصری رہنمائی کے پروگرام ایک اور مؤثر حکمت عملی ہیں، خاص طور پر پہلے سال کے طلباء، پسماندہ پس منظر کے طلباء، یا وہ طلباء جو خصوصی تعلیمی ضروریات رکھتے ہیں، کی معاونت کے لیے۔ ایسے پروگرام تجربہ کار یا اعلیٰ کارکردگی والے طلباء کو اپنے ہم عصروں کی رہنمائی، حوصلہ افزائی، اور تحریک دینے کی اجازت دیتے ہیں، اور تعلیمی اور جذباتی دونوں طرح کی معاونت فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح، گروپ پر مبنی پروجیکٹس اور مشترکہ اسائنمنٹس نہ صرف سیکھنے کے نتائج کو بہتر بناتے ہیں بلکہ سماجی مہارتوں، ہمدردی، اور ہم عصروں کے لیے ذمہ داری کے احساس کو بھی فروغ دیتے ہیں۔ ہم عصری تدریس (peer tutoring) مداخلتیں طلباء کو مشکل تصورات کی سمجھ بوجھ کو مضبوط کرنے، مسئلہ حل کرنے کی مشق کرنے، اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد حاصل کرنے میں خاص طور پر مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

تعلیمی معاونت کے علاوہ، اداروں کو سماجی-جذباتی سیکھنے کی سرگرمیاں بھی شامل کرنی چاہیے جو ہمدردی، جذباتی ضبط، تنازعہ حل کرنے، اور مؤثر مواصلت جیسی مہارتوں کو فروغ دیں۔ یہ سرگرمیاں طلباء کو بین الشخصی چیلنجز سے نمٹنے، مثبت تعلقات قائم کرنے، اور معاون کلاس روم ماحول بنانے میں مدد دیتی ہیں۔

اساتذہ اس عمل میں سہولت کار اور رہنماؤں کے طور پر ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انہیں منظم ہم عصری تعاملات ڈیزائن کرنے، گروپ کی حرکیات کی نگرانی کرنے، اور مساوی شرکت کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے، تاکہ تمام طلباء، چاہے وہ کسی بھی صلاحیت یا پس منظر کے ہوں، ہم عصری معاونت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ تعاون، شمولیت، اور باہمی حوصلہ افزائی کے کلچر کو فروغ دے کر، تعلیمی ادارے نہ صرف تعلیمی کامیابی بلکہ طلباء کی جذباتی فلاح و بہبود، لچک، اور زندگی بھر سیکھنے کی مہارتوں کو بھی بہتر بنا سکتے ہیں۔

نتیجہ: (Conclusion)

ہم عصروں کی معاونت ایک اہم سماجی قوت ہے جو طلباء کے تعلیمی سفر کو نمایاں طور پر تشکیل دیتی ہے، کیونکہ یہ تحریک، علمی ترقی، جذباتی فلاح و بہبود، لچک، اور سماجی انضمام کو فروغ دیتی ہے۔ معاون ہم عصری نیٹ ورکس میں حصہ لینے سے طلباء تعلیمی چیلنجز سے نمٹنے، ناکامی کے خوف پر قابو پانے، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مستقل محنت جاری رکھنے، اور تعلق، خود اعتمادی، اور باہمی احترام کے احساس کو فروغ دینے میں مدد پاتے ہیں۔ طلباء مرکوز تعلیم میں، ہم عصروں کی معاونت صرف ضمنی عنصر نہیں بلکہ جامع سیکھنے کا ایک لازمی حصہ ہے، جو علم کی تعمیر، صحت مند تعلیمی مشغولیت، جذباتی استحکام، اور شمولیتی عملی طریقوں کو فروغ دیتا ہے جو تمام سیکھنے والوں کے لیے فائدہ مند ہیں۔ تعاون پر مبنی سیکھنے، ہم عصری رہنمائی، مشترکہ پروجیکٹس، اور سماجی-جذباتی سیکھنے کو فروغ دے کر، تعلیمی ادارے ایسے سیکھنے والے تیار کر سکتے ہیں جو علمی طور پر ماہر، سماجی طور پر ذمہ دار، جذباتی طور پر مضبوط، اور اعلیٰ تعلیم، پیشہ ورانہ زندگی، اور زندگی بھر سیکھنے کے لیے تیار ہوں۔

سبق اردو نومبر 2025

17

عمر خیام: شاعر، فلسفی یا سائنسدان

ڈاکٹر قیصر احمد

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باولی حیدرآباد، ۵۰۰۰۳۲

آل زہرا زیدی، ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باولی، حیدرآباد، ۵۰۰۰۳۲

فارسی ادب کی تاریخ میں بے شمار بلند پایہ شعرا، ریاضیدان اور حکیم گزرے ہیں۔ انہی درخشاں ناموں میں پانچویں صدی هجری کے اواخر اور چھٹی صدی ہجری کے اوایل میں ایک صاحبِ فکر و فلسفہ شاعر، ریاضیدان اور حکیم ''عمر خیام'' بھی شامل ہیں انکا مکمل نام حکیم ابوالفتح عمر بن ابراهیم خیام نیشاپوری تھا انکا آبائی پیشہ خیمہ دوزی تھا جسکی وجہ سے انکا لقب خیام پڑا۔ انکی ولادت تقریبا ۴۰۸ ھ یا ۴۱۰ ھ، ۱۰۱۷ یا ۱۰۱۹ء میں ہوئی۔

عمر خیام کو متعدد علوم میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی خصوصاً علم ہیئت، فلسفہ، علم نجوم اور ریاضی میں۔ قرآن، فقہ اور حدیث کی تعلیم انہوں نے امام موفق نیشاپوری (۱) سے حاصل کی جبکہ علم ہیئت کے استاد ابوالحسن تھے۔ اپنی علمی عظمت اور خدمات کی وجہ سے وہ سلجوقی دربار کے نہایت محترم علما وفضلا میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے دو نہایت قریبی دوست حسن بن صباح اور نظام الملک طوسی تھے، جو ان کے ہم سبق بھی رہے۔ عمر خیام نہایت قناعت پسند اور خوددار انسان تھے انکے بارے میں ایک روایت ملتی ہے کہ ایام طفلی میں تینوں نے طے کیا کہ ہم میں جو بھی پہلے کسی اعلی مقام پر فائز ہوگا، دوسروں کے ساتھ رعایت کرے گا۔ حسن اتفاق نظام الملک طوسی سلجوقی دربار میں وزارت کے عہدے پر فائز ہوا خیام اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایام طفلی کا وعدہ یاد دلایا نظام الملک نے نیشاپور اور اس کے گردنواح کی جاگیر اسے عطا کی لیکن خیام نہایت قانع تھا اس نے قبول نہ کیا اور درخواست کی کہ وظیفے کے طور پر کچھ مقرر کر دیجئے لہذا نظام الملک نے بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر مقرر کر دی (۲)۔

عمر خیام نے اپنی زندگی میں متعدد سفر کیے جن میں خراسان کے اہم شہر طوس، بلخ، بخارا اور مرو خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مختلف علمی مراکز کے یہ سفر ان کے فکری دائرے کو وسعت دینے کا سبب بنے۔ اس کے علاوہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام نے بغداد کا سفر بھی کیا جو اُس زمانے میں علم و ادب اور تہذیب وثقافت کا عظیم مرکز تھا۔ نیز یہ روایت بھی ملتی ہے کہ انہوں نے حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی جو ان کی روحانی وابستگی کا مظہر ہے۔

خیام صاحب تصنیف بھی تھے جن کا ذکر سید سلمان ندوی نے اپنی کتاب '' خیام اور اس کے سوانح حیات پر ناقدانہ نظر'' میں چند کتابوں کا ذکر کیا ہے مثلا رسالہ جبر و مقابلہ، رسالہ فی شرح ما، رسالہ فی الکون والتکلیف، رسالہ در علم کلیات وجود، رسالہ فی کلیات الوجود، رسالہ فی الوجود، نوروز نامہ، رباعیات عمر خیام، چند عربی اشعار، مکاتیب خیام فارسی۔

اگرچہ خیام کی شہرت کا سب سے بڑا باعث ان کی رباعیات ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فلسفہ میں بوعلی سینا کے ہم پلہ مانے جاتے ہیں اور مذہبی علوم میں بھی امامِ فن تھے۔ علمِ نجوم میں ان کی مہارت اس قدر مسلم تھی کہ ملک شاہ سلجوقی اہم تقریبات کی تاریخیں ان سے مقرر کراتا تھا۔ اسکے متعلق ایک واقعہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب ''شعرالعجم'' میں نقل کیا ہے کہ ایک بار ملک شاہ شکار کے لیے جانا چاہا تو خیام سے کہا کہ کوئی مناسب وقت مقرر کرے خیام نے علم نجوم کے حساب سے ایک دن مقرر کیا اور بادشاہ کو خود سوار کرایا لیکن اسی وقت مطلع ابر آلود ہو گیا اور بارش کے آثار نمودار ہوئے لوگ خیام پر ہنسنے لگے تو خیام بادشاہ سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا کہ ''بادل ابھی چھٹ جائیں گے اور مطلع صاف ہو جائے گا'' چنانچہ ایسا ہی ہوا (۳)۔ اس واقعہ کے علاوہ بھی اسکے ماہر نجومی ہونے کی اور دلیلیں ملتی ہے جیسے کہ ۴۶۷ ھ میں ملک شاہ سلجوقی اپنے ملک میں ایک عظیم رصد خانہ بنوانا چاہا تو اس نے ملک کے بڑے بڑے عالموں اور ہیئت دانوں کو بلوایا ان میں سے ایک خیام بھی تھا، ابن الاثیر لکھتا ہے کہ اس رصد خانہ پر کافی مال خرچ ہوا اور اس رصد سے جو زیچ تیار ہوئی وہ خاص خیام کی فکر کا نتیجہ تھی (۴)

ملک شاہ سلجوقی نے کچھ لوگوں کی ایک کمیٹی بنائی جنکو ایک ایسے مناسب کلینڈر بنانے کا حکم دیا جو موسم کی تبدیلی کا صحیح اندازہ لگا سکے اور سال میں زیادہ غلّہ پیدا کرنے میں کیسانوں کی مدد کر سکے لہذا عمر خیام کی نگرانی میں ایک ایسا شمسی کلینڈر تشکیل پایا جو گریگورین کلینڈر سے بھی زیادہ درست منانا جاتا ہے۔ اور اس کلینڈر کا نام سلطان کے نام پر ''تقویم جلالی'' پڑا۔

عمر خیام کو علم طب پر بھی مہارت تھی یہ سلجوقی دربار کا طبیب بھی تھا ایک مرتبہ جب ملک شاہ سلجوقی کے بیٹے شہزادہ سنجر کو چیچک ہوا تو خیام نے اسکا کامیاب علاج کیا۔ (۵) لیکن شبلی نعمانی اپنی کتاب میں شہروزی کی کتاب '' تاریخ حکما'' کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عمر خیام کے تعلقات سلطان سنجر کے ساتھ اچھے نہیں تھے شہروزی نے اسکی وجہ بیان کی ہے کہ جب خیام کو شہزادہ سنجر کے علاج کے لئے طلب کیا گیا تو وزیر نے خیام سے پوچھا کہ بیمار کی کیا حالت ہے تو خیام نے کہا کہ آثار اچھے نہیں ہیں اور یہ خبر کسی نے سنجر تک پہنچا دی جس سے اسکو نہایت رنج ہوا جو ہمیشہ قائم رہا۔ (۶)

سبق اردو نومبر 2025
18

خیام ایک ذہین شخص تھا اسکا حافظہ اس قدر مضبوط تھا کی شہروزی تاریخ الحکما میں لکھتے ہیں ایک دفعہ اصفہان میں ایک کتاب نظر سے گزری سات دفعہ اسکا مطالعہ کیا نیشاپور میں واپس آیا تو ساری کتاب زبانی لکھوادی اصل سے مقابلہ کیا گیا تو خفیف فرق نکلا۔(۷)

خیام کی شہرت کا ایک بڑا سبب ان کی رباعیات بھی ہیں جوانہوں نے اپنے مکالموں اور تحقیقی مشغولیت سے فارغ اوقات میں ذہنی تھکاوٹ کو دور کرنے اور دل ودماغ کی الجھنوں کو ہلکا کرنے کے لیے رقم کیں۔ان رباعیات میں خیام کے نہایت لطیف، حکیمانہ اور گہرے فلسفیانہ خیالات کی جھلک ملتی ہے۔اگرچہ خیام سے پہلے رباعی کے میدان میں شہید بلخی، ابوشکور بلخی، رودکی اور ابوسعید جیسے شعراء گزر چکے تھے، لیکن خیام کی رباعی ایک جداگانہ رنگ رکھتی ہے۔اسنے عربی زبان میں بھی اشعار کہے اور فارسی زبان میں بھی ان کی فارسی رباعیاں تعداد میں کم ہونے کے باوجود سادگی بیان، صفائ اسلوب اور گہرائ معنی کے اعتبار سے بلند پایہ سمجھی جاتی ہیں۔چونکہ خیام علم ہیئت کے ماہر تھے اس لیے انہوں نے کائنات کی خلقت اور اس کے اسرار پر بہت غور وفکر کیا۔ان کے الفاظ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ انسان اپنی اصل حقیقت سے بے خبر اور نادان ہے۔نہ اسے آفرینش کے راز معلوم ہے نہ دنیا کے معنے اس کی سمجھ میں آتے ہیں۔اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جانے والا ہے۔

دردایرہ ای کہ آمدن ورفتن ماست
اورانہ بدایت، نہ نہایت پیداست
کس می نزند دمی دراین معنی راست
کاین آمدن ازکجاورفتن بہ کجاست(۸)

خیام کا ایک تاثر یہ بھی ہے کہ انسانی زندگی کا درخت ہمیشہ سرسبز وشاداب نہیں رہتا ایک دن خشک ہوکر زمین پر گر جاتا ہے یعنی تندرستی بیماری سے جوانی بڑھاپے سے اور زندگی موت سے بدل جاتی ہے اور دنیا کے بڑے بڑے انسان ایک دن سپرد خاک ہوجاتے ہیں۔

ھرسبزہ کہ برکنار جوی رستہ است
گوی زلب فرشتہ خوبی رستہ است
پابرسر سبزہ تابہ خواری ننہی
کان سبزہ زخاک لالہ روبی رستہ است(۹)

انکے علاوہ عمر خیام نے اپنی رباعیات میں کئ اہم موضوعات کو بیان کیا ہے۔ دکھاوے، فریب، ریاکاری اور جھوٹ کی مذمت، خوشدلی کی ترغیب، دنیا کی بے ثباتی، انسان کی ناکامیوں، غم، مسئلہ جبر، توبہ واستغفار انہیں چند موضوعات پر عمر خیام نے کئ کئ اشعار کہے ہیں لیکن ہر رباعی ایک نئ سوچ، نئ فکر کو پروان چڑھاتی ہے۔ اور خیام نے زندگی گزارنے کے لئے کچھ ہدایات وطریقہ کار بھی بتائیں ہیں وہ اپنی شاعری میں زندگی کی ناپائیداری کا بھی ذکر کرتا ہے۔پیرانِ طریقت کی ظاہرداری اور دنیا کی بے رحمی کے بعد خیام ہمیں نجات کا راستہ دکھاتا ہے۔خیام کے نزدیک زندگی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسان خوش رہنا سیکھے بے نیازی اختیار کرے اور ہر لمحے کو غنیمت سمجھے۔وہ کہتا ہے کہ زمانہ سب پر ظلم کرتا ہے ہم سب تقدیر کے کھلونے ہیں۔نہ ہم گذشتہ کو بدل سکتے ہیں نہ آنے والے واقعات کو اپنے قابو میں کر سکتے ہیں۔دنیا ہمارے مطابق نہیں چلتی اس لیے بہتر یہی ہے کہ نہ ماضی کا رنج زیادہ سوچیں اور نہ مستقبل کا غم پالیں۔اس کا مشورہ ہے کہ زندگی کے ہر لمحے کو قیمتی جانیں خوش رہیں اور اپنے دل کی خواہشوں کو اس مختصر زندگی میں پورا کریں۔زندگی کے کاموں میں سرگرم رہیں حادثات سے گھبرائیں نہیں ہر مصیبت کا حوصلے سے مقابلہ کریں اور ہر دن کی قدر پہچانیں۔

برخیز ومخور غم جہان گذران
بنشین ودمی بہ شادمانی گذران
درطبع جہان اگر وفایی بودی
نوبت بہ تو خود نیامدی ازدگران(۱۰)

ازدی کہ گذشت ہیچ ازاو یادمکن
فردا کہ نیامدہ است فریادمکن
برنامدہ وگذشتہ بنیادمکن
حالی خوش باش وعمر برباد مکن(۱۱)

خیام کی فکر ہے کہ خدا وہی ہے جو اپنے بندوں کو معاف کرے اور ان پر رحم کرے نا کہ انکی اطاعت کے بدلے انکو جنت بخشے کونکہ یہ ایک قسم کا سودا ہوا نہ کہ خدا کی رحمت کا اندازہ اسلئے خیام کہتا ہے کہ میں کئ بار گناہ کروں گا اور دیکھوں گا کی میرے گناہوں کی تعداد زیادہ ہے یہ تیری رحمت ان میں سے کون کس پر غالب ائے گا۔یہ بات ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت زیادہ ہے وہ بڑا بخشنے والا ہے لیکن خیام کے مغفرت کا انداز ایسا ہے یعنی وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔

من بندہ عاصیم رضای تو کجا است
تاریک دلم نور صفائ تو کجا است
ماراتو بہشت اگر بہ طاعت بخشی
آن بیع بود لطف وعطای تو کجا است(۱۲)

آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو
صد سالہ شدم بناز ونعمت تو

سبق اردو نومبر 2025
19

صد سالہ بہ امتحان گنہ خواہم کرد
تا جرم من است بیش یا رحمت تو (۱۳)

خیام نے جس شراب نوشی کا ذکر کیا ہے دراصل وہ شراب حکمت ہے اسی کے نشے میں مست رہنے کی بات اکثر خیام نے اپنی رباعیات میں کی ہے اسکا کہنا ہے کہ انسان جس حال میں مرے گا اسی حال میں روز قیامت اٹھایا جائے گا لہذا میں اسی لئے تو دن ورات شراب ومعشوق کے ساتھ بسر کرتا ہوں۔ یہاں وہ حکمت کی شراب اور معشوق حقیقی کی بات کر رہا ہے یعنی خیام اپنی زندگی کا کوئی لمحہ حکمت وخدا سے خالی نہیں رکھنا چاہتا ہے اور اسی حالت میں روز قیامت محشور ہونا چاہتا ہے۔

گویند ھر آن کسان کہ با پرہیزند
زانسان کہ بمیرند چنان برخیزند
ما بامی ومعشوقہ از آنیم مُدام
باشد کہ بہ حشر مان چنان انگیزند (۱۴)

خیام کا خیال علم فلسفہ پر یہ ہے کہ انسان سب کچھ نہیں جانتا اور جتنا جانتا جائے گا اتنا ہی اسے معلوم ہوگا کہ وہ کتنی چیزیں نہیں جانتا لہذا اس بات کا علم ہونا کہ انسان کیا نہیں جانتا ایک علم ہے۔ المختصر اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خیام ایک بڑا فلسفی شاعر تھا۔ اسکی رباعیات کے ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ انگریزی میں فٹز جیرالڈ نے اسکی رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔

عمر خیام بہت طویل عمر پائی اور ۵۱۷ھ میں اس دنیا فانی سے رخصت ہو گئے (۱۵)۔ نظامی عروضی سمرقندی چہار مقالہ میں اسکے دفن ہونے کا ایک دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں کہ میں ۵۰۶ھ میں بلخ گیا تو معلوم ہوا کہ آجکل خیام امیر ابوسعید کے مکان پر مقیم ہے میں خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں خیام نے کہا کہ میری قبر ایسے مقام میں بنے گی کہ ہر سال دو دفعہ درخت اس پر پھول برسائیں گیں مجھکو تعجب ہوا ساتھ ہی خیال آیا کہ ایسا بڑا شخص لغو گو نہیں ہو سکتا، ۵۰۳ھ میں جب نیشاپور پہنچا تو حکیم موصوف کا چند برس پہلے انتقال ہو چکا تھا چونکہ مجھ پر شاگردی کا حق تھا ایک آدمی کو ساتھ لیا کہ قبر کا پتہ بتائے وہ ''قبرستان جرہ'' میں لے گیا دیکھا تو باغ کی دیوار کے نیچے قبر ہے سرھانے امرود اور زرد آلو کے درخت ہیں شکوفہ جھڑ کر اسقدر ڈھیر ہو گئے ہیں کہ قبر ڈھک گئی ہے مجھ کو حکیم موصوف کا قول یاد آ گیا اور بے اختیار آنسو نکل پڑے (۱۶)

منابع ومآخذ

۱۔ تاریخ ادبیات ایران وتاریخ شعرا، حسین فریور، تھران، ۱۳۴۱، صفحہ ۱۶۸
۲۔ شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (ھند)، جلد ۱، صفحہ ۲۲۵ تا ۲۲۶
۳۔ شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (ھند)، جلد ۱، صفحہ ۲۳۰
۴۔ شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (ھند)، جلد ۱، صفحہ ۲۲۶ تا ۲۲۷
۵۔ شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (ھند)، جلد ۱، صفحہ ۲۲۶، تاریخ ادبیات ایران، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی، ۲۰۰۵، صفحہ ۲۰۵
۶۔ ایضا
۷۔ شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (ھند)، جلد ۱، صفحہ ۲۲۸
۸۔ رباعیات حکیم عمر خیام، رضا بدر السما، تھران خیابان ولیعصر نرسیدہ بہ خیابان استاد مطھری شمارہ ۹۱۵، صفحہ ۴۷
۹۔ رباعیات حکیم عمر خیام، رضا بدر السما، تھران خیابان ولیعصر نرسیدہ بہ خیابان استاد مطھری شمارہ ۹۱۵، صفحہ ۵۶
۱۰۔ رباعیات حکیم عمر خیام، رضا بدر السما، تھران خیابان ولیعصر نرسیدہ بہ خیابان استاد مطھری شمارہ ۹۱۵، صفحہ ۱۱۱
۱۱۔ رباعیات حکیم عمر خیام، رضا بدر السما، تھران خیابان ولیعصر نرسیدہ بہ خیابان استاد مطھری شمارہ ۹۱۵، صفحہ ۱۱۰
۱۲۔ رباعیات حکیم عمر خیام، رضا بدر السما، تھران خیابان ولیعصر نرسیدہ بہ خیابان استاد مطھری شمارہ ۹۱۵، صفحہ
۱۳۔ رباعیات حکیم عمر خیام، رضا بدر السما، تھران خیابان ولیعصر نرسیدہ بہ خیابان استاد مطھری شمارہ ۹۱۵، صفحہ
۱۴۔ رباعیات حکیم عمر خیام، رضا بدر السما، تھران خیابان ولیعصر نرسیدہ بہ خیابان استاد مطھری شمارہ ۹۱۵، صفحہ ۷۹
۱۵۔ تاریخ ادبیات ایران، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی، ۲۰۰۵، صفحہ ۱۶۸
۱۶۔ شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (ھند)، جلد ۱، صفحہ ۲۲۷

ڈاکٹر قیصر احمد، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باولی حیدرآباد، ۵۰۰۰۳۲

آل زہرا زیدی، ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باولی، حیدرآباد، ۵۰۰۰۳۲

سبق اردو نومبر 2025
20

سرخ سویرا کا شاعر مخدوم

ڈاکٹر عزیز رضا
ایسوسیٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، جے این پی جی کالج،
بارہ بنکی
موبائل: ۹۴۱۵۴۴۷۲۸۵

مخدوم محی الدین کا پہلا شعری مجموعہ ''سرخ سویرا'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ مخدوم کی بیاض سے کچھ کلامنسوخ کئے ہوئے بھی ملتے ہیں جن کی تفصیلات شاذ تمکنت نے مخدوم حیات و کارنامے میں پیش کئے ہیں۔ اس میں ایک دو نظموں کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ پہلا دوشالہ سے قبل کہی گئی تھیں مگر مخدوم نے انہیں اشاعت کے قابل نہیں سمجھا اور انہیں سرخ سویرا الگ رکھا۔ (مخدوم کی شاعری کا آغاز پہلا دوشالہ سے ہوتا ہے یہ ایک ایسی نظم ہے جو تفریح کے لئے لکھی گئی تھی اس تفریح میں ان کی عمر، بذلہ سنجی اور کالج کے ماحول، اس سب کا عمل دخل تھا)۔ بہرحال مخدوم کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۳ء کے آس پاس ہوتا ہے اور ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اب اس طرح اس مجموعہ میں ان کی دس سالہ شاعری کے منتخب کلام ملتے ہیں۔ اس کا نام ''سرخ سویرا'' اس لئے رکھا تھا کہ ان کے فکری رجحان کا یہ مجموعہ کلام ترجمان بن جائے۔ اس میں دو طرح کے شعری مزاج ملتے ہیں ایک تو رومان پرور اور دوسرا انقلابی ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔ اردو میں ایک عام روایت یہ بھی ہے کہ ہر شاعر خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کرتا ہے لیکن مخدوم بالکل اس کے برعکس نظر آتے ہیں اگر وہ اپنے دوسرے شعری مجموعہ گل تر اور اس کے بعد کے شعری مجموعہ بساط رقص میں غزلیں نہیں کہتے تو میرے خیال سے واحد ایسے شاعر ہوتے جس نے غزل گوئی کی طرف رخ ہی نہ کیا۔ کل ۲۲ / ۲۳ غزلیں کہہ کر انہوں نے اپنی غزل گوئی کا بھی ثبوت فراہم کر دیا۔ ابھی ان کی غزلوں پر کوئی گفتگو نہیں، ابھی ''سرخ سویرا'' کی نظموں کے متعلق گفتگو مقصود ہے۔ ''سرخ سویرا'' کی نظمیں انقلاب اور رومان کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ رومان ہر انسان کے عمر کا ایک حصہ ہے جس کے بغیر بات ادھوری ہے اور خاص کر شاعری، موسیقی اور مصوری کے لئے تو حد اہم ہے۔ مخدوم کے اس رومان دور کا اردو کے اہم ناقد سید احتشام حسین نے یوں جائزہ لیا ہے:

''شاعری ذات اور کائنات کی دریافت کا عمل ہے اور دونوں صورتوں میں انتخاب کی باگ ڈور شاعری کے ہوتھ میں رہتی ہے اس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر مکمل طور سے ماحول کا مجبور ترجمان نہیں۔ ذات کی حد تک یقیناً نیم شعوری عمل کی کارفرمائی بھی جاری رہتی ہے لیکن اپنی ذات کی دنیا سے اپنا رشتہ قائم کرتے وقت شاعر کچھ نہ کچھ شعور سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کی آزادی یہی ہے کہ وہ سماج کے تصادم اور پیچیدہ عناصر میں سے کسی کے ساتھ اپنی ذات کا رشتہ قائم کرے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ مشکل یہ پیش آتی ہے کہ وہ اس کا اظہار اپنے فن میں کس طرح کرے۔ ہر فنکار کی طرح ابتدا میں مخدوم کو بھی اپنے عاشقانہ یا جذباتی اور ذہنی تجربات پیش آنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان ذوق اور عملی سرمایہ، جوانی کا محدود مشاہدہ اور شوق اظہار، اس شاعری کے لئے کافی تھا جس کے نمونے طور، ساگر کنارے، تلنگن، لمحہ رخصت، جوانی، سجدہ اور یاد ہے وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔ ایسی نظمیں تقریباً ہر نوجوان شاعر کر لیتا ہے کیونکہ یہ تجربے عام ہیں لیکن اسی دور میں (جو غالباً ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۹ء تک کا ہوگا) ان کی بعض ایک ایسی گونج بھی پیدا کرتی ہیں جن میں تھوڑی بہت انفرادیت ہے جیسے پچھلے پہر کے چاند سے، انتظار، برسات اور میں اس زمانے میں مخدوم نے ٹیگور اور ورڈس ورتھ کو بھی پڑھا تھا ممکن ہے ان کے ذہن نے ان شعراء کے اثرات بھی قبول کئے ہوں''۔ (کلیات مخدوص ۸۴ مرتب فاروق ارگلی)

احتشام صاحب نے مخدوم کی جن رومانی نظموں کے بارے میں کہا ہے کہ ایسی شاعری ہر نوجوان شاعر کر لیتا ہے کیونکہ اس میں عام تجربے بیان بھی ہوئے ہیں پھر بھی ان نظموں کے لب و لہجے اور ان نظموں کی معصومیت بھری ادائیں جن میں محبت کے لطیف جذبے پائے جاتے ہیں اور ان میں ایک خاص آہنگ بھی ملتا ہے کسی نہ کسی طور پر مخدوم کی انفرادیت کا ان میں احساس ہوتا ہے۔ پیش ان نظموں کے بند اور اشعار جن میں ایک خاص کشش ہے اور مخدوم کے لب و لہجے کی انفرادی شان پائی جاتی ہے:

(طور)

دلوں میں اژدہام آرزو لب بندر ہتے تھے
نظر سے گفتگو کرتے تھے دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی
بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دوآتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

(ساگر کے کنارے)

تاریکیِ شب اوڑھ کے رخصت ہوا عصیاں
تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے
کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کے نہانے
چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے
پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے
تالاب پہ افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

(سجدہ)

سبق اردو نومبر 2025
21

شب تاریک ہے خموشی ہے
کل جہاں محو عیش کوشی ہے
لطیف سجدوں میں آ رہا ہے مجھے
چھپ کے کوئی ملا رہا ہے مجھے
چوڑیاں بج رہی ہیں ہاتھوں کی
آئی آواز، اس باتوں کی
نئی دلہن کی تھرتھری بن کر
اس کے ہونٹوں کی کپکپی بن کر
میرے دل میں سما گیا کوئی
میری ہستی پہ چھا گیا کوئی

(لمحۂ رخصت)
کچھ سینے کی خواہش کانوں کو، کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی ہے تاب تمنا ہاتھوں میں
شانے پہ پریشاں ہونے کو بے چین سیہ کاکل کی گھٹا
پیشانی میں طوفاں سجدوں کا، لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں
وارفتہ نگاہوں سے پیدا ہے ایک ادائے زلیخائی
انداز تغافل تیور سے رسوائی کا ساماں آنکھوں میں

(جوانی)
پیدا ہوئیں مہر جوانی کی شعائیں
پڑنے لگیں عالم کی اسی سمت نگاہیں
خوابیدہ تھے جذبات بدلنے لگے گروٹ
روئے شرر طور سے ہٹنے لگا گھونگھٹ
بھرنے لگے بازو تو بند قبا تنگ
چڑھنے لگا مچھلی پی جوانی کا نیا رنگ
اعضا میں چمک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں
اعصاب میں پارہ ہے تو بجلی ہے نظر میں

(یاد ہے)
جب کہ سازے زندگی نغمات سے بھرپور ہے
ذرہ ذرہ میرے دل کی خاک کا جب طور ہے
میں اکیلا ہی نہیں سارا جہاں مسرور تھا
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

ہر ادائے حسن پر ہوتا تھا جب دل بے قرار
جب رہا کرتا ملاقاتوں کا باہم انتظار
جب طبیعت تجھ سے ملنا چاہتی تھی بار بار
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

رات بھی سونے نہ دیتی تھی مسرت عید کی
جب کہ رہتی تھی دلوں میں بے قراری دید کی
ماہتاب عید بن جاتی کرن خورشید کی
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

یہ نظمیں مخدوم کے ابتدائی دور کی نظمیں ہیں۔ ان میں ایک خاص رومانی جذبہ کارفرما ہے۔ یوں تو اردو غزل کے اندر ابتدا ہی سے محبت کی باتیں بڑے لطیف پیرائے میں ملتی ہیں لیکن نظموں میں جوشؔ اور اختر شیرانی اس اسلوب کے خاص شہسوار نظر آتے ہیں جن کے اثرات اردو کی رومانی شاعری پر گہرے دکھائی دیتے ہیں۔ مخدوم نے اپنے اندر کے جن کلام کو منسوخ کیا ان میں ان دونوں شعراء کے واضح نقوش موجود ہیں۔ شاذ تمکنت نے اس کی وضاحت بھی کی ہے لیکن ''سرخ سویرا'' کی یہ نظمیں جوانی کی عام باتیں ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادی کشش رکھتی ہیں۔ مثلاً طور میں پیار کرنے پر خدا کا مسکرانا، ملک کا جھولا جھلانا اور حوروں کا غزل خواں ہونا۔ ساگر کے کنارے میں یہ شعر

پانی میں لگی آگ، پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے

روایتی ہوتے ہوئے بھی اچھوتے پن کا احساس کراتا ہے۔ منظر کشی بھی بہت لاجواب ہے۔ نظم ''تلنگن'' کے بھی مناظر بڑے فطری اور انوکھے ہیں۔ ''سجدہ'' میں باتیں عامیانہ ہیں لیکن اسلوب دلکش اور پرکشش ہے۔ ''لمحۂ رخصت'' میں غزل کا سوز و گداز ہے۔ نظم جوانی میں جوانی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کی خاص بات یہ ہے کہ جنسی تلذذ کا (جنسی تلذذ) احساس تک نہیں ہوتا۔ ''یاد ہے'' میں سرشاری اور سرمستی کے ڈکشن (Diction) اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

میں مانتا ہوں کہ ان نظموں کی فضا بندی اور محبت کے لطیف جذبے اس دور یا ہر نوجوان شاعر خواہ وہ کسی دور کا ہو، بیان کر سکتا ہے۔ احتشام حسین کی بات سر آنکھوں پر لیکن مخدوم نے انہیں جس طرح برتا ہے اور جو اسلوب اور آہنگ اختیار کیا ہے اس میں ان کی اپنی شناخت بھی ملتی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس طرح ان کے رومانی دور کا آغاز ہوتا ہے اور پھر جب فکر و فن میں بالیدگی آتی ہے تو چاند تاروں کا بن، چارہ گر، رقص، خواہش، جز تیری آنکھوں کے وغیرہ میں ان کے بہترین رومانی نقوش اشتراکی نظریے کے ساتھ ملتے ہیں۔

حوالہ جات:

۔کلیات مخدوم محی الدین، مرتب فاروق ارگلی، فرید بک ڈپو، نئی دہلی
۔مخدوم حیات و کارنامے، شاذ تمکنت

سبق اردو نومبر 2025
22

اردو داستان گوئی کے اہم مراکز دہلی ،لکھنؤ اور رام پور

ڈاکٹر ثنا اللہ
استاد اردو
ایم ایل کے پی جی کالج ،بلرام پور
sanaullah1188@gmail.com

داستان ایک بیانیہ صنف ہےاوراس کی کامیابی کاراز اس کی سحرالبیانی میں مضمر ہے، داستان گواپنی داستان میں افسانوی کشش کو برقرار رکھنے کے لیےاپنی قوت متخیلہ کے سہارے اپنی سحرالبیانی سے ایسی فضااور ماحول تیار کرتا ہے کہ سامعین اس کے شش وپنج میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ داستان وہ افسانوی ادب ہےجس میں قصہ زبانی بیان کیا جاتا ہے جومزہ داستان گو کے سحرالبیانی میں ہے وہ مزہ تحریری داستان میں نہیں کیونکہ داستان گو جب قصہ بیان کرتا ہےتو وہ ماحول کے حساب سے جدھر چاہتا ہےقصہ کا رخ ادھرموڑ دیتا ہےلیکن جب وہی قصہ تحریری شکل اختیار کر لیتا ہےتو گویا وہ محدود ہوجاتا ہے اور قصہ خواں وہی عبارت دہرانے پر مجبور ہو جاتا ہے جو الفاظ لکھے ہوئے ہیں داستان گوکاانداز بیان اورطرز تکلم جس پائے کا ہوگا،اس کی داستان بھی اسی قدر اعلی اور پائیدار ہوگی۔تحسین نےنوطرزمرصع ایک انگریزکواردو زبان سکھانےکی غرض سے لکھی،فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد بھی تعلیمِ زبان تھااورفورٹ ولیم کالج کی سب سےمشہورکتاب باغ وبہار اپنےدلکش اندازبیان کےسبب ہی دوصدیاں گزرجانے کے بعدآج بھی ہردل عزیز ہےاورسرورنےبھی اپنی زبان دانی کا ثبوت دینے کی غرض سے فسانۂ عجائب لکھی۔ داستان تحریر بھی ہوتی ہےتواس کا انداز اسلوب بیانیہ ہوتا ہے۔

داستان کے آغاز کا سلسلہ انسانی تہذیب سے جڑا ہوا ہے کیونکہ جب انسان نے غوں غاں کرنا سیکھا تو سب سے پہلے قصےکوجنم دیا قدیم دور میں انسان غاروں اور جنگلوں میں رہتا تھا، درختوں کے پھل اور پتے کھاتا تھا،موسم کی تبدیلیوں :سردی گرمی اور برسات ،بجلی کی چمک اورآفات سے ڈرجاتا تھا، وہ روزمرہ کی زندگی میں جن حالات سے دوچار ہوتا تو وہ اپنے مافی ضمیر کوایک دوسرے سے بیان کرتا، اوراس بیان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہوگا،لہذا مبالغہ آرائی کے سبب ہی داستان کا آغاز ہوا ہوگا، یہ سچ ہے کہ قصہ کا تصور ہی داستان کا بنیاد رہا ہے۔

ڈاکٹر گیان چندجین لکھتے ہیں کہ

" حکمائے یونان کے بقول قصہ گوئی شاعری اورموسیقی کی دیویوں سے بھی قدیم تر ہے۔ ابتدائی نقوش موجود نہیں ہیں۔کون جانے ہماری بعض لوک کہانیاں دس ،پانچ ہزار سال پیشتر وجود میں آ چکی ہوں۔فی الحال ہماری دسترس انہی افسانوں تک ہے جوضبط تحریر میں لائے جا چکے ہیں" ا۔

عرب میں داستان گوئی ایک باضابطہ فن تھاایام جاہلیت میں یہ فن اپنے عروج پر تھا،لوگ اکثر چاندنی راتوں میں ریت پر بیٹھ کرسامر سے داستان سنتے تھے اور بدلے میں اسے کھجوریں دیتے تھے، اسلامی عہد میں خلفاء عباسیہ کے زمانے میں اس فن نے اور زیادہ ترقی کر لی شیراز کے قریب اوردکان میں داستان گوشام کوقہوخانے میں جمع ہوکر روزانہ حسب معمول قصہ سناتے تھے،اورعوامی دلچسپی کے باعث قصے کاتجسس برقرار رکھنے کے لیے ان قصوں کے درمیان ہنرمندی سے گیتوں کو جوڑ دیتے یہ طریقہ کافی زیادہ مقبول ہوااور آہستہ آہستہ ایران کے دیگرشہروں کےساتھ ازبیک وغیرہ تک پہنچ گیا۔

ڈاکٹر اسکاٹ تاریخ حلب سے داستان گوئی کی ایک مجمع کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں کہ

" قہوخانے میں ایک مجمع کثیر کے درمیان داستان گوقصہ سناتا ہےاس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا ڈنڈا۔ڈگڈگی اور بانسری ہوتی ہے۔شروع میں وہ حمد الہی کرتا ہے پھر کمرے میں چل کر داستان سرائی کرتا ہے۔ساتھ ہی لب ولہجہ کے اتار چڑھاؤاورحرکات وسکنات سے بتاتا بھی جاتا ہے بیچ بیچ میں ڈگڈگی اور بانسری بجاتا ہےکسی شش وپنج کے مقام پر داستان روک کروہ پیسے مانگتا ہے۔آخر میں کہانی کومنتہا پر پہنچا کر وہ خاموشی سے بھیڑ میں سے نکل جاتا ہے اور اگلے دن پھر نمودار ہوتا ہے۔دنیا کے ایک قہوخانے میں قتل کی واردات ہونے پر وہاں داستانیں بند کردی گئیں اس کے بعد بازار میں کسی کشادہ مقام پر قصہ گوئی ہونے لگی۔" ۲۔

ایران میں داستان گوئی کی روایت اپنے عروج پر تھی ایران میں باکمال داستان گویوں کی رسائی دربار میں تھی ،جنہیں شاہی داستان گوکا منصب مل جاتا انہیں" نقال باشی" کہا جاتا تھا۔ یہ داستان گواپنے کواور معزز بنانے کی غرض سے شاہ نامہ فردوسی کے واقعات کا بھی موقع برمحل استعمال کرتے تھے۔ اہل ایران کو قصہ گوئی سے کافی دلچسپی تھی۔قہو خانے، چائے کی دکان داستان گویوں کے اڈے بن گئے تھے۔اور گرمی کے موسم میں یہ لوگ کھلے میدانوں میں قصہ سنتے اور سناتے تھے۔قہوخانے کے مالک ان داستان گویوں کواس لیے بھی بلاتے تھے کہ ان داستان گویوں کے سبب لوگ کثیر تعداد میں قہو خانے آئیں گےان کا کاروبار بھی خوب چلے گا۔ایسے داستان گوقصہ کو نقطۂ عروج پر پہنچا کر معاوضہ اصول کرتے اوراس کے بعد قصے کوآگے بڑھاتے اور پھر اگلے روز کے لیے کسی کوملتوی کر کےنکل جاتے ایسے قصے زیادہ تر جھاڑوں کے موسم میں سنائے جاتے تھے،شادی بیاہ اور سالگرہ کی تقریب کے موقع پر انہیں بلاتے ایسے داستان گویوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی جوگانے کےفن میں بھی ماہر ہوں ان داستان گویوں میں ایک طبقہ ایران کے یہودیوں کا بھی تھالیکن مسلم داستان گویوں کے آگے انہیں لوگ خاطر میں نہ لاتے۔داستان گوئی کافن خانہ بدوشوں کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا ان کےعلاوہ درویشوں نےبھی اس کام کوخوب انجام دیا۔

محمد حسین آزاد ایران کی داستان گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"ایران کے بازاروں میں اکثر قہو خانوں میں ایک شخص نظر آئے گا کہ سروقد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اورلوگوں کا انبوہ اپنے ذوق وشوق میں مست اسے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ ہر مطلب کونہایت فصاحت کے ساتھ نظم ونثر سے مرصع کرتا ہے اورصورت ماجرہ کواس تاشیر سے ادا کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے۔کبھی ہتھیار بھی لگائے ہوتا ہے جنگ کے معرکہ یا غصے کے موقع پر شیر کی طرح بپھر جاتا ہے۔خوشی کی جگہ اس طرح گاتا

INTERNATIONAL PEER REVIEWED (REFEREED) JOURNAL
ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

سبق اردو نومبر 2025
23

ہے کہ سننے والے وجد کرتے ہیں غرض کہ غیظ وغضب عیش وطرب غم وعلم کی تصویر اپنے کلام ہی سے نہیں کھینچتا بلکہ خود اس کی تصویر بن جاتا ہے۔"۳؎

ہندوستان میں قصہ گوئی کی روایت بہت قدیم ہے قدیم دور میں بادشاہوں کے دربار میں باقاعدہ داستان کو مقرر ہوا کرتے تھے، جو قصہ کہہ کر وقت گزاری کا کام کیا کرتے تھے، اکثر شہرو دیہات میں سرد موسم میں لوگ الاؤ کے اردگرد جمع ہو کر وقت گزاری کے لیے قصہ کہتے اور سنتے تھے آہستہ آہستہ انہیں قصوں نے تحریری شکل اختیار کر لیا۔ یونان، عرب، ایران اور ہندوستان میں ہزاروں سال قبل قصے کا آغاز ہو چکا تھا سنسکرت زبان میں مذہبی نوعیت کے حامل مہابھارت، رامائن، ہتوپدیش اور پنچ تنتر جیسی کہانیاں ہر خاص وعام میں مقبول تھیں۔ اردو کی بیشتر داستانوں کا ماخذ سنسکرت، عربی اور فارسی کی داستانیں ہیں اردو داستان کی فضا فارسی داستانوں سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ اردو داستان نگاروں نے فارسی داستانوں سے استفادہ کیا ایران سے زیادہ فارسی کی داستان ہندوستان میں لکھی گئیں اور بعد میں ترجمہ کے ذریعے اردو میں منتقل ہوئیں تیرہویں صدی کی فارسی داستان قصہ چار درویش از امیر خسرو کا پہلا اردو ترجمہ تحسینؔ نے نوطرز مرصع کے نام سے ۱۷۷۵ء میں کیا اس کے بعد قصہ چہار درویش کا ترجمہ میر امن نے باغ و بہار کے نام سے ۱۸۰۲ء سادہ اور آسان عام فہم زبان میں کیا۔ اردو غزل کی طرح اردو داستان گوئی کی روایت بھی امیر خسرو سے منسوب ہے روایت ہے کہ ایک بار نظام الدین اولیاء بیمار ہوئے تو ان کا دل بہلانے کی غرض سے امیر خسرو نے نظام الدین اولیاء کو قصہ چہار درویش سنایا جب وہ بیماری سے صحت یاب ہوئے تو انہوں نے دعا دی کہ جو کوئی اس داستان کو سنے گا وہ بیماری سے شفا پائے گا۔

میر امن باغ و بہار کی سبب تالیف میں لکھتے ہیں کہ

"قصہ چہار درویش کا، ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیاء، زری زربخش، (جو ان کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلی میں، قلعے سے تین کوس لال دروازے کے باہر، مٹیا دروازے سے آگے، لال بنگلے کے پاس ہے) ان کی طبیعت ماند ہوئی۔ تب مرشد کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور تیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب یہ قصہ فارسی میں مروض ہوا۔"۴؎

سولہویں صدی میں داستان گوئی کا رواج عام ہو چکا تھا مغلیہ دور میں داستان گوئی ہر خاص وعام میں مقبول تھی اکثر سرد موسم میں لوگ الاؤ کے اردگرد جمع ہو کر قصہ کہتے اور سنتے تھے آہستہ آہستہ دہلی میں مشاعرے کی طرز پر داستان گوئی کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ داستان گوئی کا آغاز دہلی میں ہوا لیکن اسے فروغ لکھنؤ میں ہوا اور رام پور میں اس کا زوال ہوا۔

داستان گوئی کا مرکز دہلی: اردو میں داستان گوئی کا آغاز دلی میں ہوا یہاں مشاعروں کی طرز پر داستان گوئی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں مغلیہ دور میں مغل بادشاہوں اور امرا کی سرپرستی میں داستان گوئی کو کافی فروغ ہوا۔ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں میر باقر علی داستان گو کے نانا امیر علی قصہ گو کی حیثیت سے ملازم تھے جو قلعۂ معلیٰ میں قصہ سنایا کرتے تھے مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر خود صاحب فن ایک عظیم شاعر تھے اور صاحب فن پرست بھی، شعرا کے ساتھ ساتھ انہوں نے داستان گویوں کی بھی سرپرستی کی میر باقر علی کے ماموں میر کاظم علی نے اس فن میں خوب ترقی کی، کہ وہ لکھنؤ اور حیدرآباد کے داستان گویوں سے بھی آگے بڑھ کر قصہ خوانی کی بجائے داستان گوئی کرنے لگے۔ دہلی میں داستان گوئی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ "بوستان خیال" کی سبب تالیف داستان گوئی کی محفل ہی رہی ہے۔

بوستان خیال کے مصنف محمد تقی خیالؔ گجراتی کا دہلی میں جہاں پر قیام تھا وہیں پاس میں ایک قہوخانہ تھا، جہاں حسب معمول داستان گوئی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ خیال بھی وہاں عالم خیال میں کبھی کبھی جایا کرتے تھے، ایک دن داستان گو جب قصہ سنا رہا تھا تو کسی نے ٹوک دیا کہ یہ قصہ اس نے کہیں اور سنا ہے، اس پر داستان گو نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ

"صاحب! انسان حسب قدر اپنے علم وفضل میں دستگاہ حاصل کر سکتا ہے لیکن فن قصہ گوئی ایسا دقیق اور مشکل فن ہے کہ بغیر مناسبت طبیعت ہرگز حاصل نہیں ہوتا"۵؎

اہل مجلس نے بھی اس بات کی تائید کی، خیالؔ کو یہ بات بڑی ناگوار گزری اور وہاں سے اٹھ کر اپنے مکان پر واپس چلے آئے اور دوسرے دن ایک داستان کے کچھ اجزا لکھ کر لائے اور مجلس کو سنایا لوگوں نے ان کی داستان کو بہت پسند کیا لہذا یہیں سے بوستان خیال کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد خیالؔ مغل بادشاہ محمد شاہ کے یہاں داستان گو مقرر ہوئے۔ بوستان خیال کا سب سے اہم اردو ترجمہ غالبؔ کے بھتیجے خواجہ امانؔ دہلوی نے کیا جو نو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا دیباچہ غالبؔ نے لکھا ہے۔ دہلی میں داستان گوئی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے مشہور و معروف شاعر مرزا غالب کو بھی داستان گوئی سے دلچسپی تھی۔

مرزا غالبؔ نے حدائق الانظار کے دیباچے میں لکھا ہے کہ

"داستان طرازی مجملہ فنون سخن ہے، سچ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے"۶؎

دہلی کے شاہی دربار میں داستان گوئی کا رواج عام تھا اور قلعۂ معلیٰ کے باہر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، چاندنی چوک اور قہوخانوں میں داستان گوئی کی محفلوں کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ شام ہوتے ہی داستان کے شائقین کا ہجوم لگ جاتا تھا۔ عام طور سے دلی میں جمعرات کی شام داستان گوئی کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں جو صبح فجر کی اذان تک جاری وساری رہتی تھیں۔

مرزا غالبؔ کے گھر پر داستان گوئی کی محفل کا ایک نقشہ پیش ہے کہ

"جمعرات کا دن ہے شام کے چھ بجے ہیں غالبؔ کی بلی ماراں والے گھر میں بچوں اور بوڑھوں کی ایک محفل جمی ہے۔ داستان پڑھی جا رہی ہے سب بڑے شوق سے سن رہے ہیں۔ غالب میر محفل ہیں۔ داستان سنتے ہیں اور جہاں کہیں داستان گو مطالب اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا داستان کا سلسلہ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور مکمل کرتے ہیں اور خوش ہو ہو کر کہتے ہیں کہ دہلی کی زبان انہیں داستان کہنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔"۷؎

غالبؔ نے ایک خط میر مہدی مجروح کے نام لکھا ہے کہ

"مرزا غالب علیہ الرحمہ ان دنوں بہت خوش ہیں پچاس ساٹھ جزو کتاب امیر حمزہ کی داستان اور اس قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آ گئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک میں موجود ہیں دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات کو شراب پیا کرتے ہیں"۸؎

سبق اردو نومبر 2025
24

انیسویں صدی میں داستان گوئی کا فن اپنے عروج پر تھا۔اس دور میں داستان نہ صرف باضابطہ پیش کی جاتی تھیں بلکہ داستان گوئی کی باقاعدہ تربیت بھی دی جاتی تھی،فن داستان گوئی میں استادی اور ساگردی کا رواج عام ہو چکا تھا گویا داستان گوئی کی جانب داستان گویوں کا ایک قافلہ چل پڑا۔ اس سلسلے میں محمد حسین جاہ،میر احمد علی،انبا پرشاد رسا،محمد امیر خان،شیخ تصدق حسین،احمد حسین قمر،سید اسماعیل اثر اور اخری داستان گو میر باقر علی ۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۸ء اہم ہیں۔

دہلی کے سب سے اہم داستان گو میر باقر علی نے داستان گوئی کے فن کو جو جہت عطا کی وہ دیگر داستان گویوں کے حصے میں نہ آئی کیونکہ ان کے نانا امیر علی دلی کے اہم داستان گو تھے اور ان کے ماموں میر کاظم علی نظام حیدرآباد کے یہاں داستان گو مقرر تھے انہوں نے داستان گوئی کا فن اپنے ماموں میر کاظم علی سے سیکھا تھا میر باقر علی داستان گو کا زمانہ وہی ہے جو پارسی تھیٹر کے عروج کا زمانہ تھا گویا داستان گوئی اور ڈرامہ تھیٹر کی روایت ایک ساتھ چلتی ہے جہاں ایک طرف پارسی تھیٹر کے اداکار جدید ڈرامائی تکنیک سے آراستہ و پیراستہ نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف میر باقر علی داستان گوئی کے فن میں کمال دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی داستان گوئی کے دوران اداکاری کا دلکش نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے جب وہ داستان گوئی کے دوران اداکاری کرتے تو اپنے جسم کی حرکات و سکنات اور چہرے کے تاثرات سے راجہ اور رنک کا فرق صاف طور سے واضح کر دیتے آخری داستان گو میر باقر علی کی وفات ۱۹۲۸ء کے ساتھ ہی اس بیانیہ صنف داستان گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔

اس فن کے آخری باکمال داستان گو میر باقر علی کی داستان گوئی کا ایک مثالی نقشہ پیش ہے کہ

"امیر حمزہ کی کسی داستان کا کوئی مختصر واقعہ تین گھنٹے سے کم میں نہیں سناتے تھے رزم کا نقشہ کھینچتے تو معلوم ہوتا کہ داستان کا میدان،میدان جنگ بن گیا ہے بڑے زور کا رن پڑ رہا ہے اور میر صاحب خود تلوار،قرولی،گپتی،خنجر،دشنہ اور سینکڑوں ہتھیار چلا رہے ہیں بیان میں ایک زور آجاتا اور میر صاحب پہلو اور پینترے بدل بدل کر اصل کی نقل اتارتے اور بزم کو رزم کا نقشہ دکھا دیتے۔ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو سینکڑوں نام لے جاتے یہی حال زیوروں اور جواہرات بلکہ ہر بات کا تھا۔غرض معلومات کی ایک انسائیکلو پیڈیا تھے۔عیاروں کا بیان کرتے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے میر صاحب عیار کی تصویر بن جاتے اور پر لطف واقعات بیان کرنے میں ایسا لہجہ اختیار کرتے کی سامعین مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن جاتے داستان شروع کرنے سے پہلے چاندی کی ایک کٹوری میں افیون کی ایک گولی روئی میں لپیٹ کر گھولتے تھے اور بڑی نفاست سے اپنا نشہ پانی کرتے تھے۔" غرض جو نقشہ کھینچا بے مثل۔جو نقشہ پیش کیا بے نظیر جنگ کا ذکر چھیڑا تو پھر سپہ گری کا کون سا گوشہ تھا،حفظ مراتب،وزرا اور امرہ کی آمد،شاہی دبدبہ۔درباری آداب،چوب داروں کی پکار لفظوں سے ایسا سماں باندھا کہ تمام کیفیت آنکھوں کے سامنے پھر گئی پھر جو شاہی مطبخ کی طرف رخ کیا تو ستر قسم کے پلاؤ گنڈالے دسترخوان کا سلیقہ،بسم اللہ خوان کی آواز،غرض کہ جو تصویر کھینچی جزئیات سے پر اور فنکاری کا بہترین نمونہ تھی۔"۹؎

داستان گوئی کا اہم مرکز لکھنؤ: عہد شجاع الدولہ اور آصف الدولہ میں لکھنؤ میں داستان گوئی کا آغاز تحسین کی نوطرز مرصع ۱۷۷۵ء میں ہوا اور عہد سعادت علی میں مہر کی نوآئین ہندی اور انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی منظر عام پر آئی اور اس کے بعد غازی الدین حیدر اور آخری تاجدار واجد علی شاہ کے عہد میں مہجور لکھنوی کی داستان گلشن نوبہار اور انشائے نورتن ہے،اس کے بعد لکھنؤ کے سب سے اہم داستان گو سرور اور ان کی شاہکار تصنیف فسانۂ عجائب اپنے زمانے کی مقبول و معروف داستان ہے

لکھنؤ میں داستان گوئی کو نوابین اودھ کی سرپرستی میں فروغ ہوا نوابین اودھ، بالخصوص بیگمات اودھ اور امرا کے دربار میں باقاعدہ داستان کو مقرر ہوتے تھے داستان گوئی کا شوق صرف نوابین اودھ اور امرا میں ہی نہیں تھا بلکہ لکھنؤ کے عوام مرد،عورت بوڑھے،نوجوان اور بچوں کا بھی شوق تھا افیونیوں نے اس فن کو خوب فروغ دیا انیسویں صدی داستان کے عروج کی صدی رہی اس دور میں داستان گوئی کا رواج عام تھا کیونکہ داستان گوئی تفریحی مشاغل کا سب سے اہم ذریعہ تھا اور لکھنؤ میں داستان گوئی کو پروان چڑھانے میں مہاجرین قصہ گو پیش پیش رہے۔ دہلی میں جب خزاں کا دور آیا تو شعرا کے ساتھ دہلی کے داستان گویوں نے بھی لکھنؤ کا رخ کیا اور یہاں آکر داستانوی محفل کی رونق بنے۔لکھنؤ کے شاہی دربار،بیگمات کے محل میں اور ہر چھوٹے بڑے امرا کے یہاں داستان گو ملازم ہوتے تھے۔ نوابین اودھ، بیگمات اور امرا رات کو جب کھانے کے بعد بستر راحت پر جاتے تو داستان گو انہیں حسب معمول قصہ سنا کر انہیں نیند کی آغوش میں پہنچاتے تھے اور عوام کا بھی یہ دستور تھا کہ قہوہ خانوں،چائے کی دکانوں افیون کے اڈوں اور چوک چوراہوں پر جمع ہو جاتے تھے۔اور انہیں میں سے کوئی ایک داستان چھیڑ دیتا تھا لکھنؤ میں داستان گوئی کا ایک واقعہ عام ہے کہ لکھنؤ میں کسی نواب کے یہاں ایک داستان گو ملازم تھا جو حسب معمول نواب کو داستان سنایا کرتا تھا ایک بار وہ داستان سنا رہا تھا کہ داستان میں شہزادے کی بارات محل سے نکلنے والی تھی اسے کسی خاص مقصد کے تحت پندرہ روز کے لیے باہر جانا ہوا،اس نے نواب کے پاس اپنے شاگرد کو داستان گوئی کے لیے مقرر کر دیا،اور شاگرد سے کہا کہ شہزادے کی بارات محل سے نکلنے والی ہے آگے داستان سنبھال لینا۔ داستان گو پندرہ دنوں کے بعد واپس آیا اور شاگرد سے پوچھا کہ داستان کہاں پہنچی،تو اس نے جواب دیا کہ حضور میں نے بارات کو وہیں روک کے رکھا ہے۔ یعنی اس نے اپنی سحر البیانی کا ایسا ثبوت دیا کہ مزید پندرہ دنوں تک محل کی سجاوٹ،شادی کے تمام رسوم،بارات کی روانگی کا منظر اور دولہے کی پوشاک وجری وغیرہ کے بیان میں گزار دیے۔

ڈاکٹر کلیم الدین احمد لکھنؤ میں داستان گوئی کی مقبولیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچہ اور کہیں کم ہوگا بیس پچیس یاران صادق اور داستان موافق شب کے وقت کی پردہ دار عاشقاں ہے۔ایک مقام پر جمع ہوئے کوئی گنہ چھیل رہا ہے کوئی پونڈے پر چاقو تیز کر رہا ہے۔ جا بجا پیالیوں میں افیون گھل رہی ہے۔حقیقت تو یوں ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنے کا چھیلنا بھی لکھنو والوں ہی کا حصہ ہے۔کہیں چائے تیار ہو رہی ہے اور داستان گو صاحب لحن داؤدی فرما رہے ہیں۔"۱۰؎

لکھنؤ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ کے زمانے میں داستان گوئی اپنے عروج پر تھی۔ کیونکہ یہ زمانہ داستان امیر حمزہ،بوستان خیال،الف لیلہ و لیلہ اور ہزار داستان کا ہے لکھنؤ میں داستان امیر حمزہ کے چھیالیس جلدوں کا ترجمہ ہوا جسے شیخ تصدق حسین،احمد حسین قمر،محمد حسین جاہ اور اسمعیل اثر وغیرہ نے کیا،بوستان خیال کا لکھنوی ترجمہ محمد حسن

سبق اردو نومبر 2025
25

عسکری نے کیا، سرشار نے الف لیلہ ولیلہ کا ترجمہ کیا، اور ہزار داستان تو تا رام سایاں اور نظر ثانی حامد علی نے کی، لکھنؤ میں داستان نویسی کا اہم مرکز نول کشور پریس تھا آخری دور ۱۸۵۰ء سے ۱۸۸۱ء تک نول کشور نے لکھنؤ کے داستان گویوں سے ہی داستان قلمبند کروایا۔ نول کشور کی سربراہی میں محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر اور تصدق حسین نے پچیس برس کی مدت میں امیر حمزہ کی چھیالیس جلدیں قلمبند کر کے داستان کو فروغ دیا۔

گزشتہ لکھنؤ کے مصنف عبدالحلیم شرر داستان گوئی کی خاصیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ

"زبان اردو کو جو ترقیاں لکھنؤ میں حاصل ہوئیں وہ شاعروں، ادیبوں، شاروں اور مصنفوں ہی تک محدود نہیں ہیں، مختلف سوسائٹیوں اور طبقوں میں ترقی و وسعت زبان کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے ہر گروہ والوں کے لیے خاص دلچسپیاں پیدا کیں۔ ان میں سے زیادہ قابل توجہ داستان گوئی ہے جو دراصل فی البدیہ تصنیف کرنے کا نام ہے... سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مقبول اسپیکروں میں سے ابھی تک کسی کو فصیح البیانی میں وہ درجہ نہیں نصیب ہو سکا جو قادر الکلام داستان گوئیوں کو حاصل تھا۔"[۱۱]

داستان گوئی کا آخری مرکز رام پور: انیسویں صدی میں جب لکھنؤ کا زوال ہوا تو یہاں کے داستان گویوں نے رام پور کا رخ کیا۔ والئی رام پور نے ان کی سرپرستی کی لکھنؤ کے دو بڑے داستان گو میر احمد علی اور میر قاسم علی لکھنؤ سے رام پور جا کر زمرۂ داستان گویاں میں ملازم ہوئے، سید اصغر علی، ضامن علی جلال، انبا پرشاد رسا اور منشی غلام علی وغیرہ نے دربار کو رونق بخشی۔

دربارِ رام پور میں نواب محمد سعید خان کے عہد سے دوسری جنگ عظیم تک داستان کو ملازم ہوا کرتے تھے یہ داستان گو نہ صرف داستان سناتے تھے بلکہ داستان تصنیف بھی کیا کرتے تھے نواب کلب علی خان کو داستان سے ایسا لگاؤ تھا کہا نہوں نے تین داستانیں خود قلم بند کیے دیکھتے ہی دیکھتے شاہ پسند فن عوام پسند بن گیا۔ لکھنؤ کے ماہر داستان گوئیوں نے لکھنؤ سے آ کر رام پور میں آباد ہوئے اور ان داستان گویوں کی سرپرستی والئی رام پور نے کی امرا کی سرپرستی میں رام پور میں داستان گوئی کو فروغ ہوا ان داستان گویوں نے امیر حمزہ اور بوستان خیال کا دفاتر کے دفاتر سیاہ کر ڈالے جس کے واحد قلمی نسخے سینکڑوں کی تعداد میں ایسٹ انڈیا لائبریری رام پور میں موجود ہیں ان کی ضخامت اس قدر ہے کہ ایک نسخے کو پڑھنے میں ہی مہینوں کی مدت درکار ہے اور بعض قلمی مخطوطات ایسے بھی رہے ہوں گے جو دستبرد زمانہ ہو گئے۔

آخری داستان گو میر باقر علی کے وفات ۱۹۲۸ء کے ساتھ ہی داستان گوئی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اس کے 77 برس بعد ۲۰۰۵ء میں داستان گوئی کا دوبارہ آغاز ہوتا ہے شمس الرحمن فاروقی نے داستان امیر حمزہ کی چھیالیس جلدوں کا عمیق مطالعہ کر کے اس کے عرق کو ساحری، شاہی اور صاحب قرانی کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل مدلل تفہیم و تعبیر پیش کیا۔ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی کی تحریک پر اکیسویں صدی میں داستان گوئی کا از سر نو آغاز کرنے کا سہرا محمود فاروقی کے سر جاتا ہے

۴ مئی ۲۰۰۵ء کی شام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے ہال میں شمس الرحمن فاروقی اور William Dalrymle کی موجودگی میں طلسم ہوشربا سے دو داستانیں سنائی گئیں اس دن داستان گوئی کا نہ صرف از سر نو آغاز ہوا بلکہ عوام اس بیانیہ فن سے واقف ہوئی اور لوگوں کو داستان گوئی کا احساس ہوا اور اسی سلسلے میں ہندوستان اور بیرون ممالک میں داستان گوئی کی سینکڑوں مجلسیں منعقد ہوئیں۔ انیسویں صدی میں داستان گوئی کی تربیت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے محمود فاروقی اور دانش حسین نے نئے نئے داستان گویوں کو تربیت دینے کا کام شروع کیا اس سلسلے کی پہلی خاتون فوزیہ ہیں۔ ان داستان گویوں میں کچھ اہم نام ہیں جنہوں نے محمود فاروقی اور دانش حسین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے داستان گوئی کو لوگوں تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دیا ان میں راجیش کمار، شیخ عثمان، رانا پرتاب، منوسکندر، ڈھنگرا، یوتج سنگھ، کلجیت سنگھ، شروتی پارتھا سارتھی، انکت چڈھا، ندیم شاہ اور آرتی جین وغیرہ نے دنیا کہ تمام ممالک میں گھوم گھوم کر داستان گوئی کو عوام تک پہنچایا۔ انیسویں صدی میں صرف ایک داستان گو قصہ سنایا کرتا تھا وہیں اکیسویں صدی میں اب دو داستان گو بیک وقت داستان سنا رہے ہیں اکیسویں صدی کے داستان گوئی میں ایک اہم نام ہمانسو باجپئی کا ہے جنہوں نے" قصہ قصہ لکھنوا" لکھنؤ کے عوامی قصے کو ایک کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔

مراجع ومصادر

۱۔ اردو کی نثری داستانیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص ۲۹
۲۔ ایضاً ص ۴۵
۳۔ سخندان فارس، محمد حسین آزاد، ص ۱۵۸
۴۔ باغ و بہار، میر امن، ص ۵
۵۔ داستان سے ناول تک، پروفیسر ابن کنول، ص ۱۴۵
۶۔ حدائق الانظار، خواجہ امان دہلوی، ص ۲
۷۔ ہماری داستانیں، سید وقار عظیم، ص ۱۴
۸۔ داستان سے ناول تک، سید وقار عظیم، ص ۱۵
۹۔ اردو کی نثری داستانیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص ۱۰۳، ۱۰۴
۱۰۔ اردو زبان اور فن داستان گوئی، ڈاکٹر کلیم الدین احمد، ص ۱۸
۱۱۔ گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، ص ۱۴۹، ۱۴۸

سبق اردو نومبر 2025
26

اردو ناولوں میں تہذیبی وثقافتی مباحث

محمد افروز رضا
ریسرچ اسکالر کے بی این یونیورسٹی، گلبرگہ

ناول ایک ایسا طویل نثری قصہ ہوتا ہے جس میں زندگی کے بہت سے حقائق بیان کیے جاتے ہیں۔ناول میں حقائق،سفرناموں یا خودنوشت کی طرح پیش نہیں کیے جاتے بلکہ اس میں کرداروں کے ذریعے زیب داستان کے لیے کچھ فرضی واقعات بھی گڑھ لیے جاتے ہیں اور سماجی نفسیات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ناول کی شعریات واصولیات کے لیے ہمیں بہت سے نظریہ سازوں کے اقوال ونظریات کو سامنے رکھنا لازمی ہے۔ناول کے اجزائے ترکیبی میں کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمے، اسلوب، موضوع اور نظریہ اہم ہیں۔ای ایم فارسٹر نے قصے کو ناول کی ریڑھ کی ہڈی کہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج قصوں سے عاری ناول بھی لکھے جارہے ہیں۔ کلاویوز کے مطابق ''ناول اُس زمانے کی حقیقی زندگی اور طورطریقوں کی تصویر ہوتی ہے جس میں وہ لکھا گیا ہو''۔اندرائے مرائے کا خیال ہے:''حقیقی ناول کبھی رومانی نہیں ہوسکتا اس کے لئے حقائق کا سہارا اور حقیقی سوسائٹی کا پس منظر ضروری ہے۔پروفیسر بیکر نے ناول کے لیے چار شرائط بتائی ہیں: قصہ ہو،نثر میں ہو، زندگی کی تصویر ہو اور اس میں ربط و یک رنگی ہو۔

تہذیب کی تعریف:

کسی معاشرے کی سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔تہذیب ایک ایسے معاشرے کا نام ہے جہاں لوگوں کی ایک کثیر تعداد بہت سے مشترکہ معاملات میں ایک دوسرے کے ہم خیال ہوتے ہیں۔بہ الفاظ دگر کسی انسانی معاشرے میں ذہنی ثقافت اور مادی ترقی کی اعلیٰ ترین صورت حال کو تہذیب کا نام دیا جاسکتا ہے۔

تہذیب ایک وسیع اور کثیر جہتی تصور ہے جو کسی بھی معاشرے، گروہ یا قوم کے مجموعی رویوں، اقدار، اور رہن سہن کے طریقے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ صرف اخلاقیات یا اچھے برتاو؟ تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں وہ تمام عوامل شامل ہیں جو کسی بھی انسانی گروہ کی شناخت کو بناتے ہیں۔تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے لاطینی زبان کا لفظ''کلچر''مستعمل ہے۔سید عابد حسین تہذیب کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''۔۔۔۔۔۔۔۔۔تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے جسے وہ اپنے اجتماعی ادارت میں ایک معروضی شکل دیتی ہے۔ جسے افراد اپنے جذبات ورجحانات اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں ان اثرات میں ظاہر ہوتے ہیں جو وہ مادی دنیا پر اثر ڈالتے ہیں''

(سید عابد حسین۔قومی تہذیب کا مسئلہ۔ص:۵۱)

تہذیب کی تعریف ماہرین کی نظر میں ایک پیچیدہ اور کثیر الجہتی تصور ہے،اور مختلف ماہرین نے اسے مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے۔عام طور پر،تہذیب کی تعریف میں فکری،سماجی،اور مادی ترقی کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تہذیب (Civilization) کی جو فکری تعریف پیش کی ہے وہ درج ذیل ہے:

''یہ تہذیب وہ نظام اقدار ومعیار ہے جس کے حوالے سے معاشرے کی اجتماعی زندگی میں ایسی روح پھونکی جاسکے کہ تخلیقی جوہر زندگی کے ہر شعبے میں نشو نما پانے لگے۔تخلیقی جوہر ہر معاشرے کی حقیقی زندگی کے لیے وہی کام کرتا ہے جو جسم میں روح کرتی ہے۔''

یہ تعریف اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک:

تہذیب ایک نظام اقدار ہے، نہ کہ صرف مادی ترقی۔
اس کا مقصد معاشرے کی تخلیقی قوتوں کو بیدار کرنا ہے۔

انہوں نے مغربی معیاروں کی اندھی تقلید کے بجائے اپنی تہذیبی روح کی بازیافت پر زور دیا، جسے انہوں نے اپنی کتاب تنقید اور تجربہ (۱۹۶۷) میں بھی واضح کیا۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی۔ پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ۔سال اشاعت:۱۹۶۴ء۔ص:۹۴)

ڈاکٹر وزیر آغا نے تہذیب کی کوئی ایک جامع یا روایتی تعریف پیش کرنے کے بجائے اسے ایک وسیع ثقافتی اور ارتقائی عمل کے طور پر دیکھا ہے۔ان کی رائے میں تہذیب کی جڑیں برصغیر کی گہری ثقافتی تاریخ اور مقامی نفسیات میں پیوست ہیں۔تہذیب کا تعلق اعلیٰ اخلاق اور جذباتی ارتقا سے ہےجو انسان کی تخلیقی قوت ،نفسیاتی ساخت اور ثقافتی تصادم سے جنم لیتا ہے یہ ایک تحرک پذیر قوت ہے جو معاشرتی ڈھانچوں اور فنون جیسے ادب میں اپنا اظہار کرتی ہے۔

(ڈاکٹر وزیر آغا۔اردو شاعری کا مزاج۔اشاعت: 1965۔ص: 63۔ناشر: مجلس ترقی ادب،نئی دہلی)

تہذیب کے اہم پہلو:

تہذیب کا سب سے اہم جز ثقافت ہے۔یہ اس معاشرے کے رسم و رواج، روایات، فنون، ادب، موسیقی، اور کھانے پینے کی عادات پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے لوگ اپنی خوشی اور غم کا اظہار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق قائم رکھتے ہیں۔

اخلاقیات اور اقدار ہر تہذیب کے اپنے کچھ اصول اور اقدار ہوتے ہیں جو اس کے افراد کے رویوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہ اقدار سچائی، انصاف،

سبق اردو نومبر 2025
27

ایمانداری، احترام، اور دوسروں کی مدد کرنے جیسے بنیادی انسانی رویوں پر مبنی ہوتی ہیں۔

علم وفنون: تہذیب کی ترقی میں علم اور فنون کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ علوم، سائنس، فلسفہ، اور فنون جیسے مصوری، فن تعمیر، اور دستکاری کسی بھی معاشرے کی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

معاشرتی نظام: تہذیب میں خاندان، سماجی طبقے، اور حکومتی ڈھانچے جیسے سماجی نظام بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ نظام معاشرتی تعلقات اور ذمہ داریوں کو منظم کرتے ہیں۔

تہذیب کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ یہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی اور ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ یہ نئی معلومات، نئے تجربات، اور دوسرے معاشروں کے ساتھ رابطے سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر، پرانی یونانی تہذیب، جس نے فلسفہ، جمہوریت، اور فنون میں اہم کردار ادا کیا، آج بھی زندہ ہے اور اس کے اثرات دنیا کے بہت سے حصوں میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح، اسلامی تہذیب نے علم، سائنس، اور فن تعمیر میں جو ترقی کی، وہ آج بھی ہمارے لیے باعث فخر ہے۔

اردو ناولوں میں تہذیبی مباحث کو کئی پہلو سے دیکھا جاتا ہے۔ اردو ناولوں میں ہند و پاک کی تہذیبی تاریخ، تبدیلیوں اور تضادات کو گہرائی سے پیش کیا ہے۔ اردو ناولوں میں سب سے اہم تہذیبی مباحث برطانوی راج میں مشرق و مغرب کے تہذیبوں کے تصادم سے متعلق ہے۔ قدیم و جدید خیالات بھی تصادم کا باعث ہوتی ہیں۔ ناولوں میں ایسے کردار پیش کیے جاتے ہیں جو قدیم و جدید کے درمیان پل کا کام کرتے ہیں۔ اس ضمن میں قرۃ العین حیدر کا مشہور زمانہ ناول ''آگ کا دریا'' پیش کیا جاسکتا ہے۔ جس میں تاریخی اور تہذیبی تسلسل کو مختلف ادوار کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے جہاں تہذیبیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔ ناولوں میں مشترکہ خاندانی نظام کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ کی کہانیاں ملتی ہیں جو ایک بڑی تہذیبی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں لکھنو، اودھ کی تہذیب کو دکھایا گیا ہے جو برطانوی دور حکمرانی میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی، تعلیم، رہن سہن اور لباس میں بھی مغربی تہذیب کے دخول سے مشرقی تہذیب کو خطرہ لاحق ہے۔

اردو ناولوں میں تہذیبی تصادم:

تہذیبی تصادم ایک نظریہ ہے جو امریکی ماہر سیاسیات سیموئیل فلیس نے پیش کیا جس کا حاصل یہ تھا کہ امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ کے خاتمے کے بعد ملکی اور سماجی سطح پر بہت سی تبدیلیاں دیکھی گئیں اور ان تبدیلیوں میں بہت سے ممالک کے باشندے ہم خیال ہوئے گویا عالمی جنگ کے بعد مخصوص سطح پر بہت سی تہذیبوں نے آنکھیں کھولیں۔ آج دنیا گلوبل ویلج کی ہے۔ مختلف تہذیب و اقدار سے وابستہ لوگوں کے درمیان میل جول کا سلسلہ فروغ پا رہا ہے، تو میں ایک دوسرے کے قریب آرہی ہیں جس سے تہذیبی رنگا رنگی ضرور واضح ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی تہذیبی تصادم کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ماضی میں بھی کسی اہم واقعہ یا حادثے کے بعد تہذیبی میل جول سے کسی نئی تہذیب نے جنم لیا۔ دراصل کسی نئی تہذیب کا جنم لینا بھی تہذیبی تصادم کا نتیجہ ہے۔ شرق و غرب کی تہذیب میں ٹکراو؟ اور تصادم کی بنیادی وجہ مذہبیات اور آزادانہ روش ہے۔ ہند و پاک میں اسلام اور ہندومت کا بڑی حد تک غلبہ ہے اور مغرب میں عیسائیت و یہودیت کے مذہب بیزار لوگوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود ہے جس کی بنیاد پر مشرقی اور مغربی تہذیب میں ٹکراو؟ پیدا ہوتے ہیں۔

اردو ناولوں میں کئی ایسے ناول موجود ہیں جو تہذیبی تصادم کے موضوع پر لکھے گئے یہ تصادم عموما دو مختلف ثقافتوں، نسلوں یا طرز زندگی کے درمیان ہوتا ہے۔ قرۃ العین حید کا معروف ناول ''آگ کا دریا'' ہندوستان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں بدلتے ہوئے تہذیبی دھارے اور مشرق و مغرب کے تہذیبوں کا فکری اور روحانی تصادم کا بیانیہ ہے۔ ''اداس نسلیں'' عبد اللہ حسین کا تہذیبی مباحث پر مبنی ناول ہے جس برطانوی راج کے دوران شہر و دیہات کی زندگی کے تصادم کو واضح کرتا ہے۔ مغربی اثرات اور مقامی روایات میں کشمکش اور تقسیم ہند کے پہلے پائے جانے والے تہذیبی انتشار کو بیان کرتا ہے۔ انتظار حسین نے ''بستی'' میں پرانی روایات اور جدید زندگی کے تصادم کا آئینہ ہے جس میں مشرقی پاکستان کی تہذیبی بگاڑ اور نئے معاشرتی سانچوں کی جدوجہد کو بیان کیا گیا ہے۔ شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی'' میں جاگیردارانہ اور فرسودہ معاشرتی اقدار اور دوسری طرف غربت و مفلسی اور جدید شہری کاروبارِ حیات کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ اس ناول میں گرچہ طبقاتی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے تاہم تہذیبی کشمکش بھی موجود ہے۔

سجاد ظہیر نے ''لند کی ایک رات'' میں تہذیبی تصادم کا بنیادی محور انگلستان میں موجود ہندوستانی نوجوانوں کی نفسیاتی اور فکری کشمکش ہے جو مشرقی اقدار اور ماکسی نظریات کے درمیان ہے۔ عزیز احمد نے ''گریز'' میں مشرقی اور مغربی تہذیب کے کشمکش کو دکھاتا ہے۔ مشرقی تہذیب میں مذہبی اور اخلاقی پابندیاں، خاندانی عزت اور ایک مخصوص معاشرتی پابندیا ہیں جبکہ مغربی تہذیب میں انفرادی آزادی، غیر روایتی معاشرت اور جنسی تعلقات کی بے راہ روی پائی جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں کئی سطح پر تصادم کارفرما ہے

جس مرکزی نقطہ روایت کی شکست اور جدیدت کا غیر یقینی اختیار ہے۔

اس کے علاوہ بھی اردو میں کئی اہم ناول لکھے گئے جس میں تہذیبی و ثقافتی مباحث زیر بحث لائے گئے جس میں سیاسی، سماجی، معاشرتی، مشرقی اقدار، مذہبی و اخلاقی پہلو کو اجاگر کیا گیا جس سے اس دور، زمانے یا کسی خاص رخ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے اس دور کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

••••

طلبا کے اکستابی مواقع پر اساتذہ کی ثقافتی استعداد کے اثرات

The effects of Teachers' cultural competence on students' Learning Opportunities

عینم ضیاء
رسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔ بھوپال کیمپس

ہندوستان کا تعلیمی نظام دنیا کے سب سے بڑے تعلیمی نظاموں میں سے ایک ہے۔جس کی آبادی تقریبا 1.3 بلین ہے ، (Andersons & ملین طلبا ہیں۔ 260 ملین پرائمری سکنڈری اساتذہ ہیں اور 8.7 ملین اسکول ہیں، 1.5 Lightfood,2019)

فریم 2030 کے ایجوکیشن UNESCO تعلیم پر خرچ کر رہی ہے ۔جو 6.4٪-1.4٪ کا GDP حکومت ہند ورک فار ایکشن کے طے شدہ گلوبل ٹارگیٹ کے مطابق ہے۔جس میں تمام ممالک کو تعلیم کے لئے اپنی جی۔ڈی۔پی۔ دینے کی صلاح دی گئی ہے۔4-6٪ کا کل

ہندوستان میں پرائمری اسکول میں داخلہ سو فیصد سے زیادہ ہے۔جو چھ سے دس سال کے بچوں کے لئے یونیورسل پرائمری تعلیم کی طرف ہوئی ترقی کو دکھاتا ہے۔دو خاص پالیسیوں نے یونیورسل پرائمری تعلیم کو ممکن بنانے میں مدد کی ہے۔ان پالیسی نے تمام لوگوں کے لئے تعلیم کو مہیا کرنے اور اسکولی نظام کی مجموعی کارکردگی کو بہتر بنانے کے قابل بنایا ہے۔سروشکشا ابھیان (ایجوکیشن فار آل ڈپارٹمنٹ آف اسکول ایجوکیشن اینڈ لٹریسی، منسٹری آف ہیومن رسورس ڈولپمنٹ، حکومت ہند) کا مقصد ہندوستان میں پرائمری تعلیم کو عالمگیر بنانا اور سب کے لئے تعلیم کو عام کرنا ہے۔جبکہ آر۔ٹی۔آئی۔ایکٹ ۲۰۰۹ (منسٹری ایجوکیشن، گورنمنٹ آف انڈیا) بھی چھ سے چودہ سال کے بچوں کو پرائمری سطح پر مفت اور لازمی تعلیم کا حق فراہم کرتا ہے۔

اسکول معاشرے کا ایک ایسا حصہ ہے جو تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ افراد کے فروغ کے ذریعہ ملک کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو طلبا کی آنے والی نسلوں تک فکری ورثے کو منتقل کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔کمرہ جماعت اسکول کی وہ اہم جگہ ہے جہاں پر علم کی منتقلی کا عمل ایک گروہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ایک معلم کی زیر نگرانی کمرہ جماعت کے اندر مختلف تہذیب و ثقافت کے طلبا موجود ہوتے ہیں۔ تمام طلبا کا ثقافتی پس منظر مختلف ہوتا ہے، ان کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں، ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اساتذہ کے اندر ثقافتی استعداد کا ہونا ضروری ہے، جس کے ذریعہ اساتذہ طلبا کی ضروریات کو سمجھ کر مئوثر انداز میں تعلیم فراہم کر سکے۔اساتذہ اسکول کے نظام کے ان اہم عناصر میں سے ایک ہیں جو طلبا کی زندگی اور شخصیت کو متاثر کرتے ہیں۔طلبا ان کا اثر رسمی تعلیمی شعبوں سے کہیں زیادہ قبول کرتے ہیں، جس کا اندازہ طلبا کی شخصیت کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔

ثقافتی استعداد کا تاریخی پس منظر:۔ ڈلر اینڈ مول نے ثقافتی استعداد کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے،"ثقافتی استعداد ہماری نسلوں کے علاوہ دیگر نسلوں کے طلبا گروہ کو مئوثر طریقے سے تعلیم دینے کی صلاحیت پر توجہ دیتی ہے۔مختلف ثقافتی طلبا کو مؤثر طریقے سے تعلیم دینے کے لئے اساتذہ کو مختلف قسم کی صلاحیتوں پر عبور حاصل کرنا ہوگا۔مخصوص ثقافتی استعداد قائم کرنا ہوگا اور مخصوص قسم کے نجی نیز بین الثقافتی شعور اور حساسیت کو فروغ دینا ہوگا۔"

ثقافتی استعداد کا ایک تصور جو میڈیکل کے علاوہ دیگر شعبوں میں استعمال کیا جاتا ہے سماجی علوم کے شعبوں کے ذریعہ فراہم کیا گیا تھا۔کراس اور دیگر کے مطابق "کراس کلچرل استعداد مسلسل طرز عمل اور ذہنیت کا ایک مجموعہ ہے جو ایک پورے پیشہ ور نظام کے ساتھ آتا ہے اور کثیر الثقافتی تربیت کرنے میں مدد کرتا ہے۔" ثقافتی استعداد کی اس تعریف کو مختلف میدان کے متعدد ماہرین نے استعمال کیا یا حوالہ دیا ہے۔

دور حاضر میں ثقافتی استعداد کی اہمیت و ضرورت:۔ ہندوستان میں اساتذہ کے اندر ثقافتی استعداد کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ ہندوستان میں مختلف رنگ و نسل، مذہب اور ذات کے لوگ رہتے ہیں۔اس کے علاوہ مختلف سیاسی و سماجی پس منظر کے لوگ رہتے ہیں۔اسی طرح ہمارے ملک کی کمرہ جماعت بھی مختلف تہذیب و ثقافت سے تعلق رکھنے والے طلبا پھولوں کے سے چہکتی اور مہکتی ہے۔ان طلبا کے ہمہ جہت ترقی کے لئے اساتذہ کے اندر ایسی صلاحیت اور قابلیت کا ہونا ضروری ہے جس سے طلبا کی انفرادی خصوصیات کو پہچان کر اس کے مطابق تعلیم فراہم کر سکیں۔کمرہ جماعت میں مساوات کو فروغ دینا ایک استاد کا بنیادی فرض ہوتا ہے۔اکثر و بیشتر دیکھا جاتا ہے کہ طلبا کے ساتھ ان کے رنگ و نسل یا ذات کی بنیاد پر تعاصب ہوتا ہے۔اس کے علاوہ سیاسی، سماجی اور معاشی عناصر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

اساتذہ میں ثقافتی استعداد موجود ہونے کے بعد ہی وہ مختلف پس منظر سے آئے طلبا سے مئوثر انداز میں بات چیت کر سکتے ہیں۔طلبا جذباتی طور پر اساتذہ سے منسلک ہونگے جس سے اسکول کا ماحول خوش گوار ہوگا۔طلبا پڑھائی میں دلچسپی لیں لینے کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی کا جذبہ فروغ پائے گا اس لئے بعض محققین نے ثقافتی استعداد کو اساتذہ کے لئے اہم قرار دیا ہے۔

ثقافتی (Basic skills of Cultural Competence) استعداد کی بنیادی مہارتیں

ثقافتی استعداد کی مہارت انفرادی طور پر اساتذہ کے ساتھ ساتھ مجموعی طور پر تمام تعلیمی نظام پر لاگو ہونا چاہئے۔کیوں کہ ایک شعبہ دوسرے شعبہ میں ترقی کی حمایت کرتا ہے۔

((Valuing Diversity تنوع کی قدر کرنا

اساتذہ کو مختلف ثقافتی پس منظر، بات چیت کے مختلف طریقوں ،مختلف رسم و رواجوں اور اقدار کے درمیان فرق کو قبول کرنا اور ان کا احترام کرنا چاہئے۔

ثقافتی (Being Culturally Self-aware) طور پر خود بیداری

ثقافت کسی فرد کے تجربات ، علم، مہارت، مہارت، عقائد، اقدار اور

سبق اردو نومبر 2025
29

دلچسپیوں کا مجموعہ ہے۔اساتذہ کے اس احساس کوشکل دیتے ہیں کہ وہ کون ہیں اوراپنے خاندان،اسکول کمیونٹی اورمعاشرے میں وہ کہاں صحیح بیٹھتے ہیں۔

(Dynamics of Difference)تفرقات کی حرکیات

اساتذہ کو یہ جاننا کہ کراس کلچرل بات چیت میں کیا غلط ہوسکتا ہے اور ان حالات میں کیسے جواب دیا جائے۔

((Knowledge of students' Culture طلبا کی ثقافت کا علم

معلمین کواپنے طلبا کی تہذیب وثقافت کا کچھ بنیادی علم ہونا ضروری ہے تا کہ طلبا کے رویئے کوان کے مثبت ثقافتی پس منظر میں رکھ کر سمجھا جا سکے۔

طلبا کے تعلیمی اکتساب پر اساتذہ کی ثقافتی استعداد کے اثرات

(cultural 'The effect of Teachers competence on students' Learning Opportunities)

کسی بھی ادارے کی ترقی اس میں تعلیم حاصل کررہے طلبا کی ترقی پر منحصر ہوتی ہےاورطلبا کی ترقی اساتذہ کی لیاقت وقابلیت پر۔یہ ترقی تبھی ممکن ہوسکتی ہے جب اساتذہ اپنی درس وتدریس میں ایسے طریقہ کار کا استعمال کریں جس سے تدریس مئوثر بنائی جا سکے۔طلبا کو ایسے اکتساب کے مواقع فراہم کئے جائیں جس سے ان کی آنے والی زندگی آسان اورخوشگوار بن سکے۔یہ تبھی ممکن ہوسکتا ہے جب اساتذہ کوان کی انفرادیت اورتہذیب وثقافت کا علم ہوگا۔

طلبا کی ترقی میں اساتذہ کا ایک اہم کردار ہوتا ہے۔اگر اساتذہ طلبا کے خاندان اوران کے ثقافتی پس منظر کو دھیان میں رکھتے ہوئے تعلیم فراہم کرے گا تو طلبا کو بہتر سیکھنے کے مواقع مل سکیں گے۔طلبا اپنے علم کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کر سکیں گے۔

طلبا کی ناموافق تعلیمی پوزیشن کو گھر اور اسکول کی ثقافتوں کے درمیان مماثلت سے منسوب ہے۔بعض اوقات اسے ہوم اسکول کلچرل ولیو کی مماثلت بھی کہا جاتا ہے۔(Wasquez-salgado et ,,2004.Palet et al al,2021)

نے کہا ہے کہ اکثر ہوم اسکول کی ثقافتی اقدار کی مماثلت سے ذہنی Wasquez-salgado et al,2021

اور جسمانی صحت کے عناصر کا اندازہ ہوتا ہے جس سے تعلیمی عناصر متاثر ہوتے ہیں۔یہ عناصر طلبا کے کم نمبر آنے اورکم کارکردگی سے تعلق رکھتے ہیں۔طلبا کے ثقافتی استعداد کے حمایتی ماہرین نے دلیل دی ہے کہ طلبا کے لئے تعلیم ماحول کوان کے ذاتی ماحول اورتجربات سے جوڑا جانا چاہئے۔(گے،۲۰۰۰،۲۰۰۱،۲۰۲۲)اعلیٰ درجے کی ثقافتی استعداد رکھنے والے اساتذہ کو ملازمت دینے سے ثقافتی اقدار کی مماثلت کو دور کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔جس سے طلبا کے درمیان مشغولیت اور کامیابی میں اضافہ ہوگا۔

اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ کیا اساتذہ ثقافتی طور پر ذمہ دارانہ طریقے سے اپنے کام کو انجام دے رہے ہیں۔یا ان کے ثقافتی استعداد کی سطح کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔موجودہ ادبی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمرہ جماعت میں تفرقات کے باوجود ثقافتی استعدا اساتذہ نے نہ صرف انصاف پر مبنی نصاب اورتبدیلی آمیز نصاب پر دھیان دیا بلکہ خوش آئندہ اورسب کو ساتھ لے کر چلنے والی کمرہ جماعت بھی مہیا کی (ہمدان اورکولوما،۲۰۲۲)۔

یہ ضروری ہے کہ اساتذہ خاص طور پر مڈل اسکول میں مئوثر طریقہ کار اور مساوی طرز عمل کواپنائیں جوصحت مند نسلی شناخت کی نشوونما اوراسکول کمیونٹی کے اندر ثقافتی اورتجربات کی حمایت کرتے ہیں(وانگ اوردیگر، ۲۰۲۳)۔ثقافتی طور پر قابل اور ذمہ دار اساتذہ زیادہ مشغول ہوتے ہیں اورتنوع ،شمولیت کے پیمانے پر جمہوریت کوفروغ دیتے ہیں۔

ایک استاد کی ثقافتی استعداد طلبا کے لئے جامع اورمعاون تعلیمی ماحول پیدا کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔متنوع ثقافتوں کو سمجھنے اوران کی قدر کرنے سے اساتذہ مثبت تعلقات کوفروغ دیتے ہیں۔تعلیم میں کامیابی کوفروغ دے سکتے ہیں،ہرایک طلبا کی منفرد ضروریات کو پورا کرسکتے ہیں۔چونکہ ابتدائی تعلیم مستقبل کی تعلیم کی بنیاد رکھتی ہے۔تمام طلبا کے لئے کامیابی کے مواقع فراہم کرنا ایک استاد کا فرض ہے۔ تمام تعلیمی اداروں کو اساتذہ کی ثقافتی استعداد کوفروغ دینے کے لئے مختلف سیمینار اورورکشاپ کا انعقاد کرنا چاہئے۔جہاں پر اساتذہ تربیت حاصل کرسکیں اور اپنی مہارت کوضرورت پڑنے پر استعمال کرسکیں۔

References

Brace, A L. (2011). Cultural Competence and its Impact on Student Academic Achievement in Urban Elementary Schools. TRACE: Tennessee Research and Creative Exchange.

Gay, G. (2018). Culturally responsive teaching: Theory, research, and practice. Teachers College Press.

Latha, N.A (2014), A study of secondary school teachers cultural competence in relation to the self-esteem of their students. Scholarly research journal for interdisciplinary students.
p 50-54

Hamdan, S., & Coloma, R. S. (2022). Assessing teachers' cultural competency. Educational Foundations, 35(1), 108-128.
https://eric.ed.gov/?id=EJ1358841

Moule, J. (2012). Cultural competence: A primer for educators. 2nd Edition. Belmont, CA: Thomson Wadsworth, 6-7

Phalet, K., Andriessen, I., & Lens, W. (2004). How future goals enhance motivation and learning in multicultural classrooms. Educational Psychology Review, 16(1), 59–89.

Phalet, K., Andriessen, I., & Lens, W. (2004). How future goals enhance motivation and learning in multicultural classrooms. Educational Psychology Review, 16(1), 59–89.

Prasad, M. M., D'Souza, G., Joseph, N., & Augusty, T. A. (2024). Cultural competence of early career high school teachers and the potential impact on education equity: A systematic review. Educational Administration: Theory and Practice, 30(5), 12942–12952.

سبق اردو نومبر 2025
30

اردو زبان پر عبور کے فروغ میں مؤثر اکتسابی حکمتِ عملی

(ثانوی درجے کے طلباء کے تناظر میں)

ہاجرہ سلطانہ

ریسرچ اسکالر، شعبہ تعلیم وتربیت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

انسان زبان کے ذریعے اپنے دل کی مختلف کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ زبان وسیلہ ہے اظہار خیال کا۔ اس طرح زبان اور اظہار خیال ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہے انسان جب غذا کی تلاش میں مختلف سمتوں میں منتشر ہو گیا تو مختلف ماحول میں مختلف زبانیں وجود میں آئیں اور لسانی ماحول کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی اور تمدنی ماحول کی بھی تشکیل ہوتی گئی۔اس تہذیب وتمدن 'ادب وثقافت' سیاست وصحافت اور علوم وفنون کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے میں زبان نے اہم کردار ادا کیا اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان تہذیب وتمدن کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔

پنڈت نہرو نے کہا تھا:

اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں زندگی کی دھڑکنیں موجود ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ مختلف اسباب کی بنا پر اردو کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جانی چاہیے یہ ان زبانوں میں سے ایک زبان ہے جس کا ذکر دستور میں موجود ہے .... بے شک اردو ایک ہندوستانی زبان ہے- اردو پاکستان کی زبان نہیں ہے پاکستان تو کیا ہندوستان کے علاوہ کوئی بھی ملک اس زبان کے متعلق اپنا دعوی پیش نہیں کرسکتا- (صحافتی کانفرنس ۵۲ / اکتوبر ۱۶۵۹ نئی دہلی)

جناب ظفر صاحب اپنے ماہنامہ عاکف کی محفل (فروری ۲۰۰۴) کے شمارے میں رقم طراز ہیں یہ "اردو" وہ زبان ہے جس کے بولنے اور سمجھنے والے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں پائے جاتے ہیں دنیا میں صرف تین ایسی زبانیں ہیں کہ جن میں اگر کوئی تحریر لکھ دی جائے تو وہ پوری دنیا کے ہر شخص تک پہنچائی جاسکتی ہے وہ زبانیں ہیں عربی اردو اور انگریزی'۔

اردو زبان صرف اظہار خیال کا ذریعہ نہیں بلکہ ہمارے تہذیبی ور ثے 'تاریخی شعور' ادبی جمالیات اور سماجی رشتوں کی پہچان ہے۔ یہ زبان ہر دور میں سوچ کو سجانے 'جذبات کو برتنے اور خیالات کو نفاست کے ساتھ بیان کرنے کا وسیلہ رہی ہے۔ تعلیمی دنیا میں خصوصا ثانوی جماعتوں کے طلباء کے لیے اردو زبان کی مہارتوں کا مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اسی مرحلے پر وہ زبان کو سمجھنے برتنے اور تخلیقی طور پر استعمال کرنے کی اہلیت ان میں پیدا ہوتی ہے۔

آج کے دور میں تعلیم تیزی سے بدل رہی ہے طلبہ کی دلچسپیاں سیکھنے کے انداز اور تعلیمی ضروریات پہلے سے کہیں زیادہ متنوع ہو چکی ہیں۔ ایسے میں یہ ناگزیر ہے کہ اساتذہ محض روایتی لیکچر یا کتابی تدریس پر اکتفا نہ کریں بلکہ جدید بامقصد اور طالب علم پر مرکوز حکمت عملیوں کو اپنائیں۔ وہ طریقے جو طلبہ کو سیکھنے میں سرگرم پرجوش اور بااعتماد بنائیں ایسے طریقے جو زبان کو جمود سے نکال کر روزمرہ گفتگو' تفہیم مطالعہ اور تحریر کا قدرتی حصہ بنا دیں۔ چونکہ ثانوی سطح وہ عمر ہے جہاں طلبہ کی زبان فہم اور اظہار کی صلاحیتیں تیزی سے پروان چڑھتی ہیں اسی لیے ان کے سامنے ایسی تدریسی فضا رکھنا ضروری ہے جو نہ صرف زبان کے چاروں مہارتوں کو مضبوط کرے بلکہ انہیں عملی زندگی اعلیٰ تعلیم اور سماجی روابط میں بھی موثر بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ موثر اکتسابی حکمت عملیاں آج کے تعلیمی سفر میں بنیادی اہمیت اختیار کر چکی ہیں۔

کسی بھی زبان کے اکتساب میں عام طور پر چار مہارتوں کا سیکھنا مراد ہوتا ہے۔ جو اس طرح ہیں:

سننا (Listening)، بولنا (Speaking)، پڑھنا (Reading) اور لکھنا (Writing) حرف عام میں اسے LSRW کہتے ہیں۔

سننا (Listening): لسانی نشوونما کا پہلا عمل سننا اور سمجھنا ہوتا ہے۔ یعنی ایک نوزائدہ بچہ جیسے ہی دنیا میں قدم رکھتا ہے عمل سماعت کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اپنے اطراف ہونے والی بات چیت اور آوازوں کو بغور سنتا اور انہیں شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح وہ ان آوازوں کے مفہوم کو سمجھنے لگتا ہے۔ سات آٹھ ماہ کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ مختلف آوازوں کو نکالنے لگتا ہے جو دراصل اس کی بات چیت یا گفتگو کی ابتدا ہوتی ہے۔

بولنا (Speaking): صحت کے ساتھ گفتگو کرنے اور اچھی زبان بولنے کا مکمل دارومدار صحت کے ساتھ سننے پر ہے۔ بولنے کا مطلب بامعنی گفتگو یا بات چیت کرنا ہے محض بکواس کرنا نہیں۔ بولنے کے معنی ومفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دلی جذبات اور احساسات کو مرصع انداز میں سجا کر خوبصورتی سے مناسب الفاظ میں ادا کیا جائے تحقیق سے یہ بات بھی ثابت کی جا چکی ہے کہ وہی بچہ جلد لکھنا اور پڑھنا سیکھ لے گا جو صحیح اور واضح طور پر بول سکتا ہے۔ گفتگو کے آداب اور بہتر زبان کے استعمال کے لیے صرف والدین اور اساتذہ ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر والدین گھر میں اچھی زبان استعمال کرتے ہوں اور اساتذہ مدرسے کے اوقات میں بچوں کی گفتگو پر توجہ رکھیں اور دیکھیں کہ آیا طالب علم صحیح زبان استعمال کر رہا ہے یا نہیں اس کا تلفظ صحیح ہے یا نہیں اور دوسرے طلبہ اس کی بات صحیح طور پر سن رہے ہیں یا نہیں تو بچے کی گفتگو خود نکھر جائے گی۔

پڑھنا (Reading): مطالعہ: مطالعہ اکتساب کا اہم ذریعہ ہے اس سے طلباء کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور انسانی زندگی میں پیش آنے والے واقعات وتجربات نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ مطالعہ

سبق اردو نومبر 2025

31

انسانی زندگی کا جز و لانیفک ہے اور تہذیب وتمدن کے فروغ میں بھی مطالعہ نہایت ہی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ "الفاظ کو دیکھنے اور پہچان کر پڑھنے کو مطالعہ کہتے ہیں'۔اس طرح مطالعہ کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے " لکھا ہوا یا چھپا ہوا مواد جب ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو اس تحریری مواد کو حروف اور آواز کے علم کی مدد سے ہم تلفظ کا روپ دیتے ہیں اور اسے بلند آواز سے یا دل ہی دل میں ادا کرتے ہیں اس کو پڑھنا کہتے ہیں'۔ پڑھنے میں نظر زبان اور کان تینوں بہ ایک وقت برابر رول ادا کرتے ہیں لیکن انکھوں سے دیکھ کر الفاظ کو آواز کا روپ دے دینا ہی پڑھنا نہیں ہے' بلکہ پڑھنے میں اخذ کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔

لکھنا(Writing): مخصوص آوازوں کو تحریری روپ دینا" لکھنے کا عمل" کہلاتا ہے ہم زبان سے گفتگو کرتے ہیں یا زبان قلم سے یعنی تحریر کے ذریعے اپنے خیالات کو صفحات پر ظاہر کرتے ہیں۔موثر اور ماہر ادیب یا شاعر اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج میں نئ تحریکات پیدا کرسکتا ہے۔تحریر رابطے کا بہترین ذریعہ ہے۔عمدہ اور خوبصورت تحریر کے ذریعے چند زرّیں اصولوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تحریر کی مختلف قسمیں ہیں مثلا جملہ بندی' پیراگراف' خلاصہ' کہانی' مکالمہ' تشریح' نظم' مضمون' خطوط' عریضہ' روداد' خبریں تحریر کرنا اور روزنامچہ وغیرہ (ڈاکٹر محمد شجاعت۔اردو زبان نئے افق۔حیدرآباد۔ ۹۰۰۲)

طلبہ میں ادبی ذوق کا ارتقاء زبان کی تعلیم کے اہم مقاصد میں سے ایک ہے۔اس کے لیے طالب علم کو نہ صرف مواد سبق کو پڑھنا ہے بلکہ اسے اگے بڑھ کر اس کے حسن وقبح پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

ثانوی درجات کے طلبہ میں اتنی قابلیت ضرور ہونی چاہیے کہ وہ نصابی کتابوں کے علاوہ اپنی پسند کے موضوعات کی بعض دوسری کتابوں کا مطالعہ کے شوق میں کتب خانوں سے رجوع کرسکیں۔مباحثوں اور دوسری تقریری یا تحریری مقابلوں میں حصہ لینے کے ساتھ طلبہ میں اتنی سمجھ بوجھ بھی پیدا ہونا چاہیے کہ وہ اپنے دلچسپی کے مضامین وتقاریر پر آپس میں تبادل خیال اور رائے زنی کرسکیں۔کچھ متفرق اشعار نظم کے ٹکڑے اور نصری اقوال بھی ان کے حافظے میں اس طرح رہنا چاہیے کہ وہ حسب ضرورت انہیں اپنی تقریر وتحریر میں استعمال کرسکیں۔جن مصنفین کی تخلیقات ان کے نصاب میں شامل ہو ضروری ہے کہ طلبہ ان میں سے اکثر و بیشتر کی حالات زندگی اور شخصیت سے واقف ہوں۔اس کے مرکب الفاظ کی تشریح' تلمیح اور تشبیہ کی تعریف مختلف مصادر سے بنے ہوئے محاورات کے استعمال' محاورہ اور ضرب المثل کا فرق' قواعد کے اہم صرفی اجزاء مثلا اسم' صفت' فعل' ضمیر حرف وغیرہ کے اقسام اور فرہنگ و لغات کے استعمال سے اگاہی بھی ان جماعتوں میں اردو تدریس کے مقصد و معیار کا جز وخاص ہونا چاہیے۔شہر وادب کی مختلف اصناف جیسے ناول' داستان' افسانہ' ڈراما' غزل نظم' رباعی' مثنوی' مرثیہ وغیرہ کے فنی لوازم اور ہر صنف کے اعلی پایا شعرا و ادبا کے کارناموں مع ان کی سوانح حیات کو بھی ان طلبہ کی واقفیت اور معلومات کا اہم جز و سمجھا جائے گا۔ واحد جمع کے قاعدے تذکیر و تانیث کے اصول' اصناف شعر و ادب' مرکب الفاظ کی صورتیں اور رموز و اوقاف کو برتنے کے طریقوں سے آگے بڑھ کر جملوں کی ساخت اقسام اور نحو کے بعض دوسرے قاعدے بھی اچھی طرح ان کے ذہن نشین ہونا چاہیے۔نصاب کے ساتھ ساتھ ایک خاص معیار کی غیر نصابی تحریروں کی موثر قرات اور تفہیم وتحسین کی بھی ان سے توقع کی جائے گی۔تقریر وتحریر دونوں میں سے یہ بھی دیکھا جائے گا کہ ان کا لب ولہجہ کتنا پر اثر اور ان کا طریقہ اظہار کتنا جامع اور انفرادی ہے اور وہ اپنی تخلیقی واستحسانی صلاحیتوں کو کس طرح بروئے کار لارہے ہیں اپنی پسند کے شعراء کی متعدد غزلیں نظمیں یا کچھ اچھے اچھے شعر بھی ان کے حافظے میں رہنا ضروری ہے نصاب سے الگ بعض ممتاز شعراء کے حالات و کلام سے بھی انہیں کچھ نہ کچھ واقفیت ہونی چاہیے۔صحت وتلفظ اور الفاظ و محاورات کا صحیح استعمال بھی طلبہ کی زباندانی کا ایسا جز ہونا چاہیے کہ وہ ہر قسم کی تقریر وتحریر میں ان کی غلطیوں کو محسوس کرسکیں۔

زبان وادب کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب اصناف کی تکنیک اور ارتقا اور تنقید وتبصرہ بھی کرسکتے ہیں۔طلبہ کی نظر میں ایسی وسعت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ شعر وادب کے حسن وقباح میں تمیز کرسکیں۔مصنف شاعر یا ادیب کے نقطے نظر سے اتفاق یا اختلاف کرسکیں۔سماج فطرت اور زندگی سے متعلق صحت مند رویے پیدا کرسکیں اور زندگی کے اعلی قدروں کے حامل ہوسکیں اس کے علاوہ طلبہ میں تحریری اور تقریر انشاء کی ایسی صلاحیت بھی پیدا ہو کہ وہ تخلیقی جوہر کو بروئے کار لاسکیں۔ثانوی سطح کے کلاس روم کی اصل صورتحال اکثر کتابوں میں لکھی توقعات سے مختلف ہوتی ہے زیادہ تر کلاسوں میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وقت محدود ہوتا ہے اور اساتذہ پر نصاب مکمل کرنے کا دباؤ بھی موجود رہتا ہے۔نتیجے میں طلبہ کو زبان کی مہارتوں کو فروغ دینے کا وہ موقع نہیں مل پاتا جس کی انہیں واقعی ضرورت ہوتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ تدریس روایتی طرز پر مرکوز رہتی ہے استاد بولتا ہے اور طلبہ سنتے ہیں۔لیکن ایسے ماحول میں طلبہ کو زبان کا عملی استعمال کم ملتا ہے سننے اور بولنے کی سرگرمیاں تو اکثر نظر ہی نہیں آتیں جبکہ مطالعہ اور تحریر کی مشق میں کبھی کبھار اور صرف امتحانی تیاری تک محدود رہتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بہت سے طلبہ کتابیں پڑھنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں گفتگو میں اعتماد کم ہوتا ہے اور تحریری اظہار بھی پوری طرح نکھر نہیں پاتا اس کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی کی کمی' وسائل کی محدودیت اور طلبہ کی دلچسپی برقرار رکھنے کی دشواریاں بھی صورتحال کو مزید پیچیدہ کرتی ہیں ایسے حالات میں یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ تدریس کو محض "سبق پڑھانے" کے عمل کی بجائے ایک دلچسپ' باہمی عملی اور جدید سیکھنے کا تجربہ بنایا جائے تاکہ زبان بچوں کی روزمرہ زندگی کے قریب ہوسکے۔(محی الدین قادرزور کشمیری۔تدریس اُردو۔سری نگر۔ ۹۰۰۲)

موثر اکتسابی حکمت عملیاں:

تدریس کے تصور پر زیادہ تر اثر آموزشی نظریات کا پڑا ہے۔آموزش (اکتساب) تدریس سے کچھ زیادہ سب کچھ اپنے اندر سمو لینے والا تجربہ ہے لیکن تدریس اور آموزش کا قریبی رشتہ ہے- آموزش تدریس کا ایک نتیجہ

سبق اردو نومبر 2025
32

ہے۔موثر آموزش مطابق رکھنے والے مواد تعلیم کی بہتر یادداشت میں مدد کرتی ہے۔مواد تعلیم کی قسم آموزش کی حکمت عملی کے انتخاب میں مدد کرتی ہے۔آموزش کی مقدار اور کیفیت دونوں پر ان حکمت عملیوں کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔

کل بمقابلہ جز آموزش (Whole Vs Part): آپ نے شاید یہ بحث سنی ہوگی کہ ایک نظم کو ایک ایک بند کر کے یاد کرنا بہتر ہے یا پوری نظم کو ایک ساتھ یاد کرنا' یعنی کہ ایک ہی وقت میں شروع سے آخر تک۔دراصل یہ مواد تعلیم کے مقدار 'مواد تعلیم کی قسم طالب علم کی ذہنی عمر اور متعلقہ عوامل پر منحصر ہے۔جز طریقہ استعمال کرنے سے طالب علم میں تحریک باقی رہتی ہے کیونکہ اسے یہ احساس کچھ عرصے بعد ہی ہوتا رہتا ہے کہ وہ ترقی کر رہا ہے اور وہ جیسے جیسے مواد تعلیم پر عبور حاصل کرتا ہے اسے کامیابی کا احساس ہوتا جاتا ہے۔

وساطتی طریقہ (MediatingMethod): مواد تعلیم کا کچھ حصہ جیسے مبہم معنی اور غیر معروف محاوروں پر مشتمل مواد مشکل ہو تو یادداشت میں مشکل حصوں کو درج کرنے کے لیے پوری نظم کو دہرانا پڑے گا اس دشواری پر قابو پانے کے لیے کل طریقے میں ایک سدھار کیا گیا ہے اس سدھار کے مطابق مشکل الفاظ اور محاوروں پر شروع میں ہی عبور حاصل کر لیا جاتا ہے اور پھر کل طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔یہ طریقہ لمبے ذخیرہ الفاظ والے مواد اور منطقی کل دونوں کے لیے استعمال ہوسکتا ہے یہ پہلے کی طرح ہی کل سے جز کی طرف چلتا ہے لیکن زیادہ مشکل اور غیر مانوس حصوں کے زیادہ گہرے مطالعے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

باوقفہ بہ مقابلہ غیر وقفہ آموزش(Spaced Vs Unspaced Learning): با وقفہ آموزش تقسیم شدہ (Distributed) آموزش بھی کہلاتی ہے۔باوقفہ آموزش میں ایک لمبی تفویض یا کام (Assignment) کو بیچ میں آرام کر کے یا وقفہ دے کر مکمل کیا جاتا ہے۔یہ طریقہ کوشش کے تسلسل پر مبنی ہے مثال کے طور پر اگر ہمیں ایک آموزشی کام پر ایک دن میں آٹھ گھنٹے کام کرنا ہے تو ہم اسے چار دنوں میں روزانہ دو گھنٹے کام کی شکل میں تقسیم کر لیتے ہیں اس طرح ایک غیر وقفہ یا مجموعی آموزش (Massed Learning) میں ایک سبق بنا کسی وقفے آرام کے سیکھا جاتا ہے اس طریقے میں طالب علم ایک آموزشی کام یا سبق پر لگاتار کام کرتا ہے۔

تحت خوانی طریقہ (Recitation Method): یہاں تحت خوانی سے مراد ہے خود اپنے لیے سنانا دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب ہے کہ وقتاً فوقتاً خود اپنے آپ سے سوال کر کے اپنی یادداشت کی جانچ کرنا' یہ طریقہ مواد تعلیم کو ایک یا دو مرتبہ پڑھنے اور پھر مواد تعلیم کو بغیر دیکھے دہرانے کی کوشش کرنے پر مشتمل ہے۔حالانکہ طالب علم ان نکات کو فوری طور پر دیکھ سکتا ہے جنہیں وہ دہرا نہیں پا رہا ہے کئی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ خود اپنے لیے تحت خوانی کرنا اپنے متعلق کے وقت کا صرف پڑھنے کے مقابلے میں زیادہ کفایتی استعمال ہے اس طریقے میں نہ صرف استعمال ہونے والی توانائی کا کفایتی استعمال ہوتا ہے بلکہ یہ طریقہ مستقل یاد رکھنے میں بھی مدد کرتا ہے۔یہ طریقہ اپنی غلطیوں کی شناخت کرنے اور انہیں درست کرنے میں اپنے فوری مقاصد طے کرنے میں طالب علم کی مدد کرتا ہے اور اسے اس کی ترقی سے واقف کراتا رہتا ہے۔

مکالماتی تدریس۔باہمی گفتگو کا ماحول: زبان جتنی بولی جائے اتنی ہی بہتر سمجھ میں آتی ہے۔گروپ ڈسکشن، جوڑی میں بات چیت، سوال و جواب، مباحثے اور ڈائیلاگ پریکٹس جیسے طریقے طلباء میں اعتماد پیدا کرتے ہیں۔ایسا ماحول انہیں احساس دلاتا ہے کہ ان کی بات اہم ہے، اور وہ غلطی کرنے کے خوف کے بغیر اپنی زبان بہتر بنا سکتے ہیں۔

سرگرمی پر مبنی تدریس: سیکھنے کو کھیل بنانا: جب سیکھنا سرگرمی کے ساتھ جڑ جائے تو طلباء نہ صرف دلچسپی لیتے ہیں بلکہ زیادہ دیر تک یاد بھی رکھتے ہیں۔کہانی مکمل کروانا، تصویری گفتگو، Role Play، ڈرامہ، لفظی کھیل اور تخلیقی ٹاسکس زبان کی چاروں مہارتوں کو ایک ساتھ مضبوط بناتے ہیں۔طلباء ایسی سرگرمیوں میں سیکھتے ہوئے لطف محسوس کرتے ہیں، اور یہی لطف انہیں زبان سے جوڑتا ہے۔

مطالعہ پر مبنی حکمتِ عملیاں، متن سے دوستی: مطالعہ صرف کتاب پڑھنے کا نام نہیں، بلکہ نئے خیالات سے ملاقات کا عمل ہے۔ Shared Reading، بلند آواز سے پڑھنا، Skimming، Scanning اور مختصر خلاصہ لکھوانا طلباء کو متن سمجھنے میں مہارت بخشتے ہیں۔یہ حکمتِ عملیاں ان کی توجہ، سمجھ اور تحلیلی سوچ میں اضافہ کرتی ہیں۔

بہتر تحریر کے لیے عملی طریقے۔ لکھائی میں پختگی: تحریری مشق کو باقاعدہ معمول کا حصہ بنانا نہایت ضروری ہے۔مختصر پیراگراف، املا کی مشق، جملہ سازی، تخلیقی تحریر، خط اور ڈائری لکھنے جیسے کام طلباء کو نہ صرف لکھنا سکھاتے ہیں بلکہ سوچنے کی صلاحیت بھی نکھارتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے کام آہستہ آہستہ بڑی تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔

ICT اور ڈیجیٹل وسائل: سیکھنے کو جدید بنانا: آج کے طلباء ٹیکنالوجی سے جڑے ہوئے ہیں، لہٰذا سیکھنے کا عمل بھی ان کی دنیا سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔آڈیو لیکچرز، موبائل ایپس، آن لائن لغات، تعلیمی ویڈیوز اور پریزنٹیشن زبان سیکھنے کو دلچسپ بناتے ہیں۔طلباء اپنی آواز ریکارڈ کر کے تلفظ کا موازنہ بھی کر سکتے ہیں جو خود احتسابی کے لیے بہترین طریقہ ہے۔

پراجیکٹ بیسڈ لرننگ۔زبان کو عمل میں لانا: پراجیکٹس طلباء کو زبان کے ساتھ عملی رابطہ دیتے ہیں۔مصنفین پر تحقیق، پریزنٹیشنز، مکالمہ نویسی، کہانی سازی اور چھوٹے تحقیقی کام نہ صرف زبان کی مشق کرواتے ہیں بلکہ خود سیکھنے کی عادت بھی پیدا کرتے ہیں۔

زبان سے بھرپور ماحول۔اردگرد ہی سیکھنے کا سامان: کلاس روم میں الفاظی چارٹس، جملوں کے نمونے، قواعد کے پوسٹرز، مختصر اقوال، بورڈ سرگرمیاں یہ سب طلباء کو زبان کے ساتھ مسلسل رابطے میں رکھتے ہیں۔ایسا ماحول خاموشی سے بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔

مثبت فیڈ بیک اور مؤثر جانچ۔رہنمائی جو اعتماد دے: فیڈ بیک اگر محبت اور رہنمائی کے ساتھ دیا جائے تو طلباء کی کارکردگی میں حیران کن بہتری آتی

سبق اردو نومبر 2025
33

ہے۔ Peer Assessment،Rubrics ،مختصر زبانی ٹیسٹ اور اساتذہ کی بروقت رہنمائی انہیں اپنی کمزوریاں سمجھنے اور بہتر کرنے میں مدد دیتی ہے۔ (ڈاکٹر محمد اختر صدیقی۔تدریسی۔ آموزشی حکمت عملیاں۔ نئی دہلی۔ ۲۰۰۴)

حکمتِ عملیوں کے مثبت اثرات: جب کلاس روم میں اکتسابی حکمتِ عملیوں کو سوچ سمجھ کر اور مستقل مزاجی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس کے اثرات نہ صرف طلباء کے سیکھنے میں نظر آتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت، اعتماد اور رویّوں میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ زبان کی مہارتوں کا فروغ محض نصاب تک محدود نہیں رہتا بلکہ ان کی روزمرہ زندگی اور مستقبل کی تعلیم پر بھی مثبت اثرات چھوڑتا ہے۔

زبان کی چاروں مہارتوں میں متوازن ترقی: سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارتیں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں۔ جب حکمتِ عملیاں عملی انداز میں نافذ کی جائیں تو طلباء ان چاروں صلاحیتوں میں بیک وقت بہتر ہوتے ہیں۔ زبان اُن کے لیے پیچیدہ نہیں رہتی بلکہ ایک قابلِ استعمال، آسان اور دلچسپ ذریعہ بن جاتی ہے۔

اعتماد اور روانی میں اضافہ: گفتگو، مباحثہ، مکالمہ اور کردار نگاری جیسی سرگرمیاں طلباء کو اپنی جھجک توڑنے میں مدد دیتی ہیں۔ وہ غلطی کے خوف سے نکل کر اعتماد کے ساتھ بولنے لگتے ہیں۔ یہ روانی نہ صرف کلاس روم میں فائدہ دیتی ہے بلکہ امتحانات اور عملی زندگی دونوں میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

ذخیرہ ؟ الفاظ میں نمایاں اضافہ: سرگرمیوں، مطالعے، گفتگو اور تحریری مشق کے باعث طلباء کا ذخیرہ ؟ الفاظ تیزی سے بڑھتا ہے۔ زیادہ الفاظ کا مطلب ہے بہتر سمجھ اور زیادہ مؤثر اظہار جو زبان سیکھنے کے اصل مقاصد میں سے ایک ہے۔

امتحانی کارکردگی میں نمایاں بہتری: جس طالب علم کی زبان مضبوط ہو، اس کی تحریر، سمجھ اور جواب دینے کی صلاحیت بھی بہتر ہوتی ہے۔ یہ براہِ راست امتحانی نتائج میں بہتری کا باعث بنتا ہے، کیونکہ وہ سوالات کو بہتر سمجھتے اور واضح انداز میں جوابات لکھتے ہیں۔

مطالعے اور تحریر سے دوستی پیدا ہونا: جب طلباء مطالعہ خوشی کے ساتھ کریں اور تحریر کو بوجھ نہ سمجھیں، تو وہ زبان کے ساتھ ایک جذباتی تعلق محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ تعلق انہیں کتابوں کی دنیا کے قریب کرتا ہے اور وہ خود سے لکھنے اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

خود سیکھنے کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے: جدید حکمتِ عملیوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طلباء صرف استاد پر انحصار نہیں کرتے بلکہ خود بھی چیزیں تلاش کرتے ہیں، سیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں اور جانچتے ہیں۔ یہی صفت انہیں آگے چل کر بہتر طالب علم، بہتر فرد اور بہتر متعلم بناتی ہے۔ (ڈاکٹر ریاض احمد۔اردو تدریس۔نئی دہلی۔ ۲۰۱۶)

خلاصۃ:

زبان کی تدریس اس مرحلے پر انجام پاتی ہے جہاں طلباء کی شخصی، علمی اور ابلاغی صلاحیتیں تیزی سے تشکیل پا رہی ہوتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ زبان سیکھنے کے تمام پہلو۔ استماع، گفتگو، مطالعہ اور تحریر۔ متوازن طور پر پروان چڑھیں۔ تاہم روایتی تدریس اور محدود عملی مواقع طلباء کی فطری زبان دانی کو پوری طرح نکھرنے نہیں دیتے۔

جدید اکتسابی حکمتِ عملیاں اس خلا کو مؤثر انداز میں پُر کرتی ہیں۔ مکالماتی تدریس، سرگرمی پر مبنی سیکھنا، مطالعہ کی عملی تکنیکیں، تحریری مشقیں، پراجیکٹ بیسڈ لرننگ اور ICT کا استعمال نہ صرف طلباء کی زبان پر گرفت مضبوط کرتا ہے بلکہ انہیں خود اعتمادی، منطقی سوچ، بہتر اظہار اور مؤثر ابلاغ کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ ایسے طریقوں سے طلباء زبان کو محض نصابی مضمون کے طور پر نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کے فعال وسیلے کے طور پر برتنے لگتے ہیں۔ نتیجتاً زبان کی چاروں مہارتوں میں ہم آہنگ ترقی، ذخیرہ ؟ الفاظ میں اضافہ، امتحانی کارکردگی میں بہتری، اور خود سیکھنے کے رجحان کا فروغ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یوں جدید، دلچسپ اور بامقصد حکمتِ عملیوں کے ذریعے اردو زبان کی تدریس ایک فعال، معنی خیز اور دیرپا تعلیمی تجربہ بن جاتی ہے، جو طلباء کے ذہنی، اخلاقی اور ابلاغی سفر میں مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔

سبق اردو نومبر 2025
34

کتاب چلچلتہ العارفین کی ادبی اہمیت

الیاس احمد
ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد (سرینگر کیمپس)
موبائل نمبر 7889418901

چکیدہ:
چلچلتہ العارفین کے مصنف کا نام خواجہ اسحاق قاری ہے۔خواجہ اسحاق قاری کشمیر کے معروف صوفیاء اکرام سلسلہ سہروردیہ میں شمار ہوتے ہی۔خواجہ اسحاق قاری سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ کے خلفاء میں سے ایک ہیں۔خواجہ اسحاق قاری نے اپنی یہ کتاب چلچلتہ العارفین ۹۸۲ء میں مکمل کی تھی۔چلچلتہ العارفین کے کل سات باب ہیں۔اس میں مصنف نے اپنے مرشد کے حالات و کرامات قلمبند کرنے کے علاوہ تصوف وعرفان کے اہم نکتوں کی وضاحت اور راہ سلوک کے مختلف مراحل پر تفصیلاً روشنی بھی ڈالی ہے۔یہ کتاب کشمیر میں سلسلہ سہروردیہ کے صوفیاء میں سے کسی صوفی کی لکھی ہوئی کتاب فارسی ادب کا ایک نہایت ہی قیمتی اثاثہ سمجھی جاتی ہے۔مذکورہ کتاب میں مصنف نے اپنی نجی زندگی اور راہ سلوک اختیار کرنے کے بارے میں سب سے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔چلچلتہ العارفین کشمیر کی فارسی نثری کتابوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔یہ کتاب نثر کے اہم موضوعات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ کشمیر کے سہروردیہ عہد کے صوفیاء کا ایک اہم تزکرہ بھی ہے۔اس کتاب کے نثر ونظم دونوں میں صوفیانہ رنگ نظر آتا ہے۔

کلیدی الفاظ:
چلچلتہ العارفین، خواجہ اسحاق قاری، فارسی، سہروردیہ، تصوف، صوفی، کشمیر، فارسی، سلطان العارفین۔

قبل اس کے کہ چلچلتہ العارفین کا ادبی جائزہ لیا جائے اس کتاب کے مصنف کا مختصر تعارف پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔خواجہ اسحاق قاری رحمتہ اللہ علیہ اپنے بھائی حضرت خواجہ حسن قاری رحمتہ اللہ علیہ کی طرح سلطان العارفین حضرت شیخ حمز مخدوم رحم※ اللہ علیہ کے برگزیدہ خلفاء میں شامل ہیں۔آپ طریقت میں کامل۔ریاضت میں بے مثال، صاحب بصیرت اور علم قرآت کے بہت بڑے ماہر تھے۔چک دور اور ابتدائی مغل دور کے بلند پایہ عارفوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔بچپن میں ان کا قوت حافظہ کمزور تھا لیکن حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کی توجہ سے حافظہ درست اور قوی ہو گیا اور قرآن پاک از بر ہوا۔دونوں بھائیوں حضرت خواجہ حسن قاری رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ اسحاق قاری رحم※ اللہ علیہ نے دینی علوم اور علم قرآت اپنے زمانے کے جید عالم دین مخدوم حاجی احمد رحمتہ اللہ علیہ سے سیکھے دیگر علمائے وقت سے علوم عقلی ونقلی میں تبحر حاصل کیا اور پھر حضرت مخدوم رحمتہ علیہ کی خانقاہ میں بحیثیت امام مقرر ہوئے۔اس طرح حضرت سلطان العارفین رحمتہ اللہ علیہ کے قریب رہ کر ان سے فیضان پانے کا موقع ہاتھ آ گیا جس کا فائدہ انہوں نے خوب اٹھایا۔حضرت خواجہ اسحاق رحمتہ اللہ علیہ حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کے کشف وکرامات ریاضت وعبادات ومکاشفات کے عینی گواہ ہیں۔امامت کے علاوہ آپ اپنے مرشد پاک کے دوسرے بہت سے کام انجام دیتے تھے۔آپ کا دل عشق الٰہی سے سرشار اور دردوسوز حق سے بھرا پڑا تھا۔ایک دفعہ ذکر اسم ذات میں مصروف ہو کر ایک آہ کھینچی تو نزدیک ہی ایک پتھر سوز درون کی تمازت سے پاش پاش ہو گیا۔چک دور کے نامساعد حالات کی بنا پر جہاں بہت سارے علماء وفضلاء نقل مکانی پر مجبور ہو گئے خصوصاً مرشد طریقت حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد سرکشوں کے ظلم وستم سے بچنے کے لیے بہت سے علماء وصلحاء نے نقل مکانی فرمائی تو حضرت خواجہ اسحاق قاری رحمتہ اللہ علیہ بھی سیالکوٹ تشریف لے گئے۔اگرچہ دوسرے علماء وخلفاء مغلوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد کشمیر واپس تشریف لائے مگر خواجہ اسحاق قاری رحمتہ اللہ علیہ سیالکوٹ سے لاہور اور پھر وہاں سے مکہ معظمہ چلے گئے۔روضہ رسول ﷺ کی زیارت کے بعد وہیں مقیم رہے اور وہیں وفات پا کر جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔(ریاض الاخیار واقعات کشمیر) حضرت خواجہ اسحاق قاری رحمتہ اللہ علیہ نے کتاب چل چلتہ لعارفین ۹۸۲ھ میں مکمل کر لی اور اس وقت حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ بقید حیات تھے۔کتاب مکمل کرنے کے بعد حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس کو حضرت خدوم رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا اور مرشد بزرگوار نے اس کے مطالعہ کے بعد حضرت خواجہ سے فرمایا کہ اس کتاب کو زمانے کے ظالم ہاتھوں سے محفوظ رکھا جائے۔اس کے علاوہ اس شخص کے حق میں ایمان کامل کی دعا فرمائی جو اس کتاب کا مطالعہ کرے۔خواجہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ خود لکھتے ہیں:

"چون این نسخہ۔۔۔۔۔۔۔۔در حال※ حیاتی آنحضرت مخدوم مدظلہ ژ مرتب گشت※ وچون بعد از اتمام درنظر آنحضرت مخدوم گزرانیدم وبعضی از احوال کلام صوفی※ ودر بعضی اقوال تصوف ومسائل سلوک را مطالع※ کرد※ ۔فرمودند ک※ این نسخ※ از محو کردن باز دارید ودر این باب فاتح※ خیر از حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ حاصل نمود※ شد ک※ رک※ این نسخ※ را مطالع※ نماید و یا بخواند و یا در خان※ خود نگاہ دارد حق سبحانہ وتعالیٰ او را ورحفظ حمایت خود نگا※ داشت※ از دنیا با ایمان بس وی آخرت برآرد"

ترجمہ: جب حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں ہی یہ کتاب مرتب ہوئی

سبق اردو نومبر 2025
35

اور مکمل ہونے کے بعد کی کتاب کو حضرت کے سامنے لایا۔ انہوں نے صوفیوں کے کچھ کلام اور تصوف وسلوک کے مسائل کو پڑھا تو فرمایا کہ اس کتاب کو غائب ہونے سے بچانا اور اس بارے میں دعائیہ کلمات کہے کہ جو کوئی اس کتاب کو پڑھے یا پڑھائے یا گھر میں حفاظت سے رکھے تو اس کو خدائے پاک اپنی حفاظت اور امان میں رکھے اور اس کو دنیا سے ایمان کے ساتھ آخرت کی طرف لے جائے۔ حضرت خواجہ اسحاق قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں اپنے مرشد حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کے حالات قلمبند کرنے کے علاوہ تصوف وعرفان کے نکتوں کی وضاحت اور راہ سلوک کے مختلف مقامات پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مصنف نے حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اپنی عقیدت اور ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہونے کی وجہ بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں مصنف نے اپنی ابتدائی زندگی، خاندان، والدین اور اپنے برادر اکبر حضرت خواجہ حسن قاری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اطلاعات فراہم کی ہیں لہذا یہ باب مصنف کی نجی زندگی اور ان کا راہ سلوک اختیار کرنے کے بارے میں سب سے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ باب دوم طریقت، ریاضت اور عبادت کے بارے میں ہے۔ حضرت خواجہ اسحاق قاری رحمۃ اللہ علیہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ طریقت کے لیے شریعت کا پابند ہونا لازمی ہے۔ باب سیوم میں چالیس چلوں کے آداب اس طرح بیان کیے ہیں کہ ایک سالک کو اپنے ہاتھ کی کمائی پر گزر بسر کرنی چاہیے اور ایک کفن پہن لینی چاہیے تا کہ مرنے سے قبل ہی مرنے کی صورت بن جائے اور دل طاعات کی طرف راغب ہوجائے۔ موتو قبل ان تموتو

حضرت خواجہ اسحاق قاری رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری کا اندازہ واعظانہ اور ناصحانہ ہے۔ نماز کے متعلق بھی آپ کی طویل غزل کے چند اشعار ملاخطہ ہوں

نماز خلق تسبیح وسجود است
نماز عاشقان ترک وجود ت

عارفوں کی نماز کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔
نماز عارفان اندرن※ انت بول لامکان درحسین ج※ انت
اور معبود کا فرق مٹ جاتا ہے۔
نماز عارفان ترک نیاز ست
نماز واصلان درعین ج※ انت اور
ان اصلی روح پائی جاتی ہے۔
نماز اولیاء از حسین قلب است
نماز زا※ دان از روی نانست

چلے گزارنے والے سالک کو چاہیے کہ وہ اپنے چلوں کے بارے میں کسی کو مطلع نہ کرے۔ دوران چلہ کسی بھی مرد یا عورت کو نہ دیکھے اور نہ ہی کسی کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے۔ چوبیس گھنٹوں (دن رات) میں سات مرتبہ غسل کرتا رہے۔ کم از کم پانچ نمازوں سے قبل روزانہ غسل کرنا اپنے لیے فرض سمجھے۔ یہ باب چل چلتہ العارفین کتاب کا اصل مدعا و مقصد پیش کرتا ہے اور بڑا ہی اہم باب ہے۔ کتاب کا نام چل چلتہ العارفین بھی اسی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے، چل چہل کا مخفف ہے جسکو اردو میں چالیس کہتے ہیں اور چلہ بھی چہلہ کا مخفف ہے۔ چلہ سے مراد وہ چالیس دن ہیں جن میں گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت میں وقت گزارا جائے۔ اس طرح چل چلتہ العارفین کا مقصد سالکوں اور پرہیزی گاروں کے وہ چالیس چلے ہیں جو وہ تنہائی اور گوشہ نشینی میں رہ کر ریاضت وعبادت میں بسر کرتے ہیں۔ اس کو چل چلتہ کہتے ہیں۔ حضرت شیخ حمز※ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدین وخلفاء کو ان چالیس چلوں کے گزارنے کی تلقین کرتے تھے۔ اس طرح اس کتاب میں حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء کے حالات اور روحانی کمالات کے علاوہ چالیس چلوں کی کیفیت، آداب اور چلہ گزارنے کے مختلف طریقے درج ہیں۔ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر بڑی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ چل چلتہ کی دو قسمیں ہیں۔ پہلے چلتہ خلوت اور دوسرا چل چلتہ بازار۔ یہ دونوں چلے مقامی رنگ لیے ہوئے کشمیر میں رائج ہیں جب کہ کشمیر سے باہر سلسلہ سہروردیہ کے مشائخ میں یہ خلوت در انجمن" اور خلوت در بازار کے ناموں سے مشہور ہیں۔

باب چہارم تبدیل اخلاق اور نفس امارہ کو قابو کرنے کے بیان میں ہے۔ حضرت اسحاق قاری رحمۃ اللہ علیہ نفس امارہ کو قابو کرنے اور رضائے حق کو عاشقوں اور سالکوں کی عبادت کا نام دیتے ہیں۔ اصل مشرک تو کافر نفس ہی ہے لہذا نفس امارہ کے ساتھ جنگ لازمی ہے۔ جب سالک نفسانی خواہشات کو مغلوب کرتا ہے تو اس کے شہوانی اور شیطانی خواہشات کے بدلے رحمانی خیالات آتے ہیں اور نفس میں رحمان جلوہ گر ہوتا ہے۔ دنیاوی مال ومتاع کے ساتھ محبت کی اصل وجہ نفس امارہ کی خواہشات ہوتی ہیں۔ نفس امارہ انسان کو برے کاموں اور لذات کی طرف مائل کرتا ہے۔ نفس لوامہ انسان کو گناہ پر ملامت اور سرزنش کرتا ہے اور نفس مطمئنہ انسان کو نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے روبرو پاک وصاف ہو کر جانے کی ترغیب دیتا ہے۔

باب پنجم میں معرفت، طاعت اور عبادت کے متعلق عارفوں کے اقوال درج ہیں۔ حضرت خواجہ اسحاق قاری رحمۃ اللہ علیہ نماز کو معرفت حق کا پہلا زینہ قرار دیتے ہیں اور ریا کار زاہدوں اور عابدوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ کیونکہ نماز میں محو ہوتے ہوئے بھی ایسے عابدوں اور زاہدوں کے دلوں میں محبوب حقیقی جاگزین نہیں ہوتا کیونکہ ان کی عبادت دکھاوے کی ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کے مطابق عارف ہمیشہ معرفت حق حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور ان کا ہر لمحہ اور ہر لحظ نماز کا وقت ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ اللہ کے حضور میں محو ہوتے ہیں۔

باب ششم میں ان اذکار و افکار کا ذکر ہے جن کی تعلیم حضرت شیخ حمزہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مریدوں کو دی تھی۔ اس باب میں حضرت مخدوم رحمۃ

سبق اردو نومبر 2025

36

اللہ علیہ کے اذکار و بیعت کے طریقے بھی بیان کیے گئے ہیں۔خواجہ صاحب عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دیتے ہیں۔خواجہ صاحب کے مطابق استغراق کی حالت میں جب ایک سالک دریائے وحدت میں غوطہ زن ہو جاتا ہے تو اُسے ہر شئے میں خدا کی وحدت نظر آتی ہے اس طرح سے خواجہ صاحب ہمہ اوست یعنی وحدت الوجود کے فلسفہ کے قائل ہیں۔ باب ہفتم میں حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ اوران کے خلفاء کے کرامات ومقامات کا بیان ہے اور حضرت کی زندگی مبارک کے ایسے اور گوشوں کو بیان کیا گیا ہے جو حضرت بابا داؤ دخا کی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ورد المردین میں بھی نہیں ملتے ہیں۔

چل چلتہ العارفین کشمیر میں فارسی نثر کی کتابوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کے اکثر خلفاء نے اس کتاب کے زیر مطالعہ اپنی تصنیفات تحریر کیں۔اس کتاب کا اسلوب نگارش ساد ※، زبان سمجھی ہوئی اور آسان ہے۔چل چلتہ العارفین کو اس لحاظ سے بھی باقی تصنیفات سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس میں حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ اوران کے خلفاء کے عینی مشاہدات حالات اور روحانی کمالات کے علاوہ چالیس چلوں کی کیفیت اور آداب درج ہیں جو کسی اور تصنیف میں اتنی وضاحت اور شرح وبسط کے ساتھ نہیں ہے۔کبھی کبھی مصنف نے مطالب کی وضاحت کے لیے فارسی کے بڑے شعراء مثلاً عطار، سنائی، حافظ شیرازی، جامی وغیرہ کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے۔طریقت اور راہ سلوک پر مفصل روشنی ڈالنے کے علاوہ اس کتاب میں مصنف نے اپنے بعض معاصر عارفوں اور صوفیوں کے احول اور کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔چل چلتہ العارفین میں حضرت خواجہ اسحاق قاری رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار پڑھ کر دل مسرت وعقیدت سے جھوم جاتا ہے اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کو شعر وشاعری کا بھی ذوق تھا۔اپنے پیر طریقت حضرت مخدوم رحمۃ اللہ کی مدح میں ایک منقبت کے چند اشعار ملاخطہ ہوں

بر عاشقان داغ جبین　　　چوں شیخ حمزہ پیر ما
بر عارفان فخر مبین　　　چون شیخ حمزہ پیر ما

اس کے علاوہ اور بھی شعر ہیں جیسے

روشن بخاتم چون نگین در آسمان وہم زمین
براولیاء عالمین چون شیخ حمزہ پیر ما
حیران ملک حیران فلک حیران زمین حیران زمان
ازقربت شیخی چنین چون شیخ حمزہ پیر ما
شمس الضحیٰ نور الھدی بدر الدجیٰ صدر العلیٰ
مہ بردرش سرزمین چون شیخ حمزہ پیر ما

خواجہ صاحب کے معاصرین میں سے حیدر تلہ ملی اور بابا حیدر کے علاوہ بہت سارے معاصرین نے لکھا ہے جیسا کہ بابا حیدر یوں رقمطراز ہیں

''خواجہ اسحاق قاری درنسخہ چلچلتہ العارفین مذکورہ کردہ است کہ مذکر را با این ذکر
شغل گیرد''

یہ کتاب اڑھایئ مہینے کے قلیل عرصے میں مکمل ہوئی چنانچہ خواجہ صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ

''وآنچہ درچشم من حقیر وبگوش این فقیر درآمدہ خواستم کہ آن را
بجمع بآورم وبنوعی کہ پسند خاطر یاران تربیت بدھم از کثرت اشغال
وازقلت فرصت دراندک مدت قریب دونیم ماہ ین نسخہ را شروع
کردہ وبہ اتمام رسانید ۵۔''

خاتمہ:

القصہ چلچلتہ العارفین تصوف اور عرفان کے اسرار و رموز کا بیش قیمتی خزانہ ہے۔اس کے علاوہ یہ کشمیر میں چک دور کے صوفیاء کا ایک اہم تزکرہ بھی ہے۔خواجہ اسحاق قاری کا درجہ اولیاء کشمیر میں بہت بلند ہے وہ نہ فقط صاحب حال صوفی تھے بلکہ صاحب قال عارف بھی تھے۔ان کی اس کتاب کے نثر اور نظم دوں وں پر صوفیانہ رنگ غالب ہے۔خواجہ اسحاق قاری کی اس کتاب سے ان کے معاصرین نے کافی کچھ حاصل کیا اور اپنی تصانیف میں حوالے کے طور پر بھی لکھا ہے۔صوفیاء سلسلہ سہروردیہ　کا طریقہ اور صوفیاء کے مفصلاً حالات کتاب ھذا مین درج ہیں۔

مناںع وماخذ

۱۔حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کے علماء کی علمی خدمات از پروفیسر ڈاکٹر عنایت اللہ بابا طبع شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران　کتب مدینہ چوک گاؤ کدل سرینگرص،۵۹　سال اشاعت ۲۰۱۲
۲۔ایضاً ،ص ۶۲
۳۔ھفت گنج سلطانی ازمحمد صدیق نیاز مند طبع جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی، سال اشاعت　۱۹۹۴،ص ۱۹۳۔ ۱۹۴
۴۔حیات حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کشمیری (اردو ترجمہ دستور السالکین)مترجم قاری سیف الدین ،مطبوعہ سرینگر　۱۹۸۴　،ص ۱۷۰
۵۔دستور السالکین شرح ورد المریدین محطوطات نمبرات ۱۵۱، ۱۹۲　کلچرل اکیدمی سرینگر۔

خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں عناصر تصوف

محمد جمال احمد
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو
ڈی۔سی۔ایس۔کے۔پی۔جی، کالج، مئو
ویر بہادر سنگھ پوروانچل یونیورسٹی، جون پور

خواجہ میر دردؔ کا شمار اردو کے ان بڑے شعراء میں ہوتا ہے جن کی شاعری میں سب سے زیادہ تصوف کے عناصر پائے جاتے ہیں ۔ وہ ایک صوفی بھی ہیں اور شاعر بھی ،ان کے نثری کارنامے فارسی میں ہیں اور وہ تصوف کی منزل میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔انہوں نے اردو شاعری میں اگر چہ بہت مختصر سرمایہ چھوڑا مگر وہ کیفیت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں کسی طرح کم نہیں ۔خواجہ میر دردؔ نہ صرف خود صوفی بزرگ اور شاعر تھے بلکہ ان کے والد خواجہ ناصر عندلیبؔ بھی صوفی اور شاعر تھے۔

خواجہ میر نام، دردؔ تخلص تھا۔اپنے تخلص کے بارے میں خواجہ میر دردؔ نے بتایا ہے کہ ان کے والد خواجہ ناصر کا تخلص عندلیبؔ تھا جو انہوں نے اپنے پیر صحبت شاہ سعد اللہ گلشنؔ کے تخلص کی مناسبت سے رکھا تھا جیسے شاہ گلشنؔ نے اپنا تخلص اپنے مرشد شاہ گلؔ کی مناسبت سے رکھا۔خواجہ میر دردؔ نے اپنے مرشد یعنی اپنے والد کے تخلص عندلیبؔ کی رعایت سے اپنا تخلص دردؔ رکھا ۔گیارہ واسطوں سے ان کا نسب خواجہ بہاء الدین نقش بند اور پچیس واسطوں سے امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے ۔خواجہ میر دردؔ (۱۱۳۳ھ/۲۱۔۱۷۲۰ء) میں دہلی میں پیدا ہوئے اور والد کی آغوش تربیت میں پرورش پائی تمام تذکرہ نگار یہی لکھتے ہیں کہ خواجہ میر دردؔ نے جملہ علوم رسمیہ اپنے والد سے ہی حاصل کیے ۔البتہ مولوی کریم الدین اور قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ خواجہ میر دردؔ نے مثنوی مولانا روم کے لیے زانوئے تلمذ مفتی دولت کے سامنے تہ کیا اور بقول ناصر نذیر فراقؔ فارسی کے لیے سراج الدین خان آرزوؔ کی صحبت اختیار کی ۔علوم وفنون میں طاق تھے ۔علوم قرآن ،تفسیر، حدیث ،فقہ، اصول فقہ، موسیقی ،تصوف وسلوک میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔

درویشانہ تعلیم نے خواجہ میر دردؔ کو تصوف کے رنگ میں رنگ دیا ،اپنے والد خواجہ ناصر عندلیبؔ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور اٹھائیس سال کی عمر میں دنیا سے عین جوانی کے عالم میں منہ موڑ لیا۔والد محترم کے وصال کے بعد فقر وتصوف کی مسند پر بیٹھ گئے ۔خواجہ میر دردؔ کا زمانہ بڑے حوادث کا زمانہ تھا۔اس زمانے کی ہلاکت خیزیوں کے سامنے بڑے بڑے ثابت قدموں کے پاؤں اکھڑ گئے مگر میر دردؔ کے پایہ استقلال میں جنبش تک نہ ہوئی ،اللہ پر توکل رکھا اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا اس پر اپنی وفات تک بیٹھے رہے اور ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں وفات کے بعد دہلی میں ہی آسودہ خاک ہوئے۔

خواجہ میر دردؔ نے جس طرح مضامین معرفت وسلوک وتصوف کو شاعری میں سمویا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں تو کم سے کم نہیں مل سکتی ۔ان کا اردو کلام حافظ کے دیوان کی طرح سراپا انتخاب ہی نہیں بلکہ بادۂ معرفت سے بھی اسی طرح لبریز ہے ۔دردؔ نے تصوف کے حالات وواردات کو جامۂ شعر پہنانے میں ہر جگہ احتیاط سے کام لیا ہے وہ کبھی اپنی زبان مجذوبوں اور مغضوب الحال صوفیا کی طرح آلودۂ کلمات بے ادبانہ نہیں ہونے دیتے۔یہ ضبط واحتیاط اسی لیے ہے کہ دردؔ نے تصوف کو صرف شاعری کے لیے اختیار نہیں کیا تھا بلکہ وہ سالکان راہ کے قافلۂ سالار بھی تھے ؎

ہوں قافلہ سالار طریق قدما دردؔ
جوں نقش قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

دردؔ کی صوفیانہ شاعری ایک باعمل اور نظریہ ساز صوفی کی باطنی بصیرت کی عکاسی کرتی ہے یہ شاعری اس کے قلب ونظر پر گزرنے والے مشاہدات اور کشف کی حالتوں پر مشتمل ہے۔دردؔ کی صوفیانہ شاعری عقل وفہم کی سطحوں پر متاثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔یہ شاعری صوفیانہ مسائل کی توضیح وتشریح اور تعبیر کا سامان مہیا کرتی ہے ۔تصوف کے بے شمار اہم مسائل جو دردؔ کے مشاہدے کا نتیجہ تھے، تخلیقی سطح پر ان کی شاعری میں ظہور پاتے ہیں ۔انسان، خدا اور کائنات کے بارے میں ان کے ہاں تصورات کی ایک وسیع دنیا آباد تھی ۔وہ ایک سچے صوفی کے طور پر صوفیانہ تجربات کی ان منزلوں سے گزرے تھے جو حیرت ،انابت ،توکل ،فنا ،محویت ،رضا ،وحدت ،مشاہدہ حق ،استغنا اور معارف الٰہی کے نام سے تعبیر کی جاتی ہیں ۔ان کی جملہ تصنیفات اور شاعری میں ان تمام منزلوں کے مشاہدات موجود ہیں۔

خواجہ میر دردؔ نے اپنی غزلوں کو تصوف کے تمام مسائل ومباحث سے آشنا کر دیا ہے ۔عرفان ومعرفت کی راہوں میں جتنی منزلیں آتی ہیں اور ان منزلوں سے ہم کنار ہونے میں صوفی کو جن حالات سے گزرنا پڑتا ہے خواجہ میر دردؔ نے ان سب کو اپنی غزلوں میں سمو دیا ہے ۔خواجہ میر دردؔ کے اشعار تصوف کے اہم اور بنیادی معاملات ومسائل کے ترجمان وعکاس ہیں ۔یہاں چند اہم عناصر تصوف ذکر کیے جاتے ہیں جو خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود:

خواجہ میر دردؔ اپنی تصانیف اور شاعری میں جا بجا نظریہ وحدت

سبق اردو نومبر 2025

38

الوجوداور وحدت الشہود کی وضاحت فرماتے ہیں ان کے بعض اشعار وحدت الوجود کی ترجمانی کرتے ہیں اور بعض اشعار وحدت الشہود کی اور بعض اشعار سے دونوں کے مطالب اخذ کیے جاسکتے ہیں ۔

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا، واں بھی شہود تیرا
جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ
خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینے کے سامنے جب آ کے ہو کریں
تیرا ہی حسن جگ میں ہر چند موجزن ہے
تس پر بھی تشنہ کام دیدار ہیں تو ہم ہیں
متفق آپس میں ہیں اہل شہود
دردؔ آنکھیں دیکھ باہم ایک ہیں
وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیے
پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیے

عظمت انسانی:

معرفت رب کے لیے صوفیائے کرام اور ہادیان اسلام نے شروع ہی سے معرفت نفس کو زینہ قرار دیا ہے ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' انسان اور اس کے نفس و دل کی حقیقت کو سمجھے بغیر معرفت رب حاصل نہیں ہوسکتی ۔صوفیائے وجود یہ کے نزدیک انسان مرتبہ جامعہ اور صفات ربانی ہے ۔اسی لیے نفس کی معرفت رب کی معرفت ہے صوفیا نے انسان کی عظمت پر اسی لیے زور دیا ہے وہ انسان کو وجہ تخلیق کائنات سمجھتے ہیں ۔خواجہ میر دردؔ نے اپنی شاعری میں انسانی عظمت کے گیت گائے ہیں اور انسان کے وجود کو اس کائنات میں شاہ گردانا ہے جس کے بغیر اس کائنات رنگا رنگ میں رنگ و بو باقی نہیں رہ سکتا نمونہ کے طور پر چند اشعار دیکھیں ۔

اے دردؔ مثل آئینہ ڈھونڈ اس کو آپ میں
بیرون در تو اپنی قدم گاہ ہی نہیں
احوال دو عالم ہے میرے دل پر ہویدا
سمجھا نہیں تا حال پر اپنے تئیں کیا ہوں
مرے دل کو جو تو ہر دم بھلا ٹٹولے ہے
تصور کے سوا تیرے بتا تو اس میں کیا نکلا
نظر جب دل پہ پڑی دیکھا تو مسجود خلائق ہے
کوئی کعبہ سمجھتا ہے کوئی سمجھے ہے بت خانہ
جلوہ تو ہر ایک طرح کا ہر شان میں دیکھا
جو کچھ کہ سنا تجھ میں سو انسان دیکھا
باوجود یکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا
انسان کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل یاں
بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں
باغ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں
گر یار ہیں تو ہم ہیں اغیار ہیں تو ہم ہیں
دریائے معرفت کے دیکھا تو ہم ہیں ساحل
گر وار ہیں تو ہم ہیں اور پار ہیں تو ہم ہیں

صفائے قلب:

معرفت نفس و رب کے لیے تزکیہ نفس و صفائی قلب شرط اول ہے۔خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں قلب کی صفائی اور تزکیہ نفس سے متعلق بہت سے اشعار ملتے ہیں ۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

دردؔ نور خودشناسی در صفائے سینہ ہیں
روئے خود خواہی کہ بینی رو دریں آئینہ بیں
دوستی ما نباشد در دل اہل نفاق
جائے ما صافی دلاں در خاطر بے کینہ
ہے مظہر انوار صفا میری کدورت
ہر چند کہ آہن ہوں پہ آئینہ بنا ہوں
مثال عکس جو کوئی کہ پاک طینت ہے
جہاں صفا ہے وہیں بود و باش کرتے ہیں

عشق حقیقی:

صفائی قلب عشق حقیقی سے پیدا ہوتی ہے۔نسبت عشق میں حضور و شہود کو دوام ہو جائے تو قلب میں غیر اللہ کے لیے گنجائش نہیں رہتی اور دل کی انجمن آرائیاں خلوت خدا بن جاتی ہیں ۔عشق دو عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے اور اگر یہی عشق حقیقی ہو تو اس کا اقتضاء یہ ہوگا کہ محبوب جو وحدہ لاشریک ہے اس کے خلوت کدے میں بھی کوئی اور شریک نہ ہو ۔دل آرزوؤں، حسرتوں، تمناؤں، مرادوں ،خوشیوں اور غموں سے پاک ہو ۔کائنات کی طرف سے آنکھیں بند ہو جائیں اور لو اسی ذات واحد سے لگی رہے ۔

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آ گیا
تو چاہے نہ چاہے مجھے کچھ کام نہیں ہے
آزاد ہوں اس سے بھی گرفتار ہوں تیرا
اے دردؔ چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذب عشق

سبق اردو نومبر 2025

39

کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگ کاہ کا
درد کی طرح وہ ہوجاتے ہیں کچھ اور کے اور
تیرے از خود شدگاں جبکہ بخود آتے ہیں

بے اعتباری دنیا:

بے اعتباری و بے ثباتی دنیا کے موضوع پر صوفی شعراء نے بہت کچھ لکھا ہے اسی لیے عام طور پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ صوفیا بے ثباتی دنیا پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ ان کی تعلیم ترک دنیا کے مترادف ہوجاتی ہے حالانکہ اگر صوفیا کی تعلیمات پر نظر رکھی جائے تو یہ اعتراض خود بخود درفع ہوجاتا ہے۔ خود خواجہ میر دردؔ کے درج ذیل بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جاہ وحشم دنیا کو بے اعتبار سمجھتے ہیں:

''جاہ وحشم دنیا اعتبارے ندارد وملائی و پارسائی نیز جز اعتذاری نہ دارد''۔ خاص طور پر اس عہد میں جب میر دردؔ نے دنیا اور اس کے جاہ وحشم کو دیکھا افراتفری کا بازار گرم تھا بڑے بڑے امراء ورؤساء حتی کہ سلاطین بھی اشراف گردی کا شکار ہورہے تھے۔ اگر ان حالات میں میر دردؔ نے دنیا اور اس کے جاہ وحشم کو بے اعتبار گردانا تو یہ حالات کا لازمی نتیجہ تھا۔ انسانی زندگی کا اختصار، مادی حسن کی کوتاہ عمری، حکومت دنیا کی بے ثباتی پر میر دردؔ نے رسائل اربعہ میں متعدد مقامات پر نثر ونظم میں لکھا ہے۔ اردو دیوان میں بھی ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں ان اشعار کا مقصد یہ ہے کہ نظر دنیا ہی میں نہ الجھی رہے بلکہ وہ اس حقیقت سے واقف ہو کر اس کی طرف دیکھے جس کو ثبات و دوام حاصل ہے۔ اور جس کا اعتبار ہی دراصل اعتبار ہے باقی وہم وگمان ہے ۔

مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا
میں اپنا درد دل چاہا کہوں جس پاس عالم میں
بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا
آیا نہ اعتدال پر ہرگز مزاج دہر
میں گرچہ گرم وسرد زمانہ سمو گیا
جلتا ہے اب پڑا خس وخاشاک میں ملا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

توکل وفقر ودرویشی:

''درویشی کہ پیشہ انبیاء واولیاء است علیھم السلام عجیب پیشہٗ شریفی است، اگر بے اندیشہ دنیا واہل دنیا گزران کردہ شود و بے دغدغہ فکر قوت زندگی بسر نمودہ آید وغنائے دلی وترک حقیقی حاصل بود وگرنہ پیش از تیشہ بہ پائے خود زدن وخود را رسوا کردن نیست مردی باید تا ایں مسند بیاراید''

آساں مداں بفقر چنیں مانشستہ ایم
از سر گزشتہ ایم کہ از پا نشستہ ایم

درویشی کی تعریف کرتے ہوئے میر دردؔ نے حقیقی درویش اور نقلی درویش کا فرق بھی بتا دیا ہے اگر درویشی دلق ریائی ہے اور حصول دنیا کا ذریعہ تو وہ رسوائی ہے۔ درویش کو تو اپنے سر سے گزر کر پاؤں توڑ کر اہل دنیا سے بے تعلق ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے جو آسان کام نہیں ۔

شاہ وگدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں
نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا
آزاد کسی کی بھی اٹھاتے نہیں منت
دیکھا نہ کسی سرو کو تہ بار شجر کا
نہیں مذکور شاہاں دردؔ ہرگز اپنی مجلس میں
کبھو کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادھم کا
اگر جمعیت دل ہے تجھے منظور قانع ہو
کہ اہل حرص کے کب کام خاطر خواہ ہوتے ہیں
نہ ہم کچھ آپ طلب نے تلاش کرتے ہیں
جو کچھ کہ یاں ہے مقدر تلاش کرتے ہیں
ہمت رفیق ہووے تو فقر سلطنت ہے
آتا ہے ہاتھ یعنی یہ تخت دل کے ہاتھوں
نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو
الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضی الٰہی ہو
زنہار ادھر لیو مت چشم حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے

خلوت در انجمن:

خلق سے یہی بے نیازی صوفی کو خلق میں رہ کر خلق سے الگ کر دیتی ہے۔ وہ انسانوں میں رہتا ہے مگر اس کا دل خالق حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ صوفیائے نقش بندیہ کی مصطلحات میں اس کیفیت ومعرفت کو خلوت در انجمن کہا جاتا ہے ۔

خلق میں ہیں پھر جدا سب خلق سے رہتے ہیں ہم
تال کی گنتی سے باہر جس طرح رو پک میں سم
آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز
ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں میں
خلوت دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل
حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبال گوش ہے

سفر در وطن:

سلسلہ نقش بندیہ کے خواجگان کی دوسری اہم اصطلاح جس پر

دردؔ نے خاص توجہ دی ہے اور جسے اپنی شاعری کا جا بجا موضوع بنایا ہے ''سفر در وطن'' ہے چند اشعار بلاحظہ کیجیے ؎

مادام کہ اے دردؔ دریں انجمنم
ہر چند کہ محبوس بہ فانوس تنم
در راہ فنا دمی زیانہ نشینم
چوں شمع ز بس گرم سفر در وطنم
بود چوں نور نظر دردؔ را سفر بوطن
بخانہ ماند مدام و گہی بخانہ نماند
از گردش زمانہ نیاسودہ ام کہ ہست
مثل فلک مدام سفر در وطن مرا
آپ سے ہم گزر گئے کب کے
کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا
مانند فلک دل متوطن ہے سفر کا
معلوم نہیں اس کا ارادہ ہے کدھر کا
اے بے خبر تو آپ سے غافل نہ بیٹھ رہ
جوں شعلہ یاں ہمیشہ سفر ہے وطن کے بیچ
وہ زخود رفتہ ہوں کہ میرے تئیں
نہ خیال سفر نہ یاد وطن

خواجہ میر دردؔ نے کثرت سے اپنی شاعری میں صوفیانہ تصورات واصطلاحات بیان کی ہیں۔مثلاً حقیقت ومجاز، عشق وعقل، قلب ونظر، ذکر جلی وخفی ،دل زندہ ودل مردہ، جبر واختیار، خلوت در انجمن ،سفر در وطن ،فنا فی اللہ، جزو کل ،مکان لا مکان ،فنا وبقا، بے ثباتی و بے اعتباری ،عینیت ، وجود وانا، خودی، وحدت وکثرت ،توکل وفقر وغیرہ چند شعر دیکھیے ؎

ارض وسما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
موجود پوچھتا ہی نہیں کوئی کسی کے تئیں
توحید بھی تو ہوتی نہیں ہے عیاں ہنوز
وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر ہے وگر قدر
مجبور ہیں تو ہم ہیں مختار ہیں تو ہم ہیں
اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوح مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

خواجہ میر دردؔ زندگی بھر تصوف اور اس کے مسائل پر غور وفکر کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ ان کی صوفیانہ شاعری میں مضامین کا تنوع ہے۔ان کی دنیا تصوف اور درویشی تھی اس لیے انہوں نے تصوف کے بہت سے مسائل ومعاملات کو تجربات، واردات وکیفیات کا روپ دیا ہے اور غور کرنے پر ان کی شاعری میں مسائل تصوف کی تہیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔خواجہ میر دردؔ کی شاعری ایسے پر اثر انداز میں صوفیانہ عناصر وتصورات کا اظہار کرتی ہے کہ دردؔ اور تصوف ایک ہو جاتے ہیں اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

ماخذ:

۱۔خواجہ میر دردؔ، دیوان دردؔ اردو، مطبع نظامی، بدایوں، ۱۹۲۲ء
۲۔خواجہ میر دردؔ، دیوان درد فارسی، مطبع انصاری، دہلی، ۱۳۰۹ھ
۳۔خواجہ میر دردؔ، شمع محفل، مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۸۹۳ء
۴۔خواجہ میر دردؔ، نالۂ درد، ادارۂ ادب وتنقید، لاہور، ۱۹۸۰ء
۵۔خواجہ میر دردؔ، علم الکتاب، مطبع انصاری، دہلی، ۱۳۰۸ھ
۶۔میرزا علی لطف ،تذکرہ گلشن ہند، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،نئی دہلی، ۲۰۰۵ء
۷۔محمد قیام الدین قائمؔ چاندپوری، تذکرہ مخزن نکات، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۱۰ء
۸۔میر تقی میرؔ، تذکرہ نکات الشعراء، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۲۰۰۳ء
۹۔مولانا عبدالحی، گل رعنا، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
۱۰۔ڈاکٹر وحید اختر۔خواجہ میر دردؔ تصوف اور شاعری، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۷۱ء
۱۱۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری ،اردو ادب کی تاریخ، ایم ۔آر پبلی کیشنز ،نئی دہلی ،۲۰۲۰ء
۱۲۔ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۹ء
۱۳۔ڈاکٹر نفیس اقبال ،اردو شاعری میں تصوف میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے عہد میں، دارالاشاعت مصطفائی، دہلی، ۲۰۱۸ء
۱۴۔ڈاکٹر رضا حیدر، اردو شاعری میں تصوف اور روحانی اقدار، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۷ء

Mohammad Jamal Ahmad
Research Scholar
Dept. Of Urdu
D.C.S.K. P.G. College, Mau
V.B.S. Purvanchal, University, Jaunpur

سبق اردو نومبر 2025

41

اصغر گونڈوی کی شاعری میں صوفیانہ عناصر

منظور احمد گنائی

شیخ العالم سنٹر فار ملٹی دسپلنری سٹڈیز، یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر، حضرت بل

Literature and mysticism are deeply inte-connected in the world . there is also inter-depadancebetween poetry and mysticism. That is why particularly Ghazal poets have assaigned a prominent stature to the mysticism in their poetry . The name of AsgerGondvi is also among those poets who gave vital impartance to mysticism in their work . In this research paper the researcher has done the detailed analysis of Tasawuff regarding to Asger gondvi,s poetry

Key words: Asger Gondvi poetry mysticism,Ghazal

کلیدی الفاظ: اصغر گونڈوی، شاعری، تصوف، غزل

تصوف کی بنیاد روحانیت پر قایم ہے۔ لفظ تصوف اپنے دامن میں ایک ایسی صداقت اور کو سمیٹے ہوے ہے جس سے کسی طور علحید گی ممکن نہیں۔ یہ ہر زمانے میں سرگرم عمل رہا ہے۔ خاص کر ایسے وقتوں میں اس کی ضرورت زیادہ محسوسکی گی جب انسان انسانیت کے جامے سے باہر نکل گیا۔ تصوف ایک ایسا صراط مستقیم ہے جس پر چل کر انسان دنیاوی جھمیلوں سے بے نیاز ہوکر اپنے رب سے لو لگا تا ہے اور اسے طمانیتقلب نصیب ہو جاتی ہے۔ اسکے زریعے خود آ گہیا ور خدا شناسیکی منزل تک بہ آسانی پہنچا جا سکتا ہے۔ حیات اور کا ینات کے تمام اسرار و رموز اسی علم کے ذریعے کھلتے ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ الاسلام زکریا انصاری کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ:۔

※※ تصوف ایک علم ہے جس سے نفوس کی پا کی، اخلاق کی صفاییا ور ظاہر و باطن کی آبادیو آرستگی کے احوال معلوم ہوتے ہیں اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے ※※ (شرح الرسالتہ القشیریہ، جلد، اول، ۶۹ ص)

علما کے ان اقتباسات سے بھی تصوف کے رموز ونکات مزید افشاء ہوتے ہیں ۔

※※ تصوف صفایی قلب، صفایی باطن وتعمیر ظاہر و باطن کا ہے ※※ (امام قیشری)

※※ تصوف یہ ہے کہ حق تجھے تیری وجود سے فنا کر کے اپنے ذریعہ سے بقا عطا فرمایے ※※ (حضرت جنید بغدادی)

تصوف ایک خدا کا و ماننا اور اس کی اتباع کرنا اور اس کے بتایے ہویے فرمودات پر چلنا زندگی کے تمام معاملات اسی کے مطابق چلانا ہر وقت ذکر خدا میں رہنا، خدا کی خوشنودی کے لیے اپنی تمام آسائشوں کو قربان کرنا، اپنے نفس کو گندگیوں سے پاک رکھنا اور اگر باطن نفس امارہ سے اثر انداز ہوا ہو، دنیاوی معاملات سے بے رغبتی کا خوایاں ہو تو تذکیہ نفس اختیار کر کے ایک تو اپنے آپ کو باطنی خباثت سے پاک کرے اور معرفت میں اضافہ کر کے اپنے کو نور الٰہی اور پیام حق سے اپنے وجود کو معطر کرے ارو اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی نفع بخش ثابت ہو اور ذکر و فکر سے کبھی غافل نہ رہے دنیاوی زندگی کے بجایے اخروی زندگی کو ترجیح دینا اور اس دائمی زندگی کے لیے ہمارے دل میں محبت پیدا کرنا اسے تصوف کہتے ہیں اظہر اللغات میں اس طرح تصوف کی تعریف کچھ اس انداز سے درج ہے:۔

دل کو خواہشات سے پاک کرنا، معرفت نفس، تزکیہ نفس کا قایدہ اور اپنا دھیان خدا کی طرف پھیرنا تصوف کہلاتا ہے۔

اس لیے جب انسان اپنی خواہشات کو اللہ کی خوشنودی و رضا کے لیے قربان کردے اور اپنا جان و مال دین اسلام کے لیے وقف کردے اور اپنے آپ کو دنیاوی آلایش وحرص سے پاک رکھیے، دنیاوی چیزوں کا حصول اپنی زندگی کا بنیادی مقصد نہ بنایے اور ان کے لیے اپنا شب و روز وقف نہ کرے بلکہ اپنا وقت ذکر خدا میں گزارے اور اسمایے اعظم کو ورد زبان قرار دیے جو انسان کو ابدی حیات کا باعث بنتے ہیں اصل میں وہی انسان زندہ کہلاتے ہیں جو ذکر و فکر رب میں محو ہوتے ہیں اس بات کی تصدیق قران کریم سے بھی ہوتی ہے کہ زندہ انسان وہی ہے جس کا قلب ذکر خدا کا مرکز ہو عرفان میں اس کو تصوف کہتے ہیں اور جو اس تصور کا حامل ہوا اور اسیٔ نظرۂ کے مطابق زندگیٔ گزارے تو اس انسان کو صوفیٔ

سبق اردو نومبر 2025
42

کہتے ہیں۔ ادب اور تصوف کا جہاں چولی دامن کا ساتھ ہے وہاں شاعری نے بھی ہر دور میں تصوف کو بھی اپنے دامن میں سمویا ہے۔ خاص طور پر غزل گوشعراء نے اپنے افکار اور خیالات کو جامع انداز میں بیان کرنے کے لیے تصوف کا سہارا لیا۔ کیونکہ زمانہ قدیم سے غزل گوشعراء نے اپنے جذبات اور افکار کو عوام وخواص تک پہنچانے کے لیے غزل کو وسیلہ بنایا۔ غزل اپنے اندر دنیا جہاں کے مضامیں کو جذب کرنے کی منفرد صلاحیت رکھتی ہے۔ وہاں اس نے تصوف کو قبول عام بخشا۔ کیونکہ کاسکی دور میں تصوف اور شاعری ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم سمجھے جاتے ہیں اس لیے جہاں غزل گوشعراء نے تصوف کو اپنے اشعار خاص طور پر غزل میں صوفیانہ مضامین کو بیان کیا ان شعراء میں اصغر گونڈوی کا نام اہم ہے۔

اصغر گونڈوی اردو ادب کا ایک اہم نام ہیں یوں تو انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی موضوعات کے ساتھ کیا جن میں انہوں نے اپنی دلی کیفیات، احساسات وجذبات اور خیالات بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیے لیکن جلدی ہی انہوں نے شراب کی ایک محفل میں اپنے دوستوں سے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج سے میں شراب سے توبہ کرتا ہوں اس طرح اس کی زندگی میں انقلاب آ جاتا ہے اور وہ سلسلہ چستیہ میں شامل ہو کر عبدلاالغنی منگلوری کے ہاتھ پر بعیت کرتا ہے اور ان سے باضابطہ درس لینا شروع کر دیتا ہے اس طرح وہ تصوف کی منزلوں کو طے کرتا گیا۔ اصغر صرف رسمی صوفی نہیں وہ بلکہ صوفی باعمل تھا انہوں جن صوفیانہ عناصر کا اپنی شاعری میں اظہار خیال کیا ہے وہ ان سب معاملات سے گزرے، ان سب چیزوں کا experience کیا اور ان کا قریب سے مشاہدہ بھی کیا پھر انہوں نے ان خیالات کو زبان دی۔ اصغر صاحب سلسلہ چستیہ سے وابستہ رہ کر روحانی منزلوں کو بڑے احسن طریقے سے طے کرتے ہیں اور وہ تصوف کی اعلیٰ منزل پر فائز ہوتے ہیں جس کا اعتراف اس کے معنوی استاد عبدالغنی منگلوری بھی کرتے ہیں اور وہ جگر مرادآبادی کو مشورہ دیتے ہو※ کہتے تھے کہ ”آصغر کا کہا مانا کرو“ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اصغر صاحب غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے اور وہ صرف صوفی ہی نہیں تھے بلکہ روحانی دنیا کے شناور اور صاحب اسرار تھے آصغر گونڈوی کا اصل نام اصغر حسین آپ کی پیدائش 1884 کے محلہ الٰہی باغ میں ” چاند سورج کے مکان“ میں ہوئی یہی وجہ ہے وہ آج آسمان شاعری پر چاند سورج بن کر چمک رہے ہیں آپ کی ولادت میں اختلاف ہے (گونڈہ اور گورکھپور) لیکن خط سے ثابت ہوتا ہے (سلام سندلوی مولوی محمد سراج الحق مچھلی شہری کو خط لکھتے ہیں (شاگرد رشید) جس میں وہ استفسار کرتا ہے کہ اصغر کی پیدائش کے بارے میں کرتے ہیں وہ جواب میں لکھتے ہیں ”استاذی حضرت اصغر گونڈوی کے متعلق مجھے یہی معلوم ہے کہ وہ گورکھپور میں پیدا ہوئے (تصوف اور اصغر گونڈوی ص 359) آپ کے والد کا نام منشی تفضّل حسین تھا وہ گونڈہ میں صدر قانون گو کی حثیت سے کام کرتے تھے وہ عربی اور فارسی میں بہت اچھی استعداد رکھتے تھے اور مذہب کا بھی شغف رکھتے تھے وہ قدیم تہذہب وتمدن کا ایک اعلیٰ پایے کے عالم تھے۔ اصغر کی ابتدائی تعلیم عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی اس کے بعد انہوں نے اسکول سے انگریزی بھی پڑھی اس کو مزید بہتر کرنے میں دوستوں نے بھی مدد کی۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھے اور ان کا حافظہ بہت قوی تھا اس لیے والد نے ان کو مزید حصول تعلیم کے لیے انگریزی پڑھنے کے لیے بھیجا لیکن وہ انٹرنس کا امتحان پاس نہ کر سکے اسی لیے والد نے ان کو آگے پڑھنے نہیں دیا ان کا مانا تھا اصغر نے انگریزی میں اچھی استعداد پیدا کر دی جو اس کی ملازمت کے لیے مناسب ہے اصغر کو حصول علم لا اتنا شاق تھا کہ انہوں نے دوران ملازمت بھی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا اور انگریزی میں مزید استعداد پیدا کرنے کے لیے انگریز آفیسر سے انگریزی زبان کو مزید بہتر کیا۔ اس کے بعد اصغر ریلوے میں بابوراج کی مدد سے ملازم ہو جاتے ہے اور آپس میں گہری دوستی پیدا ہوگی اب اصغر کا بابوراج کے پاس آنے جانے کا سلسلہ جاری ہع جاتا ہے اور آہستہ آہستہ شراب کے دور بھی شروع ہو جاتے ہیں اور اچانک اس میں تبدیلی آجاتی ہے اور وہ شراب سے ہمیشہ کے لیے توبہ کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ریلوے کی ملازمت کو بھی چوڑتا ہے اور اس کے بعد جگر کی مدد سے عینک بھیجنے کا کام کرتے ہیں اسی اثنا میں انہوں نے تصوف یا عرفان کو باضابطہ طور پر اپنی زندگی کا حصہ بنایا۔ عبدالغنی کی کے ہاتھ پر بعیت اور اس کی اتباع میں تصوف کے منزلوں کو طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور تصوف کے رازدار اور صاحب اسرار بن جاتے ہیں۔

اصغر گونڈوی کی شاعری کی ابتداء 1906 سے ہوئی ہے اور انہوں نے دو اساتذہ سے اپنے کلام پر اصلاح لی ڈاکٹر سید اعجاز کا قول ہے ہے کہ انہوں پہلے منشی جلیل احمد وجد بلگرامی سے اصلاح لی اس کے بعد اپنی غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دیکھائیں۔

اصغر کا دور اول جب وہ محبوب کی زلفوں میں اسیر اور مزے کے دن گزار رہے تھے یہ دور چھ سالوں پر مبنی تھا اس دور کے بارے میں لالا سری رام نے خمخانہ جاوید، جلد اول میں اصغر کی مختصر حیات کا ذکر کیا ہے۔

آپ کے چاہنے والے تو مرجاتے ہیں
اس پہ پھر آپ دعوائے مسیحائی ہے
باغ ہے، نہر ہے، حوریں ہیں مے کوثر ہے
واعظو! مان گیے کیا سخن آرائی ہے
اب دل بے حس میں کرتا ہی نہیں مطلق اثر
ساقی بدمست کا وہ غمزہ توبہ شکن
(تصوف اور اصغر گونڈوی ص 451 سے 453)

اصغر کا ابتدائی کلام کم پایا جاتا ہے اس کا ذکر احسان احمد ”نشاط روح“ کے دیپاچے میں کیا ہے ”کہ اصغر صاحب نے اپنی ایک بیاض جلا دی اور

کہا کہ یہ سب حذف ریزے ہیں" یہی سبب ہے اصغر صاحب کا دور اول کا کلام کم پایا جاتا ہے تاہم جو کچھ موجود ہے اگر اسے مختلف رسائل اور جرائد سے جمع کیا جائے تو اچھا خاصا مواد جمع ہوسکتا ہے۔

اصغر کی شاعری کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب انہوں نے شراب نوشی سے پوری طرح اجتناب کرنے کا عہد کیا اور پاکیزہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اس دور کے کلام میں تصوف اور معرفت کے عناصر ش دت کے ساتھ شامل ہوتے ہیں اور ان کا یہی کلام قابل قدر ہے۔

اصغر گونڈوی کی شاعری میں اہم پہلو تصوف ہے ۔ اصغر کے یہاں تصوف کے متعدد عناصر پایے جاتے ہیں اس سے ہم اصغر کو ایک صوفی شاعر کہہ سکتے ہیں مگر ان کا انداز یہاں شاعرانہ ہے اصغر کے یہاں فلسفہ"لاادریت" بھی دیکھنے کو ملتا ہے مثلہ

تمام دفتر الٹ گیا ہوں میں
مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں کیا ہوں میں
(اصغر گونڈوی اور تصوف ص458)

اصغر گونڈوی کی شاعری میں دوسرے صوفی شعراء کی طرح تمثیلی عرفانیت نہیں دیکھنے کو ملتی ہے اصغر اپنی صوفیانہ خیالات اور تصورات کا اظہار غزل کے ذریعہ کرتا ہے جس میں امکان ہی نہیں ہوتا ہے کہ بات کو مفصل انداز میں پیش کرے یا نظم کرے جبکہ دوسرے صوفی شعراء اپنے باطنی خیالات و کیفیات کو دوسرے اصناف میں مفصل انداز میں منظوم کرتے ہیں جن میں اس طرح کے امکانات پایے جاتے ہیں کہ روحانی کیفیات وتصورات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاے اصغر نے بھی باقی شعراء کی طرح اپنے صوفیانہ خیالات کی ترسیل کے لیے لفظ[شراب] کو وسیلہ بنایا
اس قسم کے شراب معرفت کے اشعار اصغر کے یہاں بہت پائے جاتے ہیں:

ساقیا جام بکف، پھر ہو ذرا گرم نوا
حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا دیکھیں
ہاتھ میں لے کے جام مے آج وہ مسکراتا
عقل کو سرد کیا، روح کو جگمگایا
غرق میں سب علم وحکمت، دین وایمان دیکھئے
کس طرح اٹھائے اک ساغر سے طوفاں دیکھئے
(اصغر گونڈوی اور تصوف ص449)

اصغر کی شاعری میں [فطرت] کے عناصر بھی پاے جاتے ہیں یہی عناصر ان کی شاعری میں متعدد مقامات پر پاے جاتے ہیں اس طرح انہوں نے اپنے صوفیانہ خیالات وتصورات کی عکاسی کے لیے فطرت سے مدد بھی لیتے ہیں:

موسم گل کیا ہے اک جوش ثبات کائنات
پھوٹ نکلا شاخ گل سے حسن عریاں دیکھئے
ردائے لالہ گل، پردہ مہ وانجم
جہاں جہاں وہ چھپتے ہیں عجیب آگ سے تعبیر کرتے ہیں
لالہ وگل تم نہیں ہو۔ ماہ انجم تم نہیں
رنگ محفل بن کے لیکن کون اس محفل میں ہے (ص460)

اس چمن میں آگ برسے گی کہ آیے گی بہار
اک لہو کی بوند کیوں ہنگامہ آرا دل میں ہے

اس کے علاوہ انہوں نے اس دنیا کو چمن سے تعبیر کیا ہے اور اس میں جو بھی رونق اور مختلف اقسام کے خوبصورت پھول پایے جاتے ہیں جو اس باغ کو معطر کرتے ہیں وہ کسی کی تدبیر سے نہں کھلتے ہیں وہ میرے محبوب کی مسکراہٹ سے کھلتے ہیں اور دیکھنے والوں کے دلوں میں ایک خوبصورت کیفیت پیدا کردیتے ہیں مثلا؛

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستان بنا دیا (ص460)

اصغر صاحب صوفیانہ خیالات کے مالک تھے ان کو اپنے رب پر کامل یقین تھا اور ان کا ماننا تھا کہ اللہ تعالی ہمارے لیے جو کرتا ہے اس میں ہمارے حق میں بہتری ہی ہوتی ہے اور ایک انسان کی فطرت ہے جب کسی چیز کے حصول میں جدوجہد کرتا ہے اگر وہ اس کو نہ ملے اس کو بڑی پریشانی اور مایوسی ہوتی ہے لیکن اصغر صاحب کا اس بارے میں مختلف خیال ہے کہ سعی بے حاصل کو حاصل سے بہتر سمجھتے ہیں:

اسی سے دل اسی سے زندگی دل سمجھتے ہیں
مگر حاصل سے بڑھ کر سعی بے حاصل سمجھتے ہیں

اصغر صاحب اس دنیا کو فانی سمجھتے ہیں اور یہاں جتنی بھی اشیا موجود ہیں ان کو ایک مخصوص وقت تک کے لیے تخلیق کیا گیا ہے اور اس کے بعد ان سب کو فنا ہونا ہے اور فانی چیز پر مرنا اور اس سے دل لگانا عقلمندی کی بات نہیں ہے بلکہ اسی ذات سے دل لگایا جایے جو ہمیشہ قائم اور باقی رہنی والی ہو

ذرہ ذرہ ہے یہاں کا رہ رو راہِ فنا
سامنے کی بات تھی جس کو نہ سمجھا تھا میں (ص461)

اصغر صاحب نے تصوف کے اظہار کے لیے [بادہ وساغر] کا بھی سہارا لیا اس کے متعلق اصغر کے چند اشعار:

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں
اف ڈبو دیا مجھے موج مے طہور میں

سبق اردو نومبر 2025
44

اس مجھے دکھادیا ساغر مے اچھا کر
آج بھی کچھ کمی نہیں چشمک برق طور میں
ساقی تری نگاہ کو پہچانتا ہوں میں
مجھ سے فریب ساغر ومیانہ چاہیے

اصغر صاحب اپنی شاعری میں [مناظر قدرت] سے استفادہ بھی کرتے ہیں وہ مناظر قدرت سے حظ اٹھاتے ہیں اور اپنی روح کو خوشی میں غرق کردیتے ہیں انہوں نے مناظر فطرت کو مختلف رنگوں میں پیش کیا:

ایک سی گلکاریاں ہیں ایک سی رنگیں بہار
لے دے کے دامان نظر سے تا بہ دامان بہار
شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں
بلبل یہ آہ نالہ وگل مست رنگ وبو
مجھ کو شہید رسم گلستان بنادیا

اس کے علاوہ اصغر صاحب کی شاعری میں حرکت وعمل کا تصور بھی پایا جاتا ہے اور حرکت وعمل کو انسانی زندگی کے لیے اہم تصور کرتے ہیں وہ اس تصور پر خود بھی عمل پیرا تھے اور انہوں نے اپنی زمانہ حیات میں اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کہی کام کیے ریلوے میں ملازم ہوگے اور عنیک بھیجنے کا کام بھی کیا یہ ان کے یہاں انفراد پایا جاتا ہے اور وہ دوسرے صوفی شعراء کی طرح ایک ہی جگہ ذکر وفکر میں بیٹھنا اور معاملات زندگی کو یکسر نظر انداز کرنا صحیح نہیں مانتے ہیں اور ذکر وفکر کے ساتھ عمل کی اہمیت پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں:

یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں باز وسمٹتے ہیں وہی صیاد ہوتا ہے (ص463)

اصغر صوفی شاعر ہیں ان کے یہاں وہ سب عناصر پائے جاتے ہیں جو ایک صوفی شاعر میں ہونے چاہیے اصغر کا اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے دوسرے شعراء کی طرح فارسی شعراء کی آنکھ بند کر کے تقلید نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنے صوفیانہ کیفیات وخیالات کو منفرد انداز میں پیش کیا جس میں غالب کا انداز اور میر درد کا معنوی اثر چھلکتا ہے جو ان کے یہاں ندرت اور جدت کو برملا ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بارے میں محمد سراج الحق مچھلی شہری نے اپنے ایک مضموں ذکر کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

ایک دن اصغر صاحب خود کسی سلسلہ سخن میں کہنے لگے کہ میری شاعری خود خواجہ میر درد کے معانی اور مرزا غالب کے الفاظ کا مجموعہ ہے" مضموں مولوی محمد سراج الحق مچھلی شہری۔ (عنوان حضرت اصغر کے بعض ادبی افادات ص13)

اصغر صاحب خود ایک نشت میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کا کلام روحانی کیفیات اور خیالات کے لحاظ سے درد جیسا ہے اور پیش کش کا لحاظ غالب جیسا ہے اس طرح وہ خود اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ وہ [صوفی] شاعر ہے اور ان کی تخلیقات عرفانی اور صوفیانہ خیالات، رموز اسرار سے بھری ہوئی ہیں اس کے ساتھ ساتھ اس کو ناقد [عرفانی شاعر] اور اس کے کلام کو صوفیانہ کلام قرار دیتے ہیں۔

مرزا احسان احمد نشاط روح کے مقدمے میں اصغر صاحب کو صوفی شاعر قرار دیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"حضرت اصغر فطرۃً نہایت شگفتہ اور رنگین طبع واقع ہوے ہیں ۔علاوہ اس کے بادہ تصوف کا نشہ سر میں ہے۔ اس سے ان کی ایک ایک ادا جوش محبت ڈوبی ہوتی ہے۔ (نشاط روح۔ مقدمہ مرزا محمد احسان احمد ص 20-21)

مولانا اعظمی نے "نشاط روح" کے تبصرہ میں لکھا ہے:

اسرار ومعارف ان کی شاعری کا ہیولے وجد وحال اس کی روح، ندرت ادا اسکی صورت اور جوش بیان اس کا رنگ" (نشاط روح، تبصرہ مولانا سہیل اعظمی ص64)

پرنسپل عبدالشکور نے اصغر کے کلام کو صوفیانہ قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اصغر کا کلام پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا رویے سخن کسی دنیاوی محبوب کی جانب نہیں ہے۔ بلک یہ کہ عشق حقیقی کی دولت اپنے دل میں لیے شاعر جو کچھ کہتا ہے حسن مطلق ہی کہتا ہے" (عبدالشکور اصغر اور اس کا کلام ص154)

اور عبدالشکور آگے لکھتے ہیں آپ لاکھ کوشش کریں اس کے محبوب کا تصور مرتب کرنا امر محال ہے"

کلیم الدین احمد بھی اصغر کو صوفی شاعر قرار دیتے ہیں اور اس کے کلام میں تصوف ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

تصوف یا فلسفہ ہر صفحے پر روشن ہے") اردو شاعری پر ایک نظر کلیم الدین احمد ص 587 تیسرا ایڈیشن 1966)

ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی اصغر صاحب کو صوفی شاعر قرار دیتے ہیں اور ان کے یہاں اعلیٰ پایے کے مضامین پایے جاتے ہیں جو صوفیانہ اسرار و رموز سے بھرے ہوے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:

اصغر کے یہاں موضوعات کا تنوع نہیں ہے۔ صرف تصوف کی کیفیات ہیں کہی کہی فلسفے کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں" (غزل اور مطالعہ غزل۔ عبادت بریلوی ص400)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اصغر صاحب کے یہاں تصوف کے عام مسائل ،مضوعات ،مروجہ مضامیں، اصطلاحات اور اشارات موجود ہیں مگر ان میں ایک تازگی اور ندرت ہے یعنی اصغر نے صوفیانہ اصطلاحات کو خشک انداز میں بیان نہیں کیا بلکہ ان کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے یہی اصغر کا فن ہے۔

سبق اردو نومبر 2025
45

وحدت الوجود

: اصغر گونڈوی کا تعلق سلسلہ چستیہ سے تھا یہ سلسلہ وحدتالوجود کا قائل تھا اصغر صاحب عبدالغنی منگلوری سے بعیت کے بعد اس نظریہ سے وابستہ ہوگے اس کے بعد اصغر صاحب کے یہاں وحدت الوجود کے متعلق اشعار کثرت سے پایے جاتے ہیں ان کا عقیدہ ہے یہاں بس صرف ایک وجود ہے وہ خدا کا ہے اور باقی اشیاء اپنا کوئی الگ وجود نہیں رکھتیں انہوں نے اپنے کلام میں اصطلات سے گریز کیا اور جو بھی انہوں نے پیش کیا بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

اس شعر میں اصغر صاحب، تنہا بس صرف ایک وجود ہے باقی اشیاء تو دھوکہ ہیں اصل وجود تو ذات حقیقی ہے اور باقی اس کے سوا کسی کا وجود نہیں ہے انہوں نے اس شعر میں مراۃ النظیر سے کام لیا ہے اور یہ عقیدہ مہ رکھتا ہے کہ کائنات صرف ایک تصویر ہے ہم اس تصویر کے حصے ہیں اور مصور بس خدا ہے

انتہا دید کی یہ ہے کہ نہ کچھ آئی ※ نظر
کیف بے رنگی حیرت ہے نظر کی معراج

اصغر صاحب اس بات کا قائل ہے کہ سلسلہ تصوف میں رہ کر سالک ہر احکام کی اتباع کرنی چاہیے تب جا کر اس کو مکمل کمال حاصل ہوتا ہے اور سالک اپنے اندر اس قسم کی قوت پیدا کرے اس کو خدا کے علاوہ کچھ نظر نہ آے اور دنیاوی اشیاء اس کو کسی فریب میں مبتلا نہ کرے اور ہر وقت اس کی زبان پر صرف لاالاللہ کا ورد ہو۔

ہر شے میں تو ہی تو ہے یہ بُعد یہ حرمان ہے
صورت جو نہیں دیکھی یہ قرب رگ جان ہے

اس کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب اشیاء میں خدا کو محسوس کیا جا سکتا ہے اس کے باوجود بھی وہ کبھی نظر نہیں آتا ہے جس سے خالق اور ملویق کے درمیاں دوری پیدا ہو جاتی ہے مگر اہل عرفان اس بات کے قائل نہیں بلکہ رگ جان کی طرح محسوس کرتے ہیں یعنی وہ ہمارے ہی پاس ہے۔

کبھی خیال کہ ہے خواب عالم ہستی
ضمیر میں ابھی فطرت کے سور ہا ہوں میں

اس میں اصغر صاحب اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اپنی ذات اور باقی اشیاء کے علاوہ کوئی وجود نہیں رکھتے ہیں بلکہ اس میں اگر کوئی حقیقی وجود ہے جو ہمیشہ رہنی والی ہو اور جس کا کوئی زوال نہیں وہ بس صرف ذات حقیقی ہے اس طرح کا رجحان نہ صرف صوفیا کے یہاں پایا جاتا ہے بلکہ علم نفسیات میں بھی اس قسم کا رجحان پایا جاتا ہے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں عدم جسمانیت Depersonalization کہتے ہیں 1818ء Dugas میں اس اصطلاح کو پیش کرتا ہے اس تصور کے مطابق انسان اور کائنات محض وہم وفریب ہے اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اصغر صاحب کے یہ اشعار فللسفہ وحدت الوجود کو ظاہر کرتے ہیں یہ سارے اشعار اس چیز کی طرح اشارہ کرتے ہیں کہ اس دنیا میں محض ایک وجود ہے وہ اللہ تعالیٰ کا وجود ہے اور باقی اشیاء کا اپنا الگ کوئی وجود نہیں ہے بلکہ محض دھوکہ ہے۔

(ص 478)

وحدت الشہود:

اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک وجود ہے اور اس کے علاوہ جو بھی اشیاء ہیں وہ الگ الگ وجود رکھتی ہیں جب ہم ان سب چیزوں کو دیکھتے ہیں وہ اس بات کا اشارہ دیتے ہیں کہ یہاں بس ایک ذات ہے جو لائق اتباع اور پرستش ہے جس کی گواہی کائنات میں موجود اشیاء بھی دیتے ہیں ان کا عارضی پن اور ایک مدت کے بعد ان کا کا زوال آنا خدا کے برابر میں نہیں لا سکتا کیونکہ خدا ہمیشہ رہنی والی چیز ہے۔

اصغر گونڈوی ایک صوفی شاعر ہیں ان کے کلام میں تصوف کے مختلف مظاہر پایے جاتے ہیں ان میں وحدت الوجود کے ساتھ ساتھ وحدت الشہود کے عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مٹی جاتی تھی بلبل جلوہ گلہاے رنگین پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برق آشیاں رکھ دی

بلبل باغ میں وقت گزاری کے لیے یا تفریح کرنے کے لیے نہیں جاتا ہے بلکہ وہ باغ میں اسی لیے جاتا ہے تاکہ وہ پھولوں کے گود میں بیٹھے تاکہ اپنے محبوب حقیقی کو محسوس کروں ان سے راز نیاز کی باتیں کروں اسی لیے جب بلبل باغ میں پہنچ جاتا ہے تو وہاں اپنے محبوب حقیقی کا آتش حسن کے شعلے بھٹک رہے ہیں یعنی پھول خدا کے وجود کی شہادت دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور شعر ہے جس میں وحدت الشہود کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔

پھر یہ سب شورش ہنگامہ عالم کیا ہے
اسی پردے میں اگر حسن جنوں ساز نہیں

اصغر صاحب اس شعر میں اس بات کی طرح اشارہ کرتا ہے کہ اس دنیا کے شب روز، طلوع آفتاب ہونا اور پھر رات کا ظاہر ہونا اور اس دنیا کی حرکت میں رہنا اور تبدیلیوں کا الگ الگ ظاہر ہونا اس بات کی طرح عندیہ ہے یہاں کوئی ایسی ذات ہے جس کی وجہ سے ہنگامہ برپا ہے۔

خیرہ کیسے ہے چشم حقیقت شناس بھی
ہر ذرہ ایک مہر منور لیے ہوئے

یہ شعر بھی وحدت الشہود کی طرح اشارہ کرتا ہے اس میں اصغر صاحب کائنات کے مختلف زرات کا ذکر فرما رہے ہیں جو اپنے اندر ایک پیغام

سبق اردو نومبر 2025
46

رکھتے ہیں جو اپنے دیکھنے اور مشاہدہ کرنے والوں کو ذات حقیقی کی طرف جانے میں رہنمائی کرتے ہیں ان ذرات کا الگ وجود ہے ان ذرات کا خالق خدا ہے اس لیے ذرات مخلوق ہیں اور خدا خالق ہے۔

ایک اور مثال وحدت الشہود کے متعلق ہے
پردہ لالہ وگل بھی ہے بلا کا خوں ریز
اب زیادہ نہ کرے حسن کو عریاں کوئی
یہ وحدت الوجود کی ایک واضح مثال ہے۔

اصغر صاحب ایک اور شعر میں رقمطراز ہے کہ ہر ایک ذرہ اپنے بنانے والے کو ظاہر کرتا ہے اور ہر ذرہ اس دنیا میں ایک آئینہ کی طرح ہے جس میں جمال حقیقی یار کو دیکھا جا سکتا ہے اور یہ نہ صرف دیگر اشیا میں دیکھا جا سکتا ہے بلکہ میرے مشت غبار میں بھی جمال حقیقی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ کہی اشعار ایسے پایے جاتے ہیں جن میں وحدت الشہود کے عنصر مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں اصغر گونڈوی کا ماننا ہے کہ موج نسیم بہار میں ذات خداوندی کی شوخیاں موجود ہیں اس بات کو اس طرح رقم کرتے ہیں:
تیری ہی شوخیاں تھیں گرہ میں دبی ہوئی
چھیڑا جو میں نے موج نسیم بہار کو

ایک اور شعر میں اصغر صاحب اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ جتنی بھی اشیاء کائنات میں ہیں آپ وہ نہیں ہو اور نہ ہی آپ لالہ گل ہو نہ ہی آپ ماہ وانجم ہو بلکہ آپ ان میں نمایاں ہیں جو ان کو وجود اور زندگی بخشتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان میں آپ کا جلوہ، طاقت اور فنکاری کا عکس بھی دیکھائی دیتا ہے لالہ وگل ماہ انجم آپ نہیں بلکہ ان میں رنگ بھرنے والے ذات حقیقی ہے مثلاً:
لالہ وگل تم نہیں ہو ماہ انجم تم نہیں
رنگ محفل بن کے لیکن کون اس محفل میں ہے
(ص ۴۷۹ تا ۴۸۳)

اس کے علاوہ اصغر صاحب نے مختلف چیزوں کو بھی زیر بحث لایا جس سے ایک تو اصغر گونڈوی کے علم کا اندازہ ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تصوف اور باطنی معاملات کو جس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا اس سے پتا چلتا وہ محض رسمی صوفی نہیں تھے بلکہ وہ اس عالم کے شناور تھے۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے مختلف اصطلاحات کو بہت خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے ان میں [تجلی، ازل حق الیقین، شریعت، طریقت، معرفت، اور حقیقت] قابل ذکر ہیں۔

ایک شعر میں انہوں نے (تجلی) اول کا ذکر کیا ہے جیسے:
اک شور اَنا لیلےٰ خلقت نت سنا لیکن
پھر نجد کے صحرا سے کوئی نہ صدا آئی
خدا اپنی ذات کو نمایاں کرنا چاہتا تھا اس لیے انہوں نے اس دنیا کو خلق کیا تا کہ وہ پہچانا جاے اس لیے انہوں نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے۔

)طریقت) پر یہ شعر ملاحظہ فرمایے:
حیران ہے زاہد مری مستانہ ادا سے
سورہ طریقت کھلیں اک لغزش پا سے

شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت ان اصطلاحات کو بھی انہوں نے اپنے اشعار میں برتا ہے۔ اصغر گونڈوی کا ان چار مراحل سے گزر کر ایک صوفی بن جاتے ہیں اس اثنا میں جو بھی کیفیات عمل کرتے ہوے ان میں پیدا ہوتی ہیں ان سب کو انہوں اپنے اشعار میں نظم کیا اس سے پتا چلتا ہے وہ صرف رسمی صوفی نہیں بلکہ باعلم اور باعمل صوفی تھے۔

اس کے بعد ان کے یہاں مختلف وادیوں کا ذکر ملتا ہے جن سے گزر کر ایک انسان صوفی بن جاتا ہے اصغر انہی وادیوں سے گزر کر صوفی بن جاتے ہیں ان میں وادی طلب، وادی عشق، وادی معرفت، وادی استغنا، وادی توحید، وادی حیرت اور وادی وادی فنا قابل ذکر ہیں۔ میں اس میں چار کا ذکر کرتا ہوں۔

وادی طلب

اس سے مراد سالک ہمیشہ جستجو میں رہے تا کہ اس کے باطنی مقامات میں اضافہ ہو جاے اور صوفی کی طلب کبھی ختم نہ ہو جایے اور انسان میں ایسا درد پیدا ہو جو کبھی ختم نہ ہو جونہی اس کے تلاش وجستجو میں ستیگ آجاتی ہے تو وہ آگے نہیں جاتا۔۔۔ وہ فرماتے ہیں:
ذوق طلب حصول سے جو آشنا نہ ہو
یعنی وہ درد چاہیے جس کی دوا نہ ہو

وادی استغنا

اس کے بعد انہوں نے ایک اور وادی کا ذکر کیا ہے جس میں داخل ہو کر انسان میں بے نیازی آجاتی ہیں اور وہ وہی عناصر اس کے اشعار میں بھی پایے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:
اس کی راہ میں مٹ کر بے نیاز خلقت بن
حسن پر فدا ہو کر، حسن کی ادا ہو جا

وادی حیرت

اصغر صاحب اپنی صوفیانہ شاعری میں وادی حیرت کا بھی ذکر فرماتے ہیں اور اس دوران انہوں نے جو بھی تجربات حاصل کیے ہیں وہ سب ان کے اشعار میں پایے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:
ترے جلوؤں کے آگے ہمتِ شرح و بیان رکھ دی
زبان بے نگہ رکھ دی، نگاہ بے زبان رکھ دی

سبق اردو نومبر 2025
47

اس شعر میں اصغر صاحب اللہ کی عظمت اور اس کے متنوع مظاہر کا ذکر فرماتے ہیں، کہتا ہے کہ انسان عاجز ہے اور کمزور ہے انسان جتنے بھی کمالات حاصل کرے پھر بھی وہ اللہ کے جلوؤں کی شرح نہیں لکھ سکتا ہے۔

وادی فنا

اس کے بعد اصغر صاحب وادی فنا کا ذکر کرتے ہیں کہ اس وادی میں پہنچ کر صوفی اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے اور ذات حق میں ہر وقت محو ہوتا ہے اس وادی میں داخل ہوا ایک صوفی کے لیے تمام پردے وا ہوجاتے ہیں اور وہ ذات حقیقی میں پوری طرح گم ہوجاتا ہے اس کے بعد سالک کو کسی چیز کی نہ طلب رہتی اور نہ خواہش اور نہ راہ نما کی۔۔وہ فرماتے ہیں:

اک صورت افتادگی، نقش فنا ہوں
اب راہ سے مطلب نہ مجھے راہ نما سے

ایک اور شعر میں اس طرح فرماتے

خاک کر دیں تپش عشق سے ساری ہستی
پھر اسی خاک کو خاکِ درِ جاناں کر دیں

وادی بقا

اس کے بعد اصغر گونڈوی وادی بقا کا ذکر فرماتے ہیں کہ راہ سلوک میں مختلف مراحل سے گزر کر اس مقام میں داخل ہوجاتا ہے اور ذات حقیقی سے اس کا وصل ہوجاتا ہے اور حیات ابدی حاصل کرتا ہے اس کا ماننا ہے کہ فنا کے بعد ہی بقا ہے وہ فرماتے ہیں

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی

تو کمالِ زندگی کہتا ہے مرجانے کو اصغر صاحب کا اردو ادب میں اہم مقام ہیں یوں تو انہوں بہت سارے موضوعات پر طبع آزمائی کی لیکن ان کا اصل میدان تصوف تھا اور اردو ادب میں بحیثیت صوفی شاعر ہی مشہور ہے وہ عبدالغنی منگلوری کے زیر اثر رہے اور انہی کی اتباع میں انہوں نے راہ سلوک کے پرخار راستے طے کیے اور اس دوران جو بھی تجرابات حاصل ہوے وہی ان کے اشعار میں مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں وہ دوسرے صوفی اشخاص کی طرح صرف رسمی صوفی نہیں تھے بلکہ وہ صوفی باعلم اور صوفی باعمل تھے اور ان کی شاعری کا یہی پیغام ہے کہ یہ کائنات اور اس میں جو اشیاء ہیں یہ سب عارضی ہیں ان کے لیے شب و روز گزارنا اور صرف ان کا حصول اپنی زندگی کا مقصد بنانا صحیح سوچ نہیں بلکہ دھوکہ وفریب ہے کیونکہ ان کا وجود عارضی ہے اس کے بجاے ہم اس ذات حقیقی کے مشن کا حصہ کیوں نہ بن جایے جس نے ان سب چیزاوں کو وجود بخشا ہے اور جس کا کبھی زوال نہیں اور جو اس مشن کا حصہ بنے اس کا بھی نام ہمیشہ زندہ رہے گا اس قسم کی مثالیں یہاں بہت پائیں جاتی ہیں جس جس نے بھی اپنی ذات کو قرباں کر کے اس کے آفاقی پیغام پر چلے اور اس کو لوگوں میں منتشر کیا وہ ہمیشہ زندہ رہے اور ان کے چاہنے والے ان کا ہمیشہ ذکر کرتے رہتے ہیں اور ان کے چاہنے والے ان کی اتباع کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہیں اور ان کے فرمودات کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں اسی لیے ہمیں بھی چاہے کہ آفاقی شخصیات کی اتباع کیا جایے تاکہ ہم بھی آفاقی ہوجایے اللہ بھی یہی فرماتا ہے کہ تم مجھے یاد کرو اور میں آپ کو یاد کروں گا۔

حوالہ جات

اصغر گونڈوی اور تصوف، سلام سندلوی، نسیم بک ڈپو۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنو ۱۹۷۰ ص 61,83,79,73 60,52,451

نشاط روح۔مقدمہ مرزا محمد احسان احمد ص 20۔21

سرود زندگی

کلیات اصغر

مولانا سہیلا عظمی

روح" پر تبصرہ ص 64

عبدالشکور۔اصغر اور اس کا کلام ص 154

کلیم لدین احمد۔ اردو شاعری پر ایک نظر، ص 587 تیسرا ایڈیشن 1966

عبادت بریلوی۔غزل اور مطالعہ غزل ص 399

مسایل تصوف اور اصغر گونڈوی۔اردو ریسرچ جرنل۔

Manzoor Ahmad Ganie
Research scholar: (SACMS)
Email: naqshawani 20@gmail.com
7006710592
Budgam

''ہزار خواہشیں ایسی''، شعر اور ہمارا سماج

ڈاکٹر عاشق حُسین میر

تلخیص:
میں اس مقالہ میں غالب کے شعر ''ہزار خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے اور دوسرے مصرعے بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے'' کی تشریح انسانی زندگی کے سماجی پہلوؤں کے جامع تجزیہ سے پیش کروں گا۔ یہ شعر انسانی خواہشات کی نوعیت کو ہمہ جہت طریقہ سے پیش کرتا ہے ۔مقالہ میں انسانی نفسیات، حسد، جوانی، دولت، غربت، سماجی ضروریات، عورتوں کا نفسیات، سماجی دباؤ اور مذہبی حلقوں میں خواہشات کے مختلف مظاہر کا بھی جائزہ لیا جائے گا اور آخر میں متعدل تعلیمات کی روشنی میں خواہشات کے توازن کا عملی حل پیش کیا جائے گا۔ جس میں حسد کی یہ کدورت ہمیں شکر کے فقدان میں مبتلا کر دیتی ہیں ہمارے پاس جو کچھ ہوتا ہیں اس کی قدر کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور جو کچھ حاصل نہ کرنا آیا اس کو دسرے سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہبی تعلیمات میں اس کا واحد علاج ''قناعت'' اور ''شکر'' ہے۔ قناعت ہمیں ہر حال میں مطمئن رکھنے کے ساتھ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا تشکر سے ساتھ ان کی قدردانی سکھاتا ہے۔

کلیدی الفاظ: خواہش، ہزار، دم، ارمان، کم، انسانی نفسیات، عورت، جلد بازی اور سماج وغیرہ۔

''ہزار خواہش ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

۱۔ ''ہزار خواہش ایسی کہ:

جدید نفسیات کے مطابق حسد ہمارے دماغ کے ''ڈوپامائن سسٹم'' کو متاثر کرتا ہے، جہاں دوسرے کی کامیابی ہمارے اندر (cortisol) تناؤ کے ہارمون کی سطح بڑھا دیتی ہے اور ہمیں بے چینی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ہماری یہ بے چینی ہمیں اُن چیزوں کے پیچھے دوڑاتی ہے جن کا ہمارے ہاں وسائل کی کمی سے فُقدان ہوتا ہے، جنہیں پا کر بھی ہمیں سکون نہیں ملتا۔ انسان دوڑ دھوپ، محنت و مشقت وغیرہ کا بوجھ اُٹھا کر جیسے ہی ایک خواہش پوری کرتا ہے، تو دوسری اس کے تحت الشعور سے شعور میں آتی ہے۔ ہم اپنے سے بہتر ہمسایہ یا اوپر والے طبقے سے موازنہ کرتے مگر خواہشات یا حسد کی آگ کا کیا کریں جو ہمارے وجود میں ہوئی ہیں۔ انسان گردشہ زمانہ میں ہر قدم پر گر کے اُٹھتا ہے مگر ہمسایہ کے تعصب میں وہ رکنے کا نام نہیں لے گا۔ جتنا ہم دن رات دوسروں کی کامیابی اور خوشیوں کی نمائش دیکھتے اُتنا اپنی زندگی کو ناکافی سمجھنے لگتے ہیں۔ غالب کا یہ شعر انسانی نفسیات کی اسی عالمگیر حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ حسد سے جنم لینے والی خواہشات کبھی ختم نہیں ہوتی۔ انسان کے اندر ہر حصول کے بعد ایک نئی خواہش جنم لیتی ہے، ہر فرد بشر دنیا پانے کی اس دوڑ میں خود محنت و مشقت کے بجائے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے پر ہیں، اس آگ میں انہیں اصل مقصد بھول جاتے ہیں اور خواہشات پوری کرنا کیا بلکہ یہ اطمینان قلب سے بھی محروم کئے جاتے ہیں۔

۲۔ ہر خواہش پہ دم نکلے کی نفسیاتی تشریح:

غالب نے اپنی وسیع فہم و فراست کے پیش نظر اس آفاقی شعر میں انسانی نفسیات کے گہرے ترین پہلو کو سمیٹا ہے جہاں انسان دوسرے کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جلتا ہے، یعنی حسد نئے خواہشات کے لامتناہی سمندر کو جنم دیتا ہے۔ نفسیات کے مطابق حسد وہ زہر ہے جو دوسرے کی کامیابی، خوبیوں اور عروج کو دیکھ کر انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسی خواہشات کے جال میں پھنس جاتا ہے جو کبھی پوری نہیں ہوتی۔ جب انسان اپنے ہم عمر، پیشہ اور ہم مرتبہ افراد کو خود سے بہتر حالت میں دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک اضطراب پیدا ہوتا ہے ۔ یہ اضطراب ''سماجی موازنہ نظریے'' (Social Comparison Theory) کے تحت جنم لیتا ہے جہاں انسان اپنے آپ کو دوسروں کے پیمانے پر پرکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ہم دوسروں کے پاس موجود چیزوں خواہ وہ مادی یا غیر مادی ہوں کو دیکھ کر اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتے ہیں جو ہمیں مسلسل طور پر نئی خواہشات کی طرف دھکیلتی ہے۔ حسد کی یہ آگ ہماری ''انا'' یعنی اندرون کی بغاوت ہے جو ہمیں یہ باور کرواتی ہے کہ دوسرا شخص مجھ سے کم تر ہو کر بھی مجھ سے بہتر چیزوں کا مستحق کیسے ہوسکتا ہے؟ یہی وہ نفسیاتی کشمکش ہے جس سے ہماری نیند، سکون اور خوشی ختم جاتی ہے۔ اسلام میں حسد کو ''امی الامراض'' قرار دیا گا ہے جو اعمال صالحہ کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس آگ سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے۔

۳۔ عورتوں کا نفسیات:

غالب کے اس شعر کو اگر عورتوں کے نفسیاتی اور سماجی تناظر میں پرکھا جائے تو چونکا دینے والے حقائق سامنے آتے ہیں۔ جدید نفسیاتی تحقیق اور سماجی مطالعات سے واضح ہوتا ہے کہ عورت کا وجود جذباتی، نفسیاتی اور سماجی طور پر ایک ایسا کثیر الجہت تشخص رکھتا ہے جس میں خواہشات اور تمناؤں کا ایک لامتناہی سمندر ہوتا ہے۔ عورت کی خواہشات محض مادی یا سطحی نہیں ہوتی بلکہ وہ گہرے جذباتی، نفسیاتی اور وجودی تعلقوں سے منسلک ہوتی ہیں ۔ ایک طرف وہ محبت، تحفظ، قبولیت اور تفہم کی متلاشی ہے تو دوسری

سبق اردو نومبر 2025
49

طرف خودشناسی اور خودمختاری کی طلبگار رہوتی ہے۔اُس کا یہ تحفُظ ،جس سے دل کریں اُسے قبول کرنا اور اپنی ذات کا بہترین تعارف پیش کرنے کا متمنی رہنا ان کی خمیر میں رچا ہیں اور دوسری طرف عورتیں اپنی شخصیت کے ساتھ خودمختار رہنا پسند کرتی ہیں۔اِن کی شخصیت کے ایسے جامع اوصاف اِسے اپنوں اور غیروں میں شہرت کا باعث بنتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوسری عورتوں کے اذہان وقلوب میں کانٹا چُبتا ہیں۔اس طرح عورت ایک وجود ہو کے بھی کلام وافعال سے وحدت میں کثرت کا مظاہرہ کر کے غلبہ پانے کی متمنی رہتی ہیں۔عورت کے ایک وجود میں بہت سے کردار چھپے ہیں ،جہاں جس کردار کی بات ہو یہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔یہی حال معاشرے کی ہر عورت کا ہے،جس کے نتیجے میں رشتہ،گھرانے اور معاشرے میں زیادہ پیچیدگیاں عورتوں کے درمیان دیکھی گئی ہیں اور گھرانے بھی ان ہی کے کلام وافعال سے ٹوٹتے بھی ہیں۔اس لحاظ سے عورت ہمہ جہت کرار دینے کے بعد ایک متضاد پیکر کی شکل اختیار کر چکی ہے۔انسان جتنا بھی اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کسی نہ کسی پہلو سے مرد کی آنکھوں میں پردہ ڈال کے اپنے مفادات کو حاصل کرتی ہیں۔

عورت کے صرف منفی پہلو ہی نہیں ہے بلکہ اپنی ہمہ گیری کے سبب مُثبت پہلوؤں کی بھی متحمل ہیں۔سماجی نفسیات کے مطابق عورت کو معاشرے نے تاریخی طور پر ایک ''ہمہ جہت'' کردار ودیعت کیا ہے۔وہ بیوی، ماں، بہو اور بہن سب کے ساتھ یک رو ہوتی ہے اور ہر کردار اس سے مخصوص توقعات وابستہ رکھتا ہے،جس کے نتیجہ میں اس کی خواہشات کا دائرہ مسلسل وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔نفسیاتی طور پر عورت کا دماغ ہمدردی اور جذباتی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے،جس کے باعث وہ نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی خواہشات اور جذبات کو بھی محسوس کرتی ہے،یعنی حساسیت اس کے ارمانوں کے دائرے کو اور بھی وسیع کر دیتی ہے۔ جدید neuroscience کے مطابق عورت کا دماغ کثیر العمل ہوتا ہے،جو بیک وقت کئی خواہشات، کئی دُنیاؤں اور کئی تمناؤں کو ذہن ہی ذہن میں عملاتی ہے یعنی اس کی خواہشات کبھی ختم نہیں ہوتی۔عورت کے تشخص کے سماجی مطالعہ سے عورت خود کو مکمل کرنے کے لئے مرد کے مقابلے میں ذہنی بوجھ اٹھائے پھرتی ہیں،اسے گھر میں بھی اپنا لوہا منوانا ہے اور دفتر میں بھی، رشتہ داروں میں بھی بے عیب ہونا ہے اور معاشرے میں خود کو بڑھا چڑھا کے پیش کرتی ہیں۔عورت کے اندرون کی مسلسل جستجو جسے وہ ''تکمیل کی دوڑ'' میں ہر حد پار کر سکتی ہے۔معاشی حوالے سے بھی عورت اب محض گھر تک محدود نہیں رہی ،اب وہ مالی خود مختاری چاہتی ہے، دنیاوی منصب حاصل کرنے کے لئے اسے غالب کی زبانی بہت سے ''دم نکلتے ہیں!'' عورت بلندیاں چاہتی ہے،جو مکمل مغربی ماحول کے اثرات نظر آتے ہیں۔خوش قسمتی سے سماج میں ایسا طبقہ بھی ہیں جو تعلیمی میدان میں اپنی عصمت وعزت کی حفاظت کرتے ہوئے آگے آگے ہیں۔یہ اپنی روایتی کردار واقدار سے پیچھے نہیں ہٹتی،جس کے نتیجی میں اس کی ہمہ گیریت کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

جذباتی طور پر عورت ''غیر مشروط محبت'' کی متلاشی ہے، وہ رشتوں میں گہرائی، تفہیم اور جذباتی تحفظ چاہتی ہے اور یہ ساری تمنائیں اسے مسلسل نئے ارمانوں کی طرف لے جاتی ہیں۔جدید تانیثی تھویری کے مطابق عورت دوسرے کے طور پر پروان چڑھائی گئی ہے،مگر اب وہ ''خود'' بننا چاہتی ہے،یعنی شناخت کی یہ جدوجہد اس کی خواہشات کو ہمہ وقت متحرک رکھتی ہے۔ ثقافتی دباؤ بھی عورت کی خواہشات پر گہرا اثر ڈالتا ہیں ہر معاشرہ اسے بتاتا ہے کہ اسے کیا، کیوں، کب ،کدھر اور کیسا ہونا چاہیے جن عناصر سے اس کی زندگی میں حُسن آئے اور یہ سب اس کے اپنے ارمانوں کے ساتھ مل کر اس کی زندگی میں ایک پیچیدہ نفسیاتی کشمکش پیدا کرتے ہیں۔مذہبی تعلیمات میں بھی عورت کو ایک متوازن کردار دیا گیا ہے وہ گھر کی رانی بھی ہے اور معاشرے کی معمار بھی، یہ دوہرا کردار اس کی تمناؤں کے دائرے کو وسیع کرتا ہے۔غرض، عورت کی خواہشات کا یہ لامتناہی سلسلہ اس کے کثیر الجہت تشخص کا آئینہ دار ہے۔وہ ایک ساتھ کئی محاذوں پر لڑ سکتی ہے،جن میں خواب اور ارمانوں کو پالنا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے لئے غالب کا یہ شعر ایک الگ ہی معنویت رکھتا ہے۔ ہر خواہش پر ''دم نکلنے'' کا احساس اس مسلسل جدوجہد کی علامت ہے جس میں عورت ہر منزل سے ہمکنار ہونے کے باوجود اپنے ارمانوں کی تکمیل کے لئے کوشاں رہتی ہے اور یہی کوشش اسے ہر دور میں زندہ اور متحرک رکھتی ہے۔

ہزار خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

۴۔مذہبی طبقہ کا نفسیات: اس شعر میں سماج کا مذہبی پہلو اور حلقوں کے اندرون کی وہ مکروہ حقیقت پنہاں ہے جہاں تقویٰ وطہارت کے لباس میں ملبوس نظر آنے والے افراد اندرون سے تمناؤں، خواہشات اور لالچ کے دریا رکھتے ہیں۔اس میں وہ مذہبی افراد جو مالی اعتبار سے بہتر ہوتے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ طبقہ حقیقتاً اخلاقی تناقض (Moral Dissonance) کا شکار ہوتے ہیں۔ایک طرف تو وہ زہد وتقویٰ کی تعلیمات کا پرچار کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کا پورا وجود دنیاوی تمناؤں میں پھنسا ہوتا ہے۔ یہ لوگ ''دوہری شخصیت'' (Dual Personality) کے مریض ہوتے ہیں۔عوام کے سامنے تو وہ روحانی رہنما کا روپ دھار لیتے ہیں مگر زندگی میں وہ اقتدار، دولت اور شہرت کے ایسے پیاسے ہوتے ہیں کہ ہر حصول کے بعد بھی ان کی پیاس نہیں بجھتی۔ اسلامی تعلیمات میں اسے ''ریاکاری'' کہا گیا ہے،وہ بیماری جو عبادتوں کو بھی خاک میں ملا دیتی ہے۔سورہ الماعون میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی

سبق اردو نومبر 2025

50

لوگوں کو ''الذی یُکذب بالدین'' کے الفاظ سے خطاب کیا جو دین کو ماننے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر ان کا عمل اس کے برعکس ہوتا ہیں۔ اللہ پاک کا ارشاد ہیں:

''اَتَاْ مُرُوْنَ النَّاسَ بِاالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔''

''کیا تم (باقی) لوگوں کو نیکی کا حکم اور خود کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم (اللہ پاک کی) کتاب پڑھتے پھر بھی عقل سے کام نہیں لیتے۔'' ۱؎

مذہبی طبقہ میں خواہشات کی کثرت کی بنیادی وجہ ان کے پاس وسائل کی فراوانی ہوتی ہے جیسے ان کے وسائل بڑھتے ہیں ویسے ہی ان کی خواہشات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کمال و دولت ان کا حق ہے اور المیہ کی بات یہ ہے وہ خود کو عوام کا روحانی رہنما سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض مذہبی رہنما معمولی سی دست وُسعت کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے مگر عوام سے بے تحاشہ تحائف کے طلبگار رہتے ہیں۔ ان کی خواہشات کا ایک بڑا محرک ''سماجی وقار'' کا حصول ہے وہ چاہتے ہیں کہ معاشرے میں ان کا رعب و دبدبہ قائم رہے اور ان کی عزت وقار برقرار رہے۔ اس کے لئے وہ ہر حلال وحرام طریقہ اختیار کرتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ان کے الفاظ کو مقدس سمجھا جاتا ہے، اس لئے وہ اس اختیار کو اپنی دنیاوی تمناؤں کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں ایسے لوگوں کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔

''یٰاَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفعَلُونَ کَبُرَ مَقتًا عِندَ اللّٰہِ اَن تَقُولُوا مَا لَا تَفعَلُونَ۔''

''اے ایمان والو! تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک بہت سخت ناپسندیدہ بات یہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو خود نہیں کرتے۔'' ۲؎

مذہبی طبقہ میں ایسے افراد کی کثیر تعداد ہوتی ہیں جن کے خواہشات کا ایک بڑا حصہ سماج میں جھوٹا دبدبہ قائم کرنا اوان کی بات کو حرف آخر سمجھا جائے، تاکہ ان کے ان کے فیصلوں پر سوال نہ اٹھایا جائے۔ اسی وجہ سی یہ طبقہ علماء کرام کی تنقید کو برداشت نہیں کر پاتے۔ ان کی ترجیحات میں مادی عیش و آرام بھی ہوتا ہے وہ عوام کو فقیروں جیسی زندگی گزارنے کی تلقین تو کرتے ہیں مگر خود عیش وعشرت کی زندگی کے حصول کے لئے ہر حد پھلانگ سکتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ اصل میں اخلاقی انحطاط کی علامت ہے۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کچھ فرماوان:

''مَنْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلنَّاسِ اِمَامًا فَعَلَیْهِ اَنْ یَبْدَاَ بِتَعْلِیمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِیمِ غَیْرِهِ وَلْیَکُنْ تَاْدِیبُهُ بِسِیْرَتِهِ قَبْلَ تَاْدِیبِهِ بِلِسَانِهِ وَعَلِّمُ نَفْسِهِ وَمُؤَدِّبُهَا اَحَقُّ بِالْاِجْلَالِ مِنْ مُعَلِّمِ النَّاسِ وَمُؤَدِّبِهِمْ۔''

''جو شخص خود کو عوام کا قائد جتائے اُسے چاہئے کہ دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنی ذات کو تعلیم دے، اس کا کردار اس کی زبان سے پہلے ادب سکھائے (نمونہ دکھائے) اور اپنے نفس کو مودب کرنے اور قابل بنانے والا دوسروں کو تعلیم دینے والے سے زیادہ قابل تعظیم وعزت ہے۔'' ۳؎

غرض، غالب کا یہ شعر ان مالی سطوت کے مذہبی طبقہ کی مکمل نفسیاتی عکاسی کرتا ہے، جس میں ہر خواہش ان کے ایمان کو کھا جاتی ہے، ہر ارمان ان کے دل کے سکون کو چھین لیتا ہے، مگر پھر بھی ان کی تمناؤں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا! اسی روحانی بیماری سے تمام مذاہب نے بچنے کا حکم فرمایا ہے۔

ہزار خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

۵۔ زیادہ خوشی: انسان خوشی کے عین لمحات میں بھی نئی تمناؤں اور خواہشات کے جال بنانے لگتا ہے۔ خوشی انسان کے اندر موجود خواہشات کے سلسلے کو ختم کرنے کے بجائے اسے اور بڑھا دیتی ہے، جس کے نفسیاتی، سماجی اور وجودی وجوہات نہایت گہرے ہوتے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے خوشی کا یہ paradox ہے کہ جب انسان کسی خواہش کی تکمیل پر خوشی محسوس کرتا ہے تو اس کے دماغ کا ڈوپامائن نظام ایک ردعمل پیدا کرتا ہے یہ خوشی کا احساس اسے مزید خوشی کے حصول کی ترغیب دیتا ہے، اور وہ اپنی موجودہ خوشی کو محض ایک نقطہ آغاز سمجھنے لگتا ہے۔ جدید neuroscience کے مطابق جب انسان خوش ہوتا ہے تو اس کا prefrontal cortex زیادہ متحرک ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ مستقبل کے بارے میں زیادہ مثبت انداز میں سوچنے لگتا ہے یہی مثبت سوچ نئی خواہشات کو جنم دیتی ہے۔ سماجی نفسیات کے (Hedonic Treadmill) کے نظرئے کے مطابق انسان کا ذہن ہر حاصل شدہ خوشی کے بعد اپنے خوشی کے معیار کو خود بخود بلند کر دیتا ہے جس گاڑی پر وہ کل تک خوش تھا، آج وہ اس سے بہتر گاڑی کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ خوشی کی حالت میں انسان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے، وہ خود کو زیادہ قابل اور اہل سمجھنے لگتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ زیادہ بڑے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ وجودی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو خوشی انسان کو اس کی ''لامحدود امکانات'' کا احساس دلاتی ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر وہ ایک خواہش پوری کر سکتا ہے تو دوسری کیوں نہیں یہی احساس اس میں نئی بلندیوں کے حصول کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ معاشی نفسیات کے حصول کے بعد کی مایوسی Post-Acquisition Disappointment کے تصور کے مطابق ہر حاصل شدہ شے اپنی چمک کھو دیتی ہے۔ گاڑی خریدنے کے

سبق اردو نومبر 2025

51

ایک ہفتہ بعد وہ محض ایک گاڑی رہ جاتی ہے، اور انسان پھر کسی نئی چیز یعنی خواہش کرنے لگتا ہے۔ خوشی انسان کے اندر خود کو ہر شوق سے روکنے کا احساس پیدا کرتی ہے، وہ محسوس کرتے ہے کہ وہ اپنی قسمت کا خود مالک ہے، اس لئے وہ مزید چیزیں حاصل کرنے کے لئے پُرعزم ہو جاتا ہے۔ سماجی موازنہ کا نظریہ (Social Comparison Theory) بھی اس میں اہم کردار ادا کرتا ہے، خوشی کے لمحات میں انسان اپنے سے اوپر والے طبقے کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور ان کی طرز زندگی اس کے لئے نئی خواہشات کا باعث بنتی ہے۔ ارتقائی نفسیات (Evolutionary Psychology) کے مطابق یہ تحرک درحقیقت انسان کی بقاء اور ترقی کا حصہ ہے۔ خوشی ہمیں آگے بڑھنے کی تحریک دیتی ہے ورنہ انسان ارتقاء کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا۔ سلوکی نفسیات (Behavioral Psychology) میں اسے مثبت تیز ردِعمل کہا جاتا ہے یعنی کامیابی کے لئے ہم ہر قدم جوش سے اُٹھاتے ہیں۔ غرض، خوشی اور تمناؤں کا یہ باہمی رشتہ انسانی فطرت کا اٹوٹ حصہ ہے۔ خوشی ہمیں خواب دیکھنے کی ہمت دیتی ہے، اور یہی خواب ہمیں زندہ رکھتے ہیں، چاہے ہر خواب پر ''دم نکلے'' یا ''ارمان کم نکلے'' یہی دوڑ زندگی کی روانی اور انسان کی ترقی کا راز ہے۔

اختتام:

غالب کے اس شعر کے تناظر میں جوانی میں ہی خواہشات کے دائرے کو متوازن اور معتدل بنانے کا ایک جامع منہج ترتیب دیا جائے تا کہ انسان خواہشات کے نہ ختم ہونے والے سلسلے سے نجات پا سکے۔ اس حوالے سے بُنیادی نُقطہ یہ ہے کہ خواہشات کا ہونا انسانی فطرت ہے، ان کا مکمل خاتمہ ممکن نہیں۔ البتہ انہیں حد میں رکھنا اور ان کے دائرے کو متوازن بنانا نہایت ضروری ہے، جس کا آغاز ''خود شناسی'' سے ہوتا ہے۔ انسان اپنے اندر جھانکے اور اپنی خواہشات کی نوعیت کو سمجھے۔ کون سی خواہشات حقیقتاً ضروری ہیں اور کون سے محض سماجی دباو یا موازنے کا نتیجہ ہیں۔ ہر دن کچھ لمحات مراقبے میں گذارنے سے اسے ذہن کو مل سکتا ہے اور خواہشات کے بے ہنگامہ طوفان پر قابو پا سکتا ہے۔ حضرت علیؓ سُن ※ د فرمانِ مُبارک چُھ:

''العِلمُ غِطَائٌ سَاتِرٌ وَ العَقلُ حُسَامٌ قَاطِعٌ فَاسْتُر خَلَلَ بِحِلمِکَ وَ قَاتِلْ حوَاکَ بِعَقلِکَ۔''

''بُردباری عیبوں کو چُپانے والا پردہ ہے، عقل تیز تلوار ہے۔ اسی لئے اپنی اخلاقی کمزوریوں کو تحمل سے چُپانی چاہیے اور اپنی (نفسانی) خاہشات کے ساتھ عقل کی تلوار سے مقابلہ کرو۔'' [۴]

اس کے ساتھ قناعت پر زور دیا ہے جو خواہشات کے خاتمے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ تقدم مقاصد کا تعین ہے، جوانی میں ہی زندگی کے واضح مقاصد طے کریں جن میں دنیاوی اور اُخروی دونوں پہلوں شامل ہوں۔ جب انسان بڑے مقاصد پر توجہ مرکوز کر لے تو چھوٹی خواہشات خود بخود کم ہو جاتی ہیں۔ جوانی کا وقت خواہشات کی بھٹکنے میں ضائع کرنے کے بجائے علم، ہنر اور خدمت میں صرف کریں۔ جب انسان مصروف رہے گا تو اس کا ذہن بے جا خواہشات کی طرف کم بھٹکے گا اور سماجی موازنے سے اجتناب بھی اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ سوشل مڈمیڈیا اور معاشرے میں دوسروں کی کامیابیوں اور مال و دولت کو دیکھ کر اپنی خواہشات کا دائرہ نہ بڑھائیں۔ اس کے ساتھ ضرورت اور خواہش میں فرق کو سمجھیں ہے۔ ہر چیز و خریدنے یا حاصل کرنے سے پہلے خود سے پوچھیں کہ کیا یہ میری ضرورت ہے یا محض خواہش؟ اس کے علاوہ روحانی غذا ہے جو روزانہ قرآن پاک کی تلاوت، ذکر و اذکار، درود وصلوت، اور نمازوں میں خشوع وخضوع سے دل و دماغ کو طاقت دیں۔ اس کے ساتھ خِدمتِ خلق بہتر قدم ہے، دوسروں کی مدد اور خدمت میں مصروف رہیں یہ عمل دل کی کدورتیں دور کرتا ہے۔ اپنے اندر عقلی شعور پیدا کریں جس سے ہر خواہش کو عقل ومنطق کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ آخر میں توکل علی اللہ کی عظیم نعمت ہے اللہ پر بھروسہ رکھیں کہ جو کچھ وہ دیتا ہے بہتر دیتا ہے۔ غرض، یہ منہج اپنا کر جوانی میں ہی انسان خواہشات کے اس نہ ختم ہونے والے سلسلے سے نکل سکتا ہے جس کا احساس غالب کے دل میں تھا۔

☆☆☆

۱۔القرآن ۲: ۴۴

۲۔القرآن ۶۱: ۲۔۳

۳۔المرتضے، امیر المومنین ابو الحسن سیّدنا علی۔نہج البلاغہ۔مترجم، مفتی محمد وسیم اکرم القادری، ترتیب و تشکیل، محمد الیاس عادل، اعظم پبلیکیشنز جامع مسجد دہلی: مارچ، ۲۰۱۶ء، ص۔۷۵۷۔

۴۔ایضا، ص۔۷۸۸

سبق اردو نومبر 2025
52

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی بحیثیت ماہر تعلیم

(اردو درس وتدریس کے حوالے سے)

شاہجہاں خلجی

ریسرچ اسکالر

مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھپور (راجستھان)

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کا اردو تعلیم کے لئے ایک اہم کارنامہ ان کی مشہور زمانہ کتاب 'اردو درس وتدریس' ہے۔ جس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف طلبہ اساتذہ بلکہ اردو کے شائقین کے لئے بڑی کارآمد ہوئی ہے۔ ہندوستان کے اردو علاقوں میں پڑھی اور سمجھی جاتی ہے، کئی یونیورسٹیوں کالجوں اور مدرسوں کے مشقی تدریس کے شعبوں میں رائج ہے۔ اردو اساتذہ کی آسامیوں کے لئے مقابلہ جاتی امتحانات میں اس کتاب سے اردو کے طلبہ استفادہ کرتے ہیں۔

یونٹ {1} زبان کی مہارتیں

1-اردو زبان کی تدریس کے مقاصد اور اہمیت

اُردو زبان کی تدریس کے مقاصد۔ زبان پڑھانے کے خصوصی مقاصد

2-زبان۔ درس وتدریس کا عمل اور زبان کی مہارتیں

درجہ وار تدریسی عمل اور متوقع مہارتیں۔ بولنے کی مہارت: اعراب، علامات

تشدید، نون غنہ، واؤ معروف، واؤ مجہول، یائے معروف ومجہول، واؤ معدولہ، واؤ مرکب عطفی، کھڑا زبر اور ۃ، الف مقصورہ (ی)، تنوین۔ رموزِ اوقاف۔ حروف شمسی۔ حروف قمری

3-پڑھنے کی مہارت: بلند خوانی اور خاموش مطالعہ

4-لکھنے کی مہارت: رسم الخط اور اس کی قسمیں۔ خط نسخ۔ خط نستعلیق۔ خط شکستہ۔ حروف کی مختلف ترکیبی صورتیں۔

حروف تہجی کی قسمیں، مفرد حروف ومرکب حروف۔ دوچشمی (ھ) سے بننے والے حروف۔ بناوٹ کے اعتبار سے حروف کی ترتیب۔ اردو میں خوش نویسی کی اہمیت

9-اردو کا مروجہ تعلیمی نظام (نوعیت، مسائل، حل تجاویز)

انتظامی لحاظ سے اسکولوں کی نوعیت طلبا کا معیار۔ طالبات کے تعلیمی مسائل۔ اردو تعلیم پر مکاتب کے اثرات۔ ترک تعلیم (جمود و ضیاع)۔ اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل۔ اردو تعلیم اور سماج۔ عوام کی دلچسپی تدریسی مسائل اور ان کے حل۔ اردو تعلیم وتدریس کے فروغ کے لئے چند بنیادی تجاویز۔

یونٹ {2} مقاصد

12-ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو تدریس

(تعلیمی پالیسی، معیار و مقاصد اور نصاب)

تعلیم کی تین سطحیں۔ قومی تعلیمی پالیسی اور معیار۔ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر اردو تدریس کے عام مقاصد۔ درجہ وار زبان کے معیار کا تعین۔ جماعت وار عام مقاصد۔ پہلی اور دوسری جماعت کے مقاصد۔ تیسری چوتھی اور پانچویں جماعت کے مقاصد۔ ثانوی سطح پر اردو پڑھانے کے مقاصد۔

یونٹ {3} اصناف کی تدریس

15-اردو ادب کی مختلف اصناف کی تدریس

اصنافِ نثر کی تدریس تدریس انشاء۔ املا اور نقل، خط، درخواست، فارم، رپورٹ، مضامین، انشائیہ۔ تدریس انشاء کے لیے منصوبۂ سبق۔ تدریس انشاء کے مقاصد۔ تمہید اعلانِ سبق۔ مضمون کی اصلاح، مضمون کا اعادہ، غیر درسی مشاغل۔

16-تدریسِ قواعد قواعد کی نوعیت، تعریف، قواعد کا منصوبۂ سبق۔

قواعد کے منصوبۂ سبق کا نمونہ۔ تدریسی مقاصد، مقاصد عمومی، مقاصد خصوصی، سابقہ معلومات، معاون اشیاء، تمہید۔ مدرس کی وضاحت، اعلانِ سبق۔ تدریسِ سبق۔ چارٹ نمبر 1، تدریس قواعد، اسم۔ چارٹ نمبر 2، اسم کی قسمیں۔ چارٹ نمبر 3، اسم عام یا نکرہ کی قسمیں۔ عملی کام، اعادہ، گھر کے لئے کام۔ نمونے کا قواعد کا منصوبۂ سبق عنوان، ضمیر۔ اسم اور اس کی قسمیں۔ صفت اور اس کی قسمیں۔ ضمیر اور اس کی قسمیں۔ فعل اور اس کی قسمیں۔ حرف اور اس کی قسمیں۔ مترادفات، متضاد۔ محاورے، ضرب المثل۔ مرکب الفاظ، سابقے، لاحقے۔ ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کے طریقے۔

جملے کی اقسام، مبتدا، خبر، مفرد، مرکب جملے اور ان کی قسمیں، معنوی اعتبار سے جملے کی قسمیں: جملے کی ترکیب نحوی۔ ہمزہ کا استعمال۔

17-اصنافِ شاعری (غزل نظم) کی تدریس

غزل کا منصوبۂ سبق۔ غزل پڑھانے کے مقاصد، تمہید۔ سبق

سبق اردو نومبر 2025
53

،اعلانِ سبق۔نمونے کی بلند خوانی،غزل کا جائزہ، یا تلخیص۔تفہیم عبارت، استحسانِ غزل،اعادہ۔اختتامی بلند خوانی،گھر کے لئے کام۔

18۔افسانوی ادب کی تدریس (ڈرامہ،داستان،ناول،افسانہ) تدریس ڈرامہ

یونٹ{4} منصوبہ

32-اردو تدریس کے لئے منصوبہ بندی کی ضرورت اور اہمیت

سالانہ منصوبہ ، یونٹ کا منصوبہ۔منصوبۂ سبق،ہربارٹ کا منصوبۂ سبق۔پہلی منزل،دوسری،تیسری،چوتھی منزل۔تمہید،اظہار سبق، مظاہرہ،اجتماع ۔مضامین ، پانچویں منزل ، عمل۔منصوبۂ سبق کا خاکہ۔نمونے کا منصوبۂ سبق نثر۔نمونہ کا منصوبۂ سبق نظم

33-اردو میں تدریسی مواد کا تجزیہ

تدریسی مواد کا تجزیہ۔مواد کا خاکہ، تجزیہ کا عمل۔سبق کا تجزیہ۔سبق کی قسمیں۔سبق کے تجزیے کے اہم نکات۔زبان کے اہم اجزاء،تدریسی سامان

یونٹ{5}

34-اردو تدریس میں اندازۂ قدر

اندازۂ قدر کی نوعیت اور اس کی قسمیں۔سوال نامہ کی تشکیل۔سوالات کی قسموں کے تحت مقاصد کے مطابق،عنوان کے مطابق مقررہ نمبر۔بلیو پرنٹ۔اندازۂ قدر کے لیے سوالات کی قسمیں۔اندازۂ قدر کے لیے معروضی سوالات کی ساختی تشکیل

35۔مسلسل اور جامع اندازۂ قدر

36-اردو زبان میں اصلاحی تدریس

اصلاحی جانچیں،اصلاحی ٹیسٹ پیپر۔ذہانت کی جانچ،دماغی جانچ۔اصلاحی تدریس کی ہدایات۔اصلاحی تدریس کے نکات۔کمزور طلبا کی پہچان اور ان کی تدریس۔ذہین طلبا کی تدریس۔خصوصی ضرورت والے بچوں کی پہچان اور تدارک۔

مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر فاروق انصاری (NCERT) کے مطابق ''ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی کتاب'' اردو درس وتدریس'' اس سمت میں اٹھایا گیا ایک قدم ہے موصوف نے ۳۸۸/ابواب پر مشتمل اس کتاب میں اردو زبان کے آغاز زبان کے آغاز وارتقا سے لیکر پڑھنے پڑھانے کے طریقوں جملہ مہارتوں نیز اسکولوں میں درس وتدریس کے جُڑے پہلوؤں کو اس میں شامل کرنے کی سعی کی ہے اس میں زبان کی مہارتیں ۔اُردو نصاب، اصناف کی تدریس، مروجہ تعلیمی نظام، مائکرو ٹیچنگ، عملی تحقیق اندازۂ قدر اور تدریس منصوبہ بندی جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔آخر میں ایک مضمون'' راجستھان میں اُردو زبان کا تعلیمی پس منظر'' بھی شامل ہے۔جو صوبے کی تعلیمی صورت حال کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔

اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ اسکولی سطح پر اردو درس وتدریس کے میدان میں حیرت انگیز تبدیلیاں جگہ پا چکی ہیں جن کی روشنی میں مشمولات کو نئے سرے سے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو زبان کی درس وتدریس سے جُڑے پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے فرائض منصبی کا نباہ کرتے ہوئے جو کچھ فیض حاصل کیا، اسے تحریری شکل میں پیش کر دیا ہے، میری خواہش ہے کہ جدید تقاضوں کے مدِّ نظر رکھتے ہوئے نئے جدید علمی، تکنیکی، اور تعلیمی تحقیقات، اور تعلیمی تحقیقات کی روشنی میں اسے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

سبق اردو نومبر 2025

54

ڈاکٹر سید تقی عابدی اور فیض فہمی

صدف صدیقی

ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد یونیورسٹی،

جودھپور (راجستھان)

فیض فہمی میں فیض کی تقریباً 56 کتابوں کا تعارف اوران کی تفصیل شامل کی۔ ملک و بیرون ملک کے تقریباً 330 ادیبوں، ناقدوں اور محققین کے مضامین اس کتاب میں موجود ہیں۔ اور کچھ انٹرویوز بھی شامل کیے جو صحافیوں اور ادیبوں نے وقتاً فوقتاً لیے تھے۔

تقی عابدی صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے بغیر کسی ادارے، انجمن یا اکادمی کے سرمایۂ فیض سے اردو دنیا کو فیض پہنچایا۔ اور دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ماہر فیض کی حیثیت سے انہوں نے تقریباً 40 تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے وہ تمام مضامین فیض فہمی میں شامل کئے۔ اس بارے میں تقی عابدی صاحب اس کتاب کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں :

پیش لفظ :

فیض تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

جس شخص کے راستے کا ہر نقشِ قدم منزل ہو، جو راہِ یار کو یادگار بنادے، جو وفا شعار اور غم گسار ہو، اُس کا شمار کیوں نہ نابغۂ روزگار میں ہو؟

فیض کی سوسالہ سالگرہ کے موقع پر فیض فہمی پر یہ دستاویز اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تصنیف و تالیف کی گئی ہے تاکہ فیض کی حیات اور شخصیت کے ساتھ ساتھ اُن کی ادبی اقدار کا ہر زاویہ نظر سے جائزہ لیا جاسکے۔ ہم جانتے ہیں کہ فیض کی حیات اور اُن کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ اُن کی شاعری کی طرزِ فُغاں اور اُن کی نثر کی طرز بیاں پر سیر حاصل کام نہ ہوسکا بلکہ کچھ قدیم تنقیدی، تشریحی، تفسیری اور تحلیلی تحریریں تکراری صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ اس کتاب میں حتی المقدور اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارا مقصد چوں کہ ایک مستند دستاویز کی تصنیف اور تالیف ہے اس لئے درجنوں جدید مضامین کے علاوہ اس میں اُن تمام مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے جن سے عامی اور عالم دونوں مستفید ہوسکیں اور یہ کتاب مصنفین، محققین اور اسکالرز کے لئے سودمند اور مددگار بن سکے۔ ہم نے دانستہ طور پر فیض فہمی میں اُن مضامین کو شامل نہیں کیا جن میں گذشتہ قدیم مطبوعہ مقالوں اور مضامین کے ہیئت سے حصوں کو قینچی اور گوند کی مدد سے کسی حوالے کے بغیر پیش کیا گیا تھا۔

ہمیں تکرار اور مضمون نگار کی تحقیر گوارا نہ تھی، کیوں کہ بہر حال فیض فہمی میں وہ اصلی مضامین موجود ہیں اس دفتر فکر و نظر میں وہ مضامین بھی نظر نہیں آئیں گے جن میں فیض شناسی سے زیادہ مضمون نگار کی خود شناسی موجود تھی۔ بہ قول جمیل مظہری تھوڑی بہت خودنمائی تو فطری حسن ہے۔

بقدرِ پیمانۂ تخیل، سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ہم نے خود چالیس سے زیادہ مضامین اُن موضوعات پر تحریر کیے ہیں جن پر کام کم یا اصلاً نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اس مصحف میں مضمون کی اصلیت، حوالوں کی صداقت، کتابت کی صحبت اور طباعت کی نفاست کا خاص خیال رکھا، تاکہ اس خوب صورت صحیفہ کو محراب فن میں سجاسکیں۔ اس کے باوجود اگر اغلاط رہ گئے ہوں تو ہمیں مطلع کریں تاکہ اشاعت دوم میں غلطیوں کی پاک سازی ہوسکے۔

آخر میں ہم مشکور ہیں کرنل انور احمد، ڈاکٹر بیدار بخت، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب اور اطہر حسین رضوی کے جنھوں نے کتابوں، رسالوں، تصویروں اور مستند حوالوں کو فراہم کر کے ہماری مدد کی۔ جناب اظہر غوری ہمارے خاص شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے عمدہ پروف ریڈنگ، عالی کمپوزنگ اور خوب صورت پرنٹنگ سے اسے یادگار بنایا۔

فیض احمد فیض پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کے مضامین جو اس کتاب کی زینت ہیں مندرجہ ذیل ہیں :

فیض کا زندگی نامہ، فیض مشاہیر کی نظر میں، فیض کی شاعری (تشریح، تجزیہ، تبصرہ)، فیض کی غزل کا مقام، کلام فیض، عربی فارسی الفاظ اور تراکیب کا گلدستہ، فیض کی نظم کی وسعتیں، کلام فیض پر فیض کا ریویو، فیض کی دولتِ تنہائی کا جائزہ، فیض مصورِ نقوشِ خدوخالِ حسن، فیض اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدریں، کون بڑا؟ جوش یا فیض (ادبی محاسبہ یا گروہی مغالطہ)، فیض اور بادہ و ساغر، فیض کے کلام میں غلطیاں اور اسقام (منصفانہ تجزیہ)، فیض کے انٹرویو (28 اشخاص 450 سوالات)، فیض کی تقریظیں (تخلیق و تنقید کی وحدت)، فیض منظوم ترجمہ ''پیام مشرق''، تحقیقی مقالہ، فیض کا ادبی مناظرہ بعنوان ''پریم چند''، فیض کا عقیدہ (مستند حوالوں کی روشنی میں)، فیض کی صحت اور بیماریاں (خطوط کی روشنی میں)، فیض کے خطوط سے ہمیں کیا ملا؟، یاد یار مہرباں، فیض اور مصطفی زیدی (رشتہ جو موتیوں سے ڈھکا رہا)، فیض اور نوبل پرائز، فیض بہ نام افتخار عارف (مفید مختصر اور مستند دستاویزات)، قصہ سازش اغیار کہوں یا نہ کہوں؟ فیض کا مرثیہ امام، فیض نے انٹرویو لیا، نذرانۂ عقیدت، اے بسا آرزو کہ خاک شد، فیض کے بہتر ادبی

سبق اردو نومبر 2025
55

نشتر، فیضؔ نے کن کتابوں کا مطالعہ کیا، فیض کے لطیفے، فیض کی نعت، شام غربت، فیض اور ایرانی انقلاب، فیضؔ ایک صحافی، جو میرا تمہارا رشتہ ہے، جدول تصانیف، تخلیقات فیضؔ پر ایک نظر، فیضؔ پر مرتبہ کتب ورسائل، فیضؔ پر مرتبہ مضامین کا ذخیرہ، فیضؔ کا غیر مدون کلام۔

فیض فہمی ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق وتنقید اور تدوین کی بے مثال کتاب ہے جو مشہور شاعر فیض احمد فیضؔ کی سوانح اور ادبی وشعری خدمات کا تحقیقی جائزہ ہے۔ اردو شعروادب کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے۔ فیضؔ کی زندگی اور شاعری پر ناقدین ومحققین نے بے شمار مضامین لکھے اور اردو ہندی انگریزی رسائل میں فیضؔ نمبر شائع ہوئے۔ ان کا صد سالہ جشن بھی منایا گیا اسی موقع پر تقی عابدی صاحب نے اپنی منظم ادبی فکر اور تحقیق سے فیضؔ پر مضامین لکھے اور دیگر ناقدین سے بھی فیضؔ کی شاعری پر مضامین لکھوائے۔ پھر ان سب مضامین کو یکجا کر کے 'فیض فہمی' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ تقی عابدی صاحب نے اپنی فکر وجستجو اور دیگر ناقدین سے رابطے کے سبب فیض پر مضامین لکھوائے۔

نکات اس طرح ہیں :

☆ فیض فہمی میں فیض احمد فیضؔ کی 56 کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ 1402 صفحات پر مشتمل ہے۔

اس میں 330 ناقدین اور ادیبوں کے مضامین ہیں جو فیضؔ کی شعری اور ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

☆ ڈاکٹر تقی عابدی نے دنیا بھر کے رسائل، اخبارات اور کتب سے استفادہ کر کے فیض فہمی کی تکمیل کی ہے۔

☆ فیض فہمی ڈاکٹر تقی عبدی کا تجدیدی کارنامہ ہے۔ وہ ترقی پسند شاعر اور اردو ادب کے عالمی شہرت یافتہ فنکار تھے۔ ان کی شاعری میں جذبات، احساسات وتفکرات کا خزانہ ہے۔

☆ فیضؔ نے جن لفظوں کا انتخاب کیا ہے ان میں غنائیت اور موسیقی ہے۔

☆ ڈاکٹر سید تقی عابدی عالمی سطح کے مصنف اور شاعر ہیں وہ محقق ناقد اور ماہر رثائی ادب ہیں۔

انہوں نے ہر ممکن تحقیقی اور تنقیدی مزاج کے ساتھ مرتب کی ہے جو فیض فہمی کے انمول خزانے سے مالا مال کرتی ہے۔

فیض فہمی میں فیضؔ کا وہ کلام بھی شامل کیا ہے جس کی تدوین کلیات 'نسخۂ وفا' میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ فیض کی صحافتی خدمات کو بھی منظر عام پر لائے۔ فیض کی نثری اور صحافتی خدمات کو ''فیض فہمی'' میں خصوصی مقام عطا کیا۔

فیضؔ کے سیاسی کردار پر بھی تقی عابدی نے مضمون لکھا۔ جس کا عنوان ''فیض اور ایرانی انقلاب'' ہے۔ فیض فہمی میں فیض احمد فیضؔ کے اہم خطوط اور تصاویر شامل کی ہیں، ان سے فیض فہمی میں اضافہ ہوتا ہے۔

فیض احمد فیضؔ کی غزل گوئی اور نظم گوئی کی جدید تراکیب اور علامتوں وتشبیہات کے اضافہ کو فیض فہمی میں خصوصیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فیض نے معانی ومطالب اور غنائیت کی دولت سے سرفراز کیا۔ فیض کی عوام میں دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ گلوکاروں نے ان کی غزلوں اور نظموں کو مترنم آواز میں پیش کیا جو مقبول عام ہیں۔

Sadaf Siddiqui
Research Scholar
Maulana Azad University Jodhpur (Rajasthan)
Mob : 9414804136

Dr. Azizullah Shirani
Supervisor
Department of Urdu
Maulana Azad Univeristy
Jodhpur (Rajasthan)

سبق اردو نومبر 2025

56

اختر الایمان کی نظم نگاری

ڈاکٹر شکیل خان

گیسٹ فیکلٹی, گورنمنٹ شری کرشنا راو پوار پی۔جی۔
کالج دیواس۔ایم۔پی۔
موبائل نمبر۔9617454169

اختر الایمان جدید دور میں اپنے لب ولہجہ، آہنگ اور شعری روایت میں اپنی انفرادیت کی بنا پر سب سے الگ دکھائی دیتے ہیں ۔ ابھوں نے جدید اردو نظم کے فنی اور معنوی دائرے کو وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔عام طور پر انکی نظموں میں جدّت پسندی پائی جاتی ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے جدید خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے غزل کی بجائے نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔انہوں نے نظم کو تجربات،تنوع اور ہیئت واسلوب کی تازگی سے آشنا کیا۔انکے کے خیال میں مشاعروں کی روایت سے اردو شاعری کو بہت نقصان پہنچاہے وہ کہتے ہیں کہ غزل سننے کی چیز ہے اور جس کی مشاعروں میں بھی جگہ ہے۔لیکن اگر کسی فکر انگیز اور پیچیدہ نظم کو اسی صورت میں اچھی طرح سے سمجھا جا سکتا ہے جب پہلے مصرعے سے لیکر آ کری مصرعے تک پوری نظم نگاہوں میں ہو انہوں نے کئی بار اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ نظم سننے کی چیز نہیں پڑھنے کی چیز ہے۔وہ رومانوی اور ہلکی پھلکی شاعری سے بیزار تھے۔انہیں غزل اس لئے بھی نا پسند ہے کہ ان کے نزدیک غزل کسی پیچیدہ اور طویل تجربے کو پیش کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی ،غزل کے دو مصروں میں کسی بھی قلبی واردات کو پیش کرنا مشکل ہے۔اس سلسلے نظم کی تعریف کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں۔

''نظم کا کوئی بھی شعر منفرد نہیں ہوتا وہ اپنے سے پہلے اور اپنے بعد کے شعر سے وابستہ ہوتا ہے بلکہ لفظ نظم کے ساتھ ساتھ شعر کا تصور ذہن میں نہیں آنا چاہیے ۔نظم اشعار میں تقسیم نہیں ہوتی بہت سے مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر مصرع دوسرے سے وابستہ ہوتا ہے اس لئے جب تک نظم ختم نہ ہو جائے اس کا سمجھ میں آنا ضروری نہیں۔نظم ویسے بھی سننے کی چیز نہیں پڑھنے کی چیز ہے اگر کوئی نظم چودہ مصرعوں پر مشتمل ہے اور پہلا مصرعہ آخری مصرعے سے اس طرح وابستہ ہے کہ جب تک پہلا ذہن میں نہ ہو آخری سنا نہ جائے نظم واضح نہ ہوا ایسی نظم کو سن کر کبھی اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہئے یہ غلطی ہم کبھی کبھی کر جاتے ہیں اور ایسی نظموں پر بلا وجہ مبہم ہونے کا اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔''

(''اختر ایمان مقام وکلام''۔مرتبہ۔ڈاکٹر محمد فیروز۔ص۔۱۵۲)

اختر الا یمان ایک علامتی شاعر تھے۔اس لئے انکی نظمیں غور و فکر کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں انکی چھوٹی چھوٹی نظموں میں بھی شدتِ احساس پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے جو نظم کے مفہوم کا گہرا اور جامع شعور رکھتا ہے۔انہوں نے ایک اہم بات کہی ہے کہ نظم کے مرکزی خیال و موضوع کی تشکیل اس طرح کی جائے کہ غیر ضروری عناصر لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔اردو کے نظم نگار خواہ وہ انیسویں صدی کے ہوں یا بیسوی صدی کے نظم کو توضیحی ٹکڑوں سے صاف نہ کر سکے نتیجے میں نظموں میں وحدت تاثیر کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔اختر الا یمان نے نظم کے تصور کو عملی

سبق اردو نومبر 2025
57

صورت میں بھی پیش کیا۔انکی ذہنی کیفیات اور جذباتی ردعمل کا آغاز ان کی ناکام محبت سے ہوا۔اپنی معصوم آرزوؤں کی پامالی انھیں سماجی حقائق کی سنگلاخی کا احساس گہرا کرتی ہے اور وہ ردعمل کے طور پر اپنی ذاتی کی خاموشیوں میں محصور ہونے کی خواہش کرتے ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''سونی راہوں میں بگولے ہیں ابھی گرم سفر
آج میں تیرے شبستان سے چلا جاؤں گا
(وداع)

مٹ ہی جائیں گے یہ کمزور نقوش
جم کے بہ جاتی ہے قطبیں پہ برف
زندگی ہائے نہ فردا ہے نہ دوش
عمر ہو جاتی ہے اک آہ میں صرف
(مال)

خواب دیکھا تھا سی دامن کی چھاؤں میں کبھی
لیکن ایسا خواب جس کا مدعا کوئی نہیں
میں اکیلا جارہا ہوں اور زمین ہے سنگلاخ
اجنبی وادی میں میرا آشنا کوئی نہیں
(لغزش)

اختر الایمان کے شعری تصورات کا اندازہ ان کی داخلی دنیا ہی سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔انکی داخلی دنیا گہرے سایوں، ویران سناّٹوں کی دنیا ہے جہاں ہر قدم پر احساس تنہائی روح کو کرب میں مبتلا کرتا ہے۔لیکن اس کے باوجود شاعر کو یہ داخلی دنیا عزیز ہے۔انکے یہاں داخلی دنیا سے وابستگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ خارجی دنیا کی نیرنگیوں اور حشر سامانیوں سے لاتعلق ہیں بلکہ وہ داخلی دنیا کے حصاروں کو پھاند کر خارجی دنیا کی قیامت ساماں زندگی میں بھی برابر شریک نظر آتے ہیں۔

اختر الایمان کی ابتدائی زندگی مفلسی اور بے کسی میں گزری ہے گھر سے بھاگ کر وہ یتیم خانے میں رہے ظاہر ہے انکو قدم قدم پر بیچارگی اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔انکی نظم ایک ''لڑکا'' ان کے اس ذہنی رویے کی عمدہ مثال ہے۔یہ لڑکا فطرت کے حسین آغوش میں پروان چڑھا ہے۔اسے حسین شبزہ زاروں، گلستانوں ندی نالوں سے عشق ہے لیکن وہ بڑا ہوکر شہر کی چکا چوند میں گم ہوکر اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے اور شہری زندگی کی خودغرض، لالچ، اور کاروباریت اس کی روح میں اس طرح پیوست ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے اس کو پہچان پانا بھی مشکل ہوجاتا ہے:نظم ''ایک لڑکا'' اس کی ایک اچھی مثال ہے جس کا ابتدائی بند ملاحظہ فرمایئے:

دیار شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم، جھٹپٹے کے وقت راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں ناٹک ٹولیوں میں ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم، تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں جلتی ریت یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ سا، کبھی جیوں چشم خوں بستہ
ہوا میں تیرتا خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا، مڑتا
مجھے اک لڑکا، آوارہ منش، آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تند چشموں کا، رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کررہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر ایمان تم ہی ہو؟

اختر الایمان نے بیشتر اسالیب بیان سے استفادہ کیا ہے۔کسی ایک مخصوص اسلوب کو اپنے اظہار کا وسیلہ نہیں بننے دیا۔انکے اسلوب میں اتنی لچک اور گنجائش ہے کہ وہ ہر طرح کے اسلوب کو اپنا کر اپنے رنگ میں ڈھالنے کا ہنر رکھتے تھے اسی لئے زیادہ تر انکے کلام میں تکرار نہیں ملتی بلکہ تنوعات کا ایک دلکش احساس ملتا ہے۔انہوں نے خود کو کبھی کسی مخصوص

سبق اردو نومبر 2025
58

دائرے میں قید کر کے نہیں رکھا ان کی ہر نظم میں
لہجہ اور آہنگ کا ایک منفرد اندازِ بیان ملتا ہے۔انہوں نے ن۔م۔راشد اور میرا جی کی طرح ہیئت میں تجربے نہیں کئے، تاہم ان کی نظمیں فکر کی گہرائی اور طرز ادا اور جدت کی بنا پر جدیدیت کا آہنگ رکھتی ہیں۔انہوں نے زیادہ تر معریٰ نظمیں لکھی ہیں، ان میں مغربی نظموں کے اتباع میں مصرعوں کی ترتیب اس طرح دی گئی ہے کہ ہر مصرع ایک معنوی اکائی نہیں ہوتا بلکہ ایک مصرع دوسرے، تیسرے اور اسی طرح باقی مصرعوں سے مل کر مکمل نظم بنتی ہے: چند نظموں سے انکے کلام کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

نگر نگر کے دیس دیس کے، پربت، ٹیلے اور بیاباں
ڈھونڈ رہے ہیں اب مجھکو، کھیل رہے ہیں میرے ارماں
میرے سپنے، میرے آنسو، ان کی چھلنی چھاؤں میں جیسے
دھول میں بیٹھے کھیل رہے ہوں بالک باپ سے روٹھے روٹھے!

(بُلاوا)

شبِ ماہ تو ہے سحر بھی تو
کہ فغاں بھی تو، ہے اثر بھی تو
یہ تری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
نہ مٹا کسی کو سنبھل سنبھل
سرِ راہ یوں نہ بہک کے چل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنھیں حسن سے بھی لگاؤ ہے
جنھیں زندگی بھی عزیز ہے!

(سرِ راہ گزارے)

اختر الایمان کی نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جدید نظم نگاری میں کے بہترین شاعر ہیں۔انہوں نے اردو ادب کو ایک نہالب ولہجہ عطا کیا ہے۔اردو نظم نگاری ایک بلندی بخشی ہے۔
اختر الایمان اردو نظم نگاری میں ایک انفرادی رنگ کے مالک ہے انکی نظمیں اپنے عہد کی سچی آواز ہیں اس بات سے قطعی انکار نہیں کہ وہ صرف اور صرف نظم کے شعر ہیں
اختر الایمان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''گرداب'' جو ۱۹۴۳ میں منظر عام آیا۔اس میں انکے ابتدائی دور کی نظمیں شامل ہے۔لیکن اس دور میں ہی انھوں نے بعض بنیادی حقائق پر غور وفکر کرنا شروع کر دیا تھا جیسے مٹتی ہوئی تہذیت، ظاہر اور باطن کی کشمکش اختر الایمان کی انفرادی طرز اور انکی اپنی آواز جہاں ہیں صاف سنائی دیتی ہے وہ ان انا مجموعہ کلام ''تا یکِ سیارہ'' ہے

سبق اردو نومبر 2025
59

فروغ فرخزاد کی فلمی دنیا

محمد عارف
جواہر لال نہرو یونیورسٹی آف نیو دہلی
ای میل
mohdarafqazi99@gmail.com

فروغ فرخزاد کی شخصی وفکری نشوونما ایران کی تاریخ کے حساس دور میں ہوئی، ایران کی سیاسی وسماجی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ ایران پر رضاہ شاہ برسراقتدر تھا، مشروط حواہاں کو گرفتار کیا جارہا تھا۔ ان حالات کے اثرات روزمرہ کے تمام افعال پر پڑے حصوصاً فارسی زبان وادب پر۔ ۔فارسی ادب بھی نئی پن کی شکل اختیار کر چکا تھا اور ساتھ ہی ناول اور داستان کا رواج دن بدن اپنے عروج کی طرف گامزان تھا۔ اس سے پہلے جو سیاسی، سماجی اور اخلاقی مضامین کمزور پڑھ چکے تھے انہیں دوبارہ سے جگہ ملنے لگی۔

ایران کے ایک شاعر بہروز جلالی فروغ فرخزاد کے بارمیں لکھتے ہیں

وہ عظیم تھی وہ عصر حاضر کی شخصیت تھی
تمام کھلے آفاق سے اس کا واسطہ تھا
وہ آب وگل کی راگنی کو خوب سمجھتی (فہمیدہ ریاض، ص9)

فروغ فرخزاد کا شمار نیما یوشیخ کے پیروکاروں میں ہوتا ہے، اگر وہ اس راہ پر چلتی رہتی تو بیسویں صدی کی مشہور شاعرات کی طرح ان کا نام بھی سرفہرست ہوتا۔ فروغ فرخزاد کی پیدایش تہران میں ہوئی ان کے والد کا نام سرھنگ فرخزاد تھا اور ماں کا نام بانوران تھا۔ فروغ فرخزاد نے مختصری زندگی (اکتیس بتیس) میں فروغ فرخزاد مختلف یورپی ممالک کا سفر کیا، اٹلی، فرانس، انگلینڈ وغیرہ ساتھ ہی وہاں کے ادبی خلقوں سے بھی متاثر ہوئی (مظہر امام، ص 134) بچپن میں آپنے گھر کی ایک معمولی سی لڑکی تھی، ان کی سہیلی لکھتی ہیں فروغ کو مضمون لکھنے میں کافی مہارت حاصل تھی اس کے باوجود بھی وہ مضمون کے گھنٹہ سے سخت نفرت رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ اسکول میں ہی سلائی اور کڑئی کا کام سیکھنا شروع کیا وہ لکھتی ہیں کے وہ مصوری کے ساتھ ساتھ شعروشاعری میں چار چاند لگا سکتی ہیں (اقبال حیدری، ص 34) سولہ برس کی عمر میں اپ سے پندرہ برس بڑے اپنے معشوق شاپور سے شادی کرالی جو کے ماں باپ کی مرضی کے خلاف تھی۔ شوہر کے ساتھ اہواز چلی آئی۔ ایک سال کے بعد بیٹا پیدا ہوا جس کا نام کامیار رکھا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ شعروشاعری میں خاصی دلچسپی بڑھتی گی اور دن بدن ذہن کی تازگی میں بھی نکھار آتا گیا۔ دوسری طرف شوہر کی بے چینی اس کی بے باکانہ شاعری کے اظہار کو برداشت نہ کرسکا، بلاآخر طلاق دے دیا، اور فروغ فرجزاد بچے سے محروم ہوگی جس کی تلاش میں عدالتوں کے چکر کاٹے کچھ فایدہ نہ ہوا (ص، 10، ایضا) فروغ اس کے بعد اپنے والد کے پاس رہنے لگی، مختصری زندگی میں تمام رسم رواج کے خلاف اپنی اواز کو بلند کیا۔ فروغ کی گھریلوں زندگی اور پیشہ وارنہ مصروفیت سے اندازہ لگتا ہے کے وہ اپنی زندگی میں ان تمام رسم و رواج سے اوپر اٹھ کر جینا چاہتی تھی، معاشرے کے طے کردہ راستہ پر چلنے کے باوجود آپنا راستہ اختیار کرنا پسند کرتی تھی (ص، 11)

فروغ کی شاعری پر لکھنا میرا موضوع نہیں ہے۔ لیکن یہ جانا ضروری ہے کے انہوں نے شاعری کس نوعیت کی لکھی اور کن کن موضوعات کو جگہ دی، فروغ کی شاعری کے پانچ مجموعے شایع ہو چکے ہیں جن میں، اسیر، دیوار، عصیان، تولد دیگری، ایمان بیاورم با آغاز فصل سرد، ان کے مجموعات کے نام سے ہی واضح ہوجاتا ہے، محبت، جدائی، وطن سماجی نہ برابری، حکومت کا ظلمانہ روایہ اور غلط پالیسی ان کی شاعری میں گہرے مشاہدات اور قلبی واردات صاف صاف جتے جاگتے ثبوت پیش کرتا ہے۔ مثلاً ان کے چند اشعار (منظر امام، ص 138)

نمی دانم چہ می خواہم خدایا بدنبال چہ می گویم شب وروز
چہ می جویدنگاہ خستہ من چرا افسردہ است این قلب موموز
گریزانم ازین مردم کہ بامن بظاھر ھمدم دیکرنگ ھستند
ولی در باطن از فرط حقارت بدامانم دوصد پیرایہ بستند
دل من، ای دل دیوانہ من، کہ میسوزی ازاین بیگانگی ھا
مکن دیگر زدست غیر، فریاد خدارا بس کن این دیوانگی ھا

ان اشعاروں سے معلوم ہوتا ہے کے کس طرح فروغ فرخزاد اپنے دل کی بے چینی، روحانی اضطراب اور انسانوں سے مایوسی کا اظہار کرتی ہیں

سبق اردو نومبر 2025
60

اور مزید کہتی ہیں لوگ بظاہر دوست اور ہم دم نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت میں حسد، حقارت اور منافقت سے بھرے ہوے ہیں (دیوان فروغ)

''فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں فروغ کو فطرت سے اتنی گہری محبت اور عقیدت تھی جس لوگوں کو آپنے خدا سے'' (ص 12)

فروغ بیک وقت، فلم ساز، موسیقی نگار، نقاشی گری اور شاعرہ بھی ہیں ۔ جسے طرح میں اس سے پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کے فروغ نے اسکول میں ہی سلائی اور کڑائی وغیرہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اور اس پر کام بھی کیا تھا، جب شوہر سے اپنی بے باکانہ شاعری کی وجہ سے علیحدہ ہوگی تو آہستہ آہستہ اس کا رجحان فلم کی طرف مایل ہوتا گیا اور فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئی ۔ دراصل انگلستان کے سفر کے بعد فلم بنانے کی دلچسپی پیدا ہوئی، اور اس کے ایک سال بعد انگلینڈ چلے گے جہاں پر فلم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور ابراھیم گلستان کے ساتھ مل کر کئی فلموں میں کام کیا۔ سال 1958ئمیں انگلستاں کا سفر کیا جس کا مقصد وہاں رہ کر فلم کے تمام تر غرض وغایت کی باریک بنی سے مطالعہ کیا جاے، وہ لکھتی ہیں فلم میرے پاس ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے میں اپنے خیالات کی مکمل طور سے عکاسی کر سکتی ہوں (اقبال حیدری، ص 47) سیمنا برای من یک راہ بیاں است'' سال 1955ئا یک فلمی کمپنی گلستان سے وابستہ ہوگی، مختصر وقت میں اس کمپنی کو کینڈا سے شادی بیاہ میں فلم بنانے کی پیشکیش کی گئی، اس میں فروغ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اداکاری بھی کی ۔ اسی دور میں ان کی ملاقات ابراھیم گلستان سے ہوئی جو ایران کی فلمی دنیا میں قابل فخر شخصیت کا حامل تھا۔ اور بعد میں بہت ساری فلموں میں اس کے ساتھ کام کیا۔ فروغ نے جو سب سے پہلی فلم بنائی وہ ''یک آتش'' کے نام سے تھی جس کی کہانی مزدوراں طبقہ کے اردگرد گھوم تی ہے، کہانی کچھ اس طرح سے ہے کے مزدور کنواں کھود رہے ہوتے ہیں اچانک سے گیس سلینڈ میں آگ لگ جاتی ہے، یہ آگ کس طرح سے مزدوروں کی محنت اور صحت پر اثرانداز ہوتی ہے۔ فروغ نے انتھگ محنت سے فلم میں اتنی جان ڈالی کے اس فلم کو اٹلی کے بارہویں فیسٹیول میں سونے اور کانسی کے تغمہ کے انعام سے نوازا گیا۔ یہ فروغ کے لے بہت بڑے اعزاز اور حوصلہ افزائی کا مقام، یہی وہ مقام تھا جس کی بدولت آگے چل کر مختلف فلموں کو بنانے میں کامیاب ہوئی اور ایران کی فلمی دنیا میں نام پیدا کیا (اقبال حیدری، ص 140)

فروغ فرح زاد با ابراهیم گلستان یاری کرد و سفرهای بسیاری از کشورهای متعدی کردند، وی در فلم با ابراهیم گلستان بازی کرد ۔ مدتی به تهیه گفتاردرفلم های گونا گون از'' آب و گرم '' ''موج و مرجان و خار '' ''دریا ''و ''خانه سیاه ''است پرداخت (thesis.p.70)۔ از سال 1337 به کارهای سینمایی پرداخت و هنر هفتم در زندگی او جائی پیدا کرد ۔ در این ایام است که او با ابراهیم گلستان نو سینده و هنرمند آن روزگار همگام می بینم، آن دو با هم در گلستان فلم کار می کردند۔ و سال 1361 در ما بهار برای تهیه یکی فلم هائی برجسته از دربار جذامیان به شهر تبریز رفت و در آن جا یکی فلم بنام ''خانه سیاه است'' بر احساسهای زندگی های جذامینا را بنیان کرد، و سفرهای تبریز در زندگیش یکی سفر یادگار را گرفت (جعفر حقی، ص، 130،) فروغ کی سب سے مشہور فلم ''خانہ سیاہ است'' کے نام سے ہے جو جذامیوں کے حالات و واقعات کو سامنے رکھ کر بنائی گئی ہے اس فلم کی کہانی سے معلوم ہو جاتا ہے کے کس طرح وہ ایک معذور اور تندرست انسان کی ہر بات پر سوچتی اور ان کے احوال کو وہ بیان کرتی ہیں ۔ وہ لکھتی ہیں کے جذامیوں کو دیکھ کر میرا حال برا ہو گیا میں نے اسیے لوگوں کو بھی دیکھا جو تمام تر انسانی حصوصیات اور احساسات کے باجود بھی اعضا سے محروم تھے۔ اسی طرح سے وہ عورتوں کے بارے میں بھی لکھتی ہیں، کے جذام کی حالت میں کس طرح اپنی زندگی کو بسر کرتی ہیں اور ان تمام مشکلات کے باوجود اپنی فطرت سے سودا نہیں کرتی۔ کہتی ہیں ہار سینگار کو شوق بھی نرا ہے انگلیوں کے گل جانے کے بعد بھی وہ شوق کو اسی طرح پالتی ہیں جس طرح پہلے اور ساتھ ہی بیان کرتی ہیں بچوں کو دودھ پیلانا اور لوری گانا ان کے لے مشکل تھا لیکن وہ کوشش کرتی رہتی تھی ۔ اپنے بارے میں کہتی ہیں کے میں ان کے ساتھ ہی دسترخوان بر کھانا کھاتی ان کے ساتھ بات چیت کرتی رہتی، لیکن ان کی بات چیت سے یہ کبھی نہیں لگا کے زندگی سے تنگ ہیں۔

فروغ کی اس فلم کو اٹلی میں سال کی بہتریں فلم کے ایواڈ سے نوازا گیا۔ (اقبال حیدری، ص، 42) اس طرح فروغ نے اپنی خدمت کو قوم کی فلاح و زبان کی ترویج و ترقی کے لے صرف کردی۔'' اقبال حیدری

سبق اردو نومبر 2025
61

لکھتے ہیں ، دکھی انسانیت کی خدمت کے اعتراف میں اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے فروغ کی زندگی کے بارمیں دو فلمیں بنائی جن میں ایک ادھ گھنٹہ اور ایک پندرہ مینٹ پر مشتمل ہے، اور مزید لکھتے ہیں اگر فروغ زندہ ہوتی تو ''مدر ٹریسا'' کی طرح نوبل پرایزٔ کی حق دار ہوتی ''(اقبال حیدری،ص 42)

فروغ نے اس فلم کے ذریعہ بچوں ، نوجوانوں ،مرد و عورت ہر ایک کا برابر سے ذکر کیا ہے۔اس میں سب سے دلچسپ اور پور اثر بات یہ ہے کے ،حکومت کی ناقص کارگردی کو اجاگر کیا اور بتایا کے لوگ کس طرح دکھ درد اور تکلیف میں مبتلا ہیں ۔اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود ان کی بصارت پر پردا پڑا ہوا، حالات کو بہتر بنانے کے لے کوئی اقدام نہیں اٹھتے۔

ماحاصل

فروغ کی فلمی دنیا مختصر مگر نہایت اثر انگیز رہی ان کی واحد معروف ڈاکیو مینٹری ''خانہ سیاہ است'' آج بھی عالمی سینما میں ایک سنگ میل اہمیت کی حامل ہے۔فروغ کی فلمی دنیا میں بہت سے نقطہ نظر قابل دید ہیں،فروغ نے اپنی فلموں کے ذریعہ انسانی درد و کرب و سماجی حقیقت کو بے خوف منظر عام پر پیش کیا ہے۔فروغ نے معاشرے کی ان چیزیوں کو سامنے لانے کی کوشش کی جو اکثر و بیشتر لوگ کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔گھر سیاہ میں کوڑھ کے مریضوں کی زندگیوں کو علامتی شکل میں پیش کیا ہے اور جو کچھ بھی اس کہانی میں بتایا گیا وہ صرف وصرف انسان کے احترام کے خاطر ہے ، زندگی کا جمال صرف چیزوں کی حوبصورتی میں نہیں ، بلکہ انسان کے وجود اس کے درد اور اس کے صبر میں بھی موجود ہیں۔ فروغ کے نزدیک دکھ درد صرف دکھ درد نہیں زندگی کی معنوینت کا حصہ ہے ،۔فروغ فرخزاد نے حکومت کے بدسلوکی نہ انصافی اور اجتماعی بے حسی پر خاموشی سے تنقید کی ہے۔انسان کے وقار اور زندگی کی پوشیدہ خوبصورتی کو شاعرانہ اور فلمی طریقہ سے،مگر حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتی ہیں

حوالاجات:

ڈاکٹر منظر امام، جدید ادبیات ایران، کتاستان چندوارہ مظفر پور بہار، 1996

فہمیدہ ریاض، کھلے دریچے، وعدہ کتاب گھر کراچی، 1998

اقبال حیدری ، فروغ فرخ زاد زندگی اور شاعری ، کراچی پاکستان

محمد جعفر حقی ، چون سبوے تشنہ، خیبان دانشگاہ کوچہ میترا، ۴۷۳۱

محمد پرویز عالم ، پی ایچ ڈی ، دانشگاہ جواہر لال نہرو نیو دھلی ۳۱۰۲

نام محمد عارف
جواہر لال نہرو یونیورسٹی آف نیو دہلی
ای میل mohdarafqazi99@gmail.com

سبق اردو نومبر 2025
62

وحشتؔ کلکتوی: حیات اور تصنیفات

ڈاکٹر شہباز ارشد

Dr.Shahbaz Arshad
Assistant Professor
Department of Urdu
K.B.N University
Gulbarga,Karnataka
Contact:6281262057
arshad@kbn.university

بہت شورش انگیز تھے میرے ارماں
بہت حسرت افزا میری داستاں ہے

وحشتؔ کلکتوی

بنگال کا خطہ زمانہ قدیم سے ہی علم وفن اور شعر وسخن کا گہوارہ رہا ہے۔اس علم وفن اور شعر وسخن سرزمین میں بڑے بڑے ادبا اور شعرا جنم لیے۔انہیں عظیم شاعروں میں ایک نام ''وحشت کلکتوی'' کا بھی ہے۔جن کی حیات اور ادبی خدمات اردو ادب کے نہ صرف اہم سرمایہ ہیں، بل کہ قابل رشک بھی ہیں۔اس مختصر سے مضمون میں ہم اسی ممدوح کی حیات اور ادبی خدمات کا تحقیقی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔وحشتؔ کلکتوی کا اصل نام: حکیم سید رضا علی اور تخلص وحشت تھا۔ادبی دنیا میں وحشتؔ کلکتوی سے مشہور ہوئے۔18 نومبر 1881 میں شہر کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم محلے کی مسجد میں ہوئی۔پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم پائی۔شمسؔ فرید پوری سے شاعری میں اصلاح لی جو داغ کے شاگرد تھے۔

وحشتؔ کلکتوی کا خاندانی پیشہ ''طبابت'' تھا۔ان کے دادا ''حکیم غالب علی'' غالب کی سرزمینؔ دلی سے کلکتہ آئے تھے۔ جو بہت ہی مشہور اور ماہر حکیم تھے۔لوگ کہتے تھے کہ ان کے پاس مردہ بھی جا کر زندہ ہو جاتا تھا۔ابتدا میں انہوں نے اپنا دواخانہ نواب سراج الدولہ کے شہر علی پور میں کھولا تھا، مگر علی پور کے مقابلے، کلکتہ زیادہ ترقی یافتہ تھا اس لیے کلکتہ آ گئے۔وحشتؔ کے والد مولوی حکیم شمشاد علی نے خاندانی پیشہ ''طبابت'' کے بجائے تعلیم کا میدان منتخب کیا اور انگریزی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔مگر عمر نے وفا نہ کی اور وہ وحشتؔ کو یتیم کر گئے۔گھر میں دولت کی فراوانی تھی اس لیے والد کی وفات کے باعث ''وحشت'' کی تعلیم وتربیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی۔مگر زیادہ عرصے تک تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔کیونکہ ذرائع آمدنی کا واحد ذریعہ معمر دادا کے کمزور کندھے پر تھا۔اس لیے اب آہستہ آہستہ پستینی جائیدادیں بکتی جا رہی تھی۔1898 میں وحشتؔ نے انٹرنس پاس کیا اور گھر کے ناگفتہ بہ حالات دیکھ کر دواخانے میں کمپاؤنڈر کی نوکری کر لی۔محنت اور لگن کی وجہ سے 1903 میں امپریل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گیے۔ان کے ذمہ ترجمہ کا کام لگایا گیا۔وہ فارسی مکتوبات کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا کرتے تھے۔یہ وہ درخواستیں ہوا کرتی تھیں جو برصغیر کے کونے کونے سے تاج برطانیہ کو بھیجی جاتی تھیں۔دن بھر بیٹھے قلم گھسیٹتے رہو اس لیے یہ ملازمت ان کو پسند نہ تھی لیکن اب پستینی جاگیرداری نہ تھی۔1906 میں ان کی شادی مولوی محمد عباس علی ڈپٹی مجسٹریٹ کی بیٹی زبیدہ خاتون سے ہوئی۔اب ان کے کندھوں پر ڈبل ذمے داریاں آ گئیں۔اس لیے یہ نوکری ان کی مجبوری تھی۔نوکری کی ناپسندیدگی کے غم سے چھٹکارا پانے کے لیے وحشتؔ شاعری کا سہارا لیتے تھے۔شاعری سے ان کی دل چسپی بچپن سے تھی۔انہیں شاعری سے فطری لگاؤ تھا، جس کی وجہ گھر میں شاعرانہ ماحول تھا۔وحشتؔ کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جہاں شعر وشاعری وراثت میں ملی تھی۔ان کے دادا حکیم غالب علی ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ان کے والد ماجد مولوی حکیم شمشاد علی فارسی اور اردو کے اچھے شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ایسے ماحول میں وحشت کا، شاعری سے دل چسپی ناگریز تھی۔بچپن میں انہوں نے اردو کے مشہور شعرا کے دواوین کا مطالعہ اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا۔انہیں مومن کی غزلیں بہت پسند تھیں۔ایک جگہ وحشتؔ نے خود لکھا ہے کہ:

''بات یہ ہے کہ میں
لڑکپن ہی سے اساتذہ
کا کلام شوق سے
پڑھا کرتا تھا اور بعض
اشعار کا دل
پر گہرا اثر ہو جاتا تھا۔مومنؔ کا تغزل
میرے لیے بڑی
جاذبیت
رکھتا تھا اور اس

سبق اردو نومبر 2025
63

کا تناسب الفاظ بھی
مجھے بھلا لگتا تھا۔''
(ادبی دنیا، لاہور، وحشت نمبر، 1973)

وحشتؔ شاعری پڑھتے پڑھتے شاعری کرنا شروع کردئے، اب ملازمت کے درمیان جب انہیں فرصت کے لمحات میسر ہوتے شاعری کرتے۔ سب سے پہلے انہوں نے مولوی خلیل احمد، پھر شمس کلکتوی سے اصلاح لی۔ وحشتؔ کی شاعری میں شمس کلکتوی کا واضح اثر دکھتا ہے۔ شمس کلکتوی سے وحشتؔ کلکتوی کا نہ صرف شاگردانہ رشتہ تھا بل کہ والہانہ عقیدت بھی تھی، جس پر وحشتؔ نازاں تھے ایک شعر میں وحشت نے اس عقیدت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ:

ع
غلام معتقد ہوں وحشتؔ اس صاحب مروت کا
نصیبوں سے ملا ہے آج شمسؔ نکتہ داں مجھ کو

اب وحشتؔ کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا ملازمت، اور فارغ اوقات میں شاعری، یہ سلسلہ چلا اور چلتا رہا؛ یہاں تک کہ 1910 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''دیوان وحشتؔ'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ ''دیوان وحشتؔ'' 1909 میں ترتیب دیا گیا اور 1910 میں ''ستارۂ ہند پریس'' کلکتہ سے منظر عام پر آیا۔ ''دیوان وحشتؔ'' کی ترتیب اور طباعت کے تعلق سے خود وحشتؔ کے لکھے ہوئے دو فارسی قطعات ملتے ہیں:

قطعۂ ترتیب دیوان:

شد مرتب دفتر اشعار من — مرحبا اے طالع مسعود نظم
خواستم وحشت سن تاریخ را — گفت ہاتف ''کعبۂ مقصود نظم''

قطعۂ طابع دیوان: 1909

ایں کہ دیوان من است آئینۂ حال من است
داشتم آں چہ بدل راز نہانی گفتم
گفتۂ دور شباب است کہ وحشتؔ تاریخ
''عیش افزا سخن عہد جوانی'' گفتم
1910

وحشتؔ کے، 140 صفحات پر مشتمل اس دیوان میں غزلیں، نظمیں، رباعیات، متفرقات اور اخیر میں کچھ فارسی اشعار بھی شامل ہیں۔ تاہم دیوان کی ابتدا غزل سے ہوئی ہے۔ پہلی، وحشتؔ کی مشہور غزل:

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا
طور شہید ہو گیا جلوۂ دل نواز کا

''دیوان وحشتؔ'' میں غزلوں کی کل تعداد 102 ہے۔ جس میں 892 اشعار ہیں۔ سب سے زیادہ غزلیں ردیف ''ی'' کی ہیں۔ دیوان وحشتؔ کی غزلیں وحشتؔ کے عنفوان شباب کا نتیجۂ فکر ہے۔ جس کی وجہ سے جہاں ان غزلوں میں کچھ فنی کمیاں نظر آتی ہیں وہیں ٹھہراؤ سے یہ غزلیں خالی محسوس ہوتی ہیں۔ وحشت نے اس کمی اور خامی کو دور کرنے کے لیے مسلسل مشق شاعری کرتے رہے۔ اور پھر وہ دن بھی آیا کہ ان کا شمار بنگال کے بہترین شاعروں میں ہونے لگا۔ ان کی شاعری کی دھوم پورے بنگال میں مچنے لگی۔ ہر مشاعرے کی وہ ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ مرشد آباد، عظیم آباد، ڈھاکہ، ہوگلی، جیسے بڑے شہروں سے تشنگان علوم ان کی بارگاہ میں آتے، زانوئے ادب طے کرتے، شاعری میں اصلاح لیتے اور اپنے ساتھ اپنے استاذ کا نام روشن کرتے اب ان کا شمار صرف شاعر کی حیثیت سے نہیں بل کہ استاذ الشعرا میں ہونے لگا تھا۔ ان کی اس کام یابی اور شہرت نے نہ صرف اپنوں کو متاثر کی بل کہ انگریز حکومت بھی ان کی اس کام یابی سے متاثر ہوئے۔ 1925 ''میں برٹش حکومت نے وحشتؔ کو خان صاحب'' کے خطاب سے نوازا۔ 1926 میں کلکتہ میں ''گورنمنٹ اسلامیہ کالج'' (موجودہ : مولانا آزاد کالج، کلکتہ) کی بنیاد پڑی تو وحشتؔ نے اپنی پرانی نوکری سے استعفی دے کر اس کالج میں اردو لیکچرار مقرر ہوئے اور ترقی پا کر صدر شعبۂ اردو و فارسی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج کی ملازمت کے دوران انہوں نے کالج میں ایک سالانہ مشاعرے کی بنیاد بھی ڈالی جس نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیا۔ اس مشاعرے کی گونج حکومت برطانیہ تک پہنچی، حکومت نے اس ادبی کاوش سے خوش ہو کر وحشتؔ کو ''خان بہادر'' جیسے اہم خطاب سے سرفراز کیا۔ اسلامیہ کالج میں دس سال کی ملازمت کے بعد 1936 میں جب وحشتؔ سبک دوش ہوئے تب تک ان کے درجنوں شاگرد تیار ہو چکے تھے۔ سبک دوشی کے بعد کچھ عرصے فراغت کی زندگی گزارنے کی وجہ سے گزر بسر کے لیے بچی کچی پستینی جائیدادیں بیچنے کی نوبت پھر سے آ گئی کیوں کہ اس درمیان 1941 میں وحشتؔ کی دوسری شادی ہو گئی تھی۔ جائیدادیں بکنے کا قلق وحشتؔ کو شدت سے تھی، ایسے میں انہیں مالی تعاون کی سخت ضرورت تھی۔ ادھر 1941 میں ''لیڈی برابورن کالج'' کلکتہ کا قیام عمل میں آیا جس میں شعبۂ اردو اور فارسی کے لیے ایک پروفیسر کی ضرورت تھی، انتظامیہ کمیٹی کی نظر وحشتؔ پر پڑی، دعوت دی گئی اور وحشتؔ نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے، تشنگان علوم کی پیاس بجھانے اور مالی دشواریوں کے پیش نظر 1941 ''لیڈی برابورن کالج'' کلکتہ میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ وہ ایک مدت تک اس عہدے پر فائز رہے، انہوں نے اردو اور فارسی شعبے کو بحسن و خوبی سنبھالا۔ اس درمیان ان کی طبیعت علیل رہنے لگی۔ لیکن انہوں نے اپنے فرائض سے روگردانی نہیں کی۔ جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو مجبوراً 1948 میں اپنے عہدے سے سبک دوشی لینی پڑی۔ 1947 میں پاکستان قیام کے بعد وہ 1950 میں مشرقی پاکستان یعنی موجودہ ''بنگلہ دیش'' چلے گئے۔

وحشتؔ کلکتوی کا دوسرا دیوان ''ترانۂ وحشت'' کے نام سے

سبق اردو نومبر 2025
64

شائع ہوا تھا۔''ترانۂ وحشت'' تاریخی نام ہے،جس کی کل تعداد 1370ھ برآمد ہوتی ہے ،جو مطابق ہے 1950 کے ہے؛ کیوں کہ اس کی ترتیب اورتدوین کا کام 1950 میں مکمل ہوئی تھی ،جب کہ''ترانۂ وحشت'' کو 1953 میں رشید احمد چودھری نے مکتبۂ جدید،لاہور، پاکستان سے شائع کرایا تھا۔''ترانۂ وحشت'' دو حصوں میں منقسم ہے:غزلیات اورمنظومات۔علاوہ ازیں دیوان میں کچھ متفرقات اشعار بھی شامل ہیں۔دیوان کی ابتدا''حمد'' سے ہوئی ہے اور پھر غزل کی ہیئت میں نعت رسول اکرم ﷺ پیش کی گئی ہے۔1910ء میں''دیوان وحشت'' کی اشاعت کے بعد سے 1950 تک تقریباً چالیس سال کی شاعری جس میں غزلیں،نظمیں،مراثی،قطعات،رخصت اور سہرا جیسے مختلف اصناف کی شاعری اس میں موجود ہیں۔ترانۂ وحشت کی اشاعت کے متعلق وحشتؔ صاحب، ظفر ہاشمی کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''ارادہ ہے کہ ایک
مجموعہ شائع کروں
اور دیوان اول کو ضمیمہ
بناؤں۔اس وقت
دیوان کے نقل کرنے
میں مصروف ہوں''

(خط بہ نام :ظفر ہاشمی، 31اگست 1950،بہ حوالہ:مکاتیب وحشت،ص 111)

ترانہ وحشت کے مطالعہ سے بھی یہ واضح ہوجاتا ہے کہ دونوں دیوان گرچہ مختلف اوقات میں منظر عام پر آئے ہیں لیکن دونوں کی ترتیب اورتدوین میں بہت زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔''ترانۂ وحشت'' کوئی ضخیم دیوان نہیں ہے تاہم''دیوان وحشت'' کی شمولیت نے اسے کچھ ضخیم بنادی ہے۔ترانۂ وحشت بھی دو حصوں میں منقسم ہے:حصہ اول غزلیات اور حصۂ دوم منظومات ۔ترانہ وحشت کی پہلی اشاعت میں وحشتؔ کلکتوی کی ایک بہترین تصویر بھی ٹائٹل پیج سے پہلے شامل کی گئی ہے۔دیوان وحشت کی طرح ترانۂ وحشت کی ابتدا بھی حمد باری تعالی سے کی گئی ہے۔جو فارسی زبان میں ہے۔اس کے بعد نعت رسول کریم ﷺ شامل کی گئی ہے۔

1950ء میں''ترانۂ وحشت'' ترتیب اورتدوین کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔اس کے بعد سے وحشتؔ کلکتوی کی موت تک انہوں نے جو شاعری کی تھی،وہ ان کا تیسرا دیوان''نقوش وآثار''میں شامل کی گئی تھی۔''نقوش وآثار'' وحشتؔ کی رحلت کے ایک سال بعد 1957ء میں شائع ہوا۔ترانۂ وحشت کی ترتیب سے وحشتؔ کے انتقال تک کی مدت چوں کہ زیادہ نہیں تھی ،اس لیے''نقوش وآثار'' کتاب چہ کی شکل میں شائع ہوا تھا۔اس تصنیف کو''تتمۂ ترانۂ وحشت'' بھی کہا جاتا ہے۔یہ وحشتؔ کی تیسری اورآخری تصنیف تھی،جسے ان کے انتقال کے بعد''مکتبۂ عارفین''ڈھاکہ(موجودہ بنگلہ دیش) نے شائع کیا تھا۔''نقوش وآثار'' کو تتمۂ ''ترانۂ وحشت'' کہا جاتا ہے۔

اردو نثر کے غیر افسانوی ادب میں خطوط نگاری کی ایک اپنی روشن روایت رہی ہے ۔آج سے پانچ چھ دہائی پہلے جب موبائل فون کا تصور تک نہیں تھا ایسے وقت میں ایک دوسرے سے رابطے کا واحد ذریعہ خطوط نویسی تھا۔اردو نثر کا ایک بڑا سرمایہ خطوط کی شکل میں موجود ہے۔وحشتؔ کلکتوی نے بھی اپنی پچہتر سالہ زندگی میں اپنے دوست ،احباب ،عزیز واقارب میں سے 123 شخصیتوں کو مختلف اوقات میں 182 خطوط لکھے تھے؛جن کے مطالعے ،ان کی حیات اور شخصیت کو سمجھنے میں بہت کارگر ثابت ہوئے ہیں۔ان خطوط کو حاجی شمس الدین احمد عازم نے ترتیب دے کر''مکاتیب وحشت'' کے نام سے''بزم شاکری'' کلکتہ سے 1957ء میں شائع کرائے تھے۔ان خطوط کو ترتیب دینے کی اجازت وحشتؔ سے''بزم شاکری'' والوں نے مانگی ،توانہوں نے نہ صرف اس سے منع کیا بل کہ اپنے ان مکاتیب کو اس لائق نہیں سمجھا کہ انہیں منظر عام پر لائے جائیں۔وحشتؔ کا یہ قول ملاحظہ فرمائیں:

''بعض لوگ خطوط
خوب لکھتے ہیں جن
میں مزے مزے کی
باتیں ہوتی ہیں۔ایسے
خطوط اگر چھاپ
جائیں تو مطبوع طبائع
ہوں ۔میں بہت خوش
ہوں گا اگر بزم شاکری
اپنے ارادے
کو جونا قابل عمل ہے
ترک کردے۔''

(خط بہ نام :محمد عارگ وامقؔ،مکاتیب وحشت ،مرتبہ شمس الدین احمد عازم،ص 120,121)

مکاتیب وحشت میں 182 مکاتیب شامل ہیں،لیکن ان خطوط کے علاوہ وحشتؔ کے اور بھی کچھ مکتوبات ہیں جو مکاتیب وحشت میں شامل نہیں کیے گئے ہیں۔چند خطوط کراچی پاکستان سے شائع ہونے والا موقر رسالہ''مہر نیمروز'' کے''وحشتؔ نمبر'' میں موجود ہیں ۔جب کہ کچھ مکاتیب لاہور، پاکستان سے شائع ہونے والا ادبی جریدہ''نقوش'' میں ملتے ہیں۔نیز وحشتؔ کے پانچ مکاتیب ،سید علی عرفان نقوی کی مرتبہ کتاب''وحشت شناسی'' میں شامل ہیں۔اس طرح وحشت کے کل مکاتیب

سبق اردو نومبر 2025
65

کی تعداد تقریباً دو سو تک پہنچتی ہے۔

وحشتؔ کلکتوی کا نام آتے ہی ہمارے اذہان میں ایک شاعر کی تصویر گردش کرنے لگتی ہے۔لیکن وحشتؔ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ بہترین نثر نگار بھی تھے۔مختلف اوقات میں ملک کے موقر رسائل وجرائد میں ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے تھے۔جن کے مطالعے سے ان کی تحقیقی بصیرتوں کا پتا چلتا ہے۔ان مضامین کو ان کے ایک قریبی ،جمال احمد صدیقی نے جمع کر کے ''مضامین وحشت'' کے نام سے ترتیب دے کر 1982ء میں ''مغربی بنگال اردو اکادمی'' سے شائع کرایا تھا۔''مضامین وحشت'' پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے مرتب رقم طراز ہیں:

> ''مضامین وحشت
> ؔ''علامہ رضا علی
> وحشتؔ مرحوم کے ان
> مضامین کا مجموعہ ہے
> جو انہوں نے
> ۱۹۰۸ سے
> لیکر ۱۹۵۴ء تک لکھے
> اور ملک کے مختلف
> رسائل میں شائع
> ہوئے۔یہ مضامین
> مخزن
> 'لاہور خاور' ڈھاکہ، جدید اردو، کلکتہ، جادو' ڈھاکہ۔ماہ
> نور' کراچی۔مہر نیمروز' کراچی
> میں شائع ہوئے
> تھے۔''

(جمال احمد صدیقی، مقدمہ ''مضامین وحشت'' ص7)

240 صفحات پر مشتمل اس مجموعۂ مضامین میں مرتب کتاب کا ''پیش لفظ''، ڈاکٹر عبدالرب (ریڈر: شعبۂ اردو، کلکتہ یونی ورسٹی) کا تفصیلی وتحقیقی مقدمہ، بارہ مضامین، دو ریڈیائی تقریر اور ایک ایک مکتوب شامل ہیں۔پہلا مضمون ''وحشت بہ زبان خود'' کے نام سے ہے، باقی گیارہ مضامین کے عنوانات بالترتیب کچھ اس طرح ہیں: ''کلام ولی''، ''شیخ علی حزیں''، ''غنیمت''، ''تغزل میں اصلاح کی ضرورت''، ''اردو کا تعلق بنگالہ سے''، ''اصلاح غزل''، ''مولانا حالی کی غزل گوئی''، ''بنگال کا ایک شاعر۔۔۔سید محمود آزاد''، ''بنگالہ کا ایک شاعر۔۔۔قاضی محمد صادق اختر''، ''عبدالغفور نساخ''، ''شمس ؔ کلکتوی''، ''مکتوبات وحشت (بہ نام: ڈاکٹر عندلیب شادانی)''، ''شاعری اور ادب''(ریڈیائی تقریر)، ''ریڈیائی تقریر بہ سلسلہ قاضی نذرالاسلام سال گرہ' اور ''نشاط رفتہ'' (تبصرہ)۔

مجموعہ ''مضامین وحشت'' میں شامل مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ ''وحشتؔ'' کے دو مضامین: ''غالبؔ کا انداز بیان'' اور ''غصہ اور اس کے نتائج'' بھی منظر عام پر آئے، لیکن یہ دونوں مضامین جو بالترتیب ''نقاد'' آگرہ جنوری 1920 اور ماہ نامہ ''شمس'' کلکتہ دسمبر 1907ء میں شائع ہوئے تھے ''مضامین وحشت'' میں شامل نہیں کیے گئے ہیں۔مذکورہ بالا مکاتیب اور مضامین کے علاوہ وحشتؔ کلکتوی کے کچھ مقدمے، کچھ تقاریض اور کچھ پیش لفظ بھی تحریر کیے ہیں۔ 1952 میں ڈھاکہ میں اردو ادب کا یہ تابندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گئے اور ڈھاکہ کے عظیم پورہ قبرستان میں مدفون ہوئے۔

اردو کے کلاسیکی شعر وادب پر وحشتؔ کلکتوی مرحوم کے بڑے احسانات ہیں ،جنہیں اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اردو شاعری اور خطوط نگاری کی تاریخ میں وحشتؔ کلکتوی کا وجود ایک روشن باب کا اضافہ کرتا ہے۔ان کے تذکرے کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ کبھی مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ان کا اس دار فانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی ان کا نام پہلے کی طرح زندہ ہے۔

ع ابر رحمت ان کی مرقد پر گہر باری کرے

کتابیات

۱) وحشتؔ: حیات اور فن، معید رشیدی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
۲) مہر نیمروز، مرتب حسن مثنیٰ ندوی، ادبی پریس، کراچی
۳) ترانۂ وحشت، وحشتؔ کلکتوی، مکتبۂ جدید، لاہور
۴) دیوان وحشت، وحشت کلکتوی،
۵) مضامین وحشت، وحشتؔ کلکتوی ،مرتب جمال احمد صدیقی، مغربی بنگال اردو اکادمی
۶) مکاتیب وحشت، وحشتؔ کلکتوی ،مرتب: شمس الدین احمد عازم، بزم شاکری، کلکتہ
۷) نساخ سے وحشت تک ،مولف: سید لطیف الرحمٰن ،عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ

سبق اردو نومبر 2025
66

تحریک آزادی اور اردو

ڈاکٹر شائقہ آفرین

جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو ا اور دھیرے دھیرے اس کے جبر وظلم کی آگ بڑھنے لگی تو ہندوستانیوں کے سینے میں بھی اس کے خلاف شرارے پھوٹنے لگے۔ آخر کار ایک وقت ایسا آیا کہ انگریزی حکومت کے خلاف مکمل طور سے جنگ چھڑ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں تحریک آزادی کی پہلی جنگ 1857ء میں لڑی گئی جسے غدر سے موسوم کرتے ہیں۔ اس جنگ میں ہندوستانیوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی مگر ان کے دلوں میں لگن اور جذبہ جوان ہوتا رہا۔

جنگ لڑنے کی کئی نوعتیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ نفس نفیس جنگ میں شامل ہوا اور موقع آنے پر شہید بھی ہوئے، دوسرے یہ کہ روپے پیسے خرچ کرنے کے مواقع ہوں تو وہاں سرمایہ دار اپنی پونجی خرچ کرنے مگر ان سب میں الگ ایسی جماعت ہے جس کے پاس صرف قلم کی دولت ہے جس کے ذریعہ عوام کے سامنے صحیح صورت حال پیش کی جاتی ہے۔ یہ ایسی جماعت ہے جو چاہے تو پورے دیش کا مزاج ہی بدل دے اور اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ جماعت اردو ادب کی ہے۔ اردو ادب میں شہر آشوب کا ذکر بہت ملتا ہے جب بھی ملک پر کوئی طوفان ٹوٹا یا انقلاب آیا۔ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے قلم اور دل ودماغ کو سنبھال لیا۔ میر کا یہ شعر دیکھئے جو اپنے درد کی عکاسی کرتا ہے:

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت وتاج کا

اس کے پیچھے ایک احساس اور ایک گہرا ادراک موجزن ہے۔ اس طرح جب انگریزوں کے خلاف غم وغصہ کی آگ بھڑک رہی تھی ، مصحفی یہ کہہ رہے تھے:

ہندوستان کی دولت وحشمت جو کچھ تھی
کافر فرنگیوں نے یہ تدبیر کھینچ لی

حالی کے بارے میں یہ بالکل سچ ہے کہ وہ ملک کی سیاسیات سے بہت پہلے متاثر ہوئے اور اس ضمن میں کئی نظمیں لکھ ڈالیں جن میں سماجی انقلاب کی بھی بازگشت سنائی پڑتی ہے۔ ان کی ایک نظم کے تین اشعار ملاحظہ ہوں:

کہتے ہیں مغرب سے ہوگا جب برآمد آفتاب
عرصہ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
وہ ترقی جو چل کر آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیروزبر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

ان صورت حال سے داغ دہلوی بھی کافی متاثر تھے۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں:

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

تحریر آزادی میں جب ہندوستانیوں پر لاٹھیاں برس رہی تھیں اور سامراجی گھوڑوں کی ٹاپیں دل کو روندرہی تھی، اس وقت بھی ایک شاعر نونہالان وطن اور مجاہدین آزادی کی ہمت افزائی کے لئے کہہ اٹھا:

سر بریدہ تن شکستہ ہڈیاں لاشوں کے ڈھیر
باغیوں کو تخت شاہی پر بٹھا کر لیں گے دم

اور یہ حقیقت ہے کہ جس زبان نے فرنگیوں کی اسکیم اور اس کے نظام حکومت میں زلزلہ پیدا کر دیا وہ یہی اردو تھی۔ آزادی کی لہر کو تیزی اور سرعت بخشنے میں اس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے:

اپنے محبوب سے جب پیار کیا تھا میں نے
کا سنہ سر میں لہو بھر کے دیا تھا میں نے

☆☆

یہ اردو ہی تھی کہ جب روی ٹھاکر
بن کے بابولوک مان تلک جیسے قدآور

مجاہدین آزادی نے کرانتی امر رہے سمجھانا چاہا تو عوام کو یہ بات پوری طرح سمجھ نہ آسکی اور سردار بھگت سنگھ اور دنکیشور دت نے اسمبلی ہال میں اردو کے لفظ اور ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ لگایا تو ہندوستانیوں کو انقلاب کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔

حالی اور شبلی کی طرح ظفر علی خاں اور حسرت موہانی بھی نظم ونثر میں اپنا خون جگر بہا رہے تھے۔ اور عوام میں ان کی تحریروں سے بے قرار اور بے چینی کے ساتھ ساتھ جوش بھی پیدا ہو رہا تھا۔ ظفر علی خاں اپنا پیغام اس طرح دے رہے تھے:

زندگی ان کی ہے دہن ان کا ہے دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قربان ہوگئیں

سبق اردو نومبر 2025
67

حسرت کو یہ امید تھی کہ:

زمانہ وہ جلا آنے والا ہے جس میں
کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا

اکبر کو تو برٹش حکومت سے سخت چڑ تھی اور ان کی پوری شاعری کے پس منظر میں ہے۔ ایک شعر دیکھئے:

محفل ان کی ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا

اقبال تو بھلا غلامی کے باغی ہی تھے۔ انگریزوں کے ہمیشہ مخالف رہے:

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

جب دوسری جنگ آزادی میں 1939ء میں ہندوستان کی بھی شرکت کا اعلان کیا گیا تو ہندوستانیوں میں غم و غصے کی لہر اور تیز ہوگئی۔ بیزاری اور نفرت تو پہلے سے ہی تھی۔ جوش نے للکارا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام لکھا:

کس زباں سے کہہ رہے آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوع انسانی کے مستقبل سے تم واقف نہ تھے

اس طرح جوش نے انگریزوں کو جھنجھوڑا جس کا بہت بڑا اثر پڑا۔ ان کے علاوہ دوسرے شعراء بھی تھے۔ جو مجاہدین آزادی کی حیثیت سے اپنے قلم سے لڑ رہے تھے۔ ان کے علاوہ اردو ادب کا دوسرا حصہ صحافت بھی ہے۔ گرچہ اسے خالص ادب نہیں کہا جاتا مگر اردو صحافت کا جو رول اس تحریک آزادی میں رہا وہ اہم ہے 1903ء میں مولانا حسرت موہانی نے علی گڑھ سے اردو معلیٰ نکالا تھا تو انگریزوں کی نیندیں حرام ہوگئیں اور نتیجتاً پریس ضبط ہوا اور خود بھی حوالات میں گئے۔ 1907ء میں شانتی نرائن بھٹناگر نے الہ آباد سے ہفتہ وار ''سوراجیہ'' نکالا جس کی وجہ سے اس کے سارے ایڈیٹروں کو جیل کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ اس کے بعد مولانا محمد علی نے 1912ء میں ''ہمدرد'' شروع کیا اور انگریزی میں ''کامریڈ'' پہلے سے نکل رہا تھا۔ انہوں نے پیغام دیا۔ ایسی خدا فروش حکومت جو خلافت اسلامیہ سے برسر پیکار ہو اس سے اور اس سے ملحق اداروں اور محکموں سے کس طرح کا تعلق جائز نہیں۔

اسی زمانہ میں مولانا آزاد نے ''الہلال'' 1912ء میں ہفتہ وار شروع کیا۔ وہ مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی بیداری لانا چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''میں نے 1912ء میں اردو جرنل ''الہلال'' جاری کیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ''الہلال'' نے مسلمانوں کو تعداد کے بجائے ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہوکر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے پہلے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ خلافت اور سوراج میں ہے۔''

ٹھیک اسی طرح مولانا ظفر علی خاں نے ''زمیندار'' میں جرأت اور بیباکی سے انگریزوں کے خلاف لکھا:

''جب امرتسر میں ہم پر گولیاں آئیں تو ہم سمجھے کہ بوندیں ہیں یہ اہل ہند کے تمنا کی ان کے علاوہ اخبار ''پرتاپ''، ''بندے ماترم''، پیسہ، زمزم، جمہوریت، انقلاب، اجالا وغیرہ اخبارات نکلتے رہے۔ اور ہندوستانیوں کے خون گرماتے رہے۔''

اس وقت ناولوں اور افسانوں میں بھی تحریک آزادی کے نقوش ملتے ہیں۔ پریم چند، بیدی، خدیجہ مستور اور بعد میں اس تحریک سے متاثر ہونے والے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ اس طرح تحریک آزادی میں اردو کا قصہ رہا وہ گراں قدر ہے۔

☆☆☆

Dr. Shaika Afrin
Govt. Urdu Middle School Nazra
P.O. Meghwan, Via : Benipatti
Dist: Madhubani - 847102 (Bihar)
Mob: 7545071660

مائل ملیح آبادی کے ناول حج اکبر کا تجزیاتی مطالعہ

گلفشاں خان

Gulafsha Khan
Research Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus
Lucknow: 226020

ایک پرندہ چیخ رہا ہے مسجد کے مینارے پر
دور کہیں گنگا کے کنارے آس کا سورج ڈھلتا ہے

اردو ادب میں کئی ناول ایسے ملتے ہیں جو ہندوستانی معاشرت اور تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک اہم ناول حج اکبر" ہے ، جو صرف ایک داستان نہیں بلکہ ہندوستانی سماج اور بالخصوص گنگا جمنی تہذیب کا حسین مرقعہ ہے۔

مائل ملیح آبادی کا ناول حج اکبر نہ صرف خدمت خلق کی طرف مائل کرتا ہے۔ بلکہ معاشرے میں پھیلی ہوئی نفرت، فرقہ پرستی، ناانصافی اور بے ایمانی کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ یہ ناول گنگا جمنی تہذیب کا آئینہ دار بھی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا ملک مختلف مذاہب ، زبانوں اور ثقافتوں کے میل جول کی روشن تاریخ رکھتا ہے۔ میل جول کا یہی جذبہ آگے چل کر ایک مشترکہ تہذیب میں ڈھل گیا۔ یہاں کی سرزمین ہمیشہ سے رنگا رنگ روایتوں اور باہمی اشتراک کی علامت رہی ہے۔ انہیں روایتوں میں سب سے حسین اور نایاب روایت گنگا جمنی تہذیب ہے جو رواداری ،محبت ، بھائی چارے کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ لکھنؤ، بنارس، آگرہ اور ملیح آباد جیسے شہر گنگا جمنی تہذیب کی بہترین مثال ہے۔ ادب اور ثقافت میں بھی گنگا جمنی تہذیب کی جھلک نمایاں ہے۔ اردو شاعری میں میر، غالب، اقبال ، جوش اور راہی معصوم رضا جیسے شعرا نے انسان دوستی اور اتحاد کا پیغام دیا۔

میرا نام مسلمان جیسا ہے
مجھ کو قتل کرو اور میرے گھر میں آگ لگا دو
لیکن میری رگ رگ میں گنگا کا پانی دوڑ رہا ہے
میرے لہو سے چلو بھر کر
مہادیو کے منہ پر پھینکو
اور اس جوگی سے یہ کہہ دو
مہادیو! اپنی اس گنگا کو واپس لے لو
یہ ہم ذلیل ترکوں کے بدن میں
گاڑھا، گرم لہو بن بن کے دوڑ رہی ہے۔ (راہی معصوم رضا)

اس تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نفرتوں کو مٹاتی ہے اور محبت کو پروان چڑھاتی ہے۔ یہ ہمیں سبق دیتی ہے کہ مذہب یا ذات سے زیادہ اہم انسانیت ہے اور انسانیت کا اصل حسن باہمی اتفاق اور یکانگت میں پوشیدہ ہے۔ مائل ملیح آبادی نے اس ناول میں اسی تہذیبی ہم آہنگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

اس ناول میں مذہبی رواداری کا اہم پہلو ہے۔ کردار ایک دوسرے کے مذہب اور تہواروں کا احترام کرتے ہیں۔ عید کی محفلیں بھی ذکر میں آتی ہیں اور ہولی ، دیوالی جیسے تہوار بھی۔ اس طرح قاری پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ گنگا جمنی فضا میں ہر مذہب کو اپنی شناخت برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے مذہب کی رسومات کو تسلیم کرنے کا حق حاصل ہے۔ گنگا جمنی تہذیب کا حسن ، اس کی رواداری اور ہم آہنگی ناول کے ہر صفحے پر جھلکتی ہے۔

ناول حج اکبر کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں لکھا گیا ایک ایسا ناول ہے۔ جو ہندوستانی معاشرت ، مذہبی ہم آہنگی اور گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں مسلم اور غیر مسلم دونوں طبقوں کی زندگی ، رسم و رواج اور ان کے باہمی تعلقات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک ہی خطے میں مختلف مذاہب کے لوگ ساتھ رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے تہواروں میں حصہ لیتے ہیں اور سماجی مسائل کو مل جل کر حل کرتے ہیں۔ یہی تصویر دراصل گنگا جمنی تہذیب کی اصل روح ہے۔

ناول حج اکبر کا کردار رحمت ہندو مسلم اتحاد اور خدمت خلق کی اعلیٰ مثال ہے۔ وہ گاؤں سے سید صاحب کے ساتھ سفر حج کے لیے روانہ ہوتا ہے لیکن راستے میں ٹرین کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ سید صاحب دوسری گاڑی سے روانہ ہو جاتے ہیں جبکہ رحمت زخمی کی خدمت میں ایسا لگتا ہے کہ اسے گاؤں تک لے جاتا ہے اور پھر گاؤں کے مسائل میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ حج کرنے سے محروم ہو کر وہ گھر واپس آتا ہے۔ پورا گاؤں اسے اسٹیشن پر چھوڑنے آتا ہے ، گاؤں میں سید صاحب سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ بتاتے ہیں کہ میں نے حج کے سارے ارکان تمہارے بعد ادا کیے ہیں۔ تم ہر جگہ مجھ سے آگے آگے دکھائی دے رہے تھے ، رحمت کو یقین نہیں آتا ہے کہ اللہ نے اس کا حج قبول کر لیا ہے پھر سید صاحب کہتے ہیں۔ لوگو، اللہ کے بندوں کی خدمت کرو وہ تمہیں حج اکبر کا ثواب عطا کرے گا۔

ناول کے کرداروں کے ذریعے مصنف نے یہ پیغام دیا ہے کہ ہندوستانی سماج کی اصل طاقت اس کی کثرت میں وحدت ہے۔ یہاں

سبق اردو نومبر 2025
69

مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسانیت کی بنیاد پر رشتے پروان چڑھتے ہیں۔

عام انسان کی طرح ناول نگار کے فکر وعمل کی جولانگاہ بھی یہی دنیائے آب وگل ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات سے دو چار ہوتا اور تجربات حاصل کرتا رہتا ہے۔ انہی تجربات کی روشنی میں جہاں وہ اپنے ماحول کو اپنی ذات سے متاثر کرتا ہے۔ خود بھی اس سے اثر لیتا ہے۔ ہر واقعہ سے متعلق اس کا اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ اور پھر اسی زاویے سے کائنات پر نگاہ ڈالنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک ہی طریقہ غور وفکر کرنے کا اختیار کر لیتا ہے۔ اسے چاہے نقطۂ نظر کہیے، مرکزی خیال کہیے، یا نظریہ حیات، اس کے اعتبار سے ہر شخص اپنی ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

آزادی کے بعد جن ناول نگاروں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا اور عصری زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ ان میں قاضی عبد الستار، غیاس احمد گدی، وہاب اشرفی، احسن فاروقی وغیرہ کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس نوع کے بعض دیگر ناموں میں جن کی تخلیقات کی طرف کم توجہ دی گئی مائل ملیح آبادی کا نام بہت اہم ہے۔ مائل ملیح آبادی ایک ایسے فنکار تھے۔ جو پوری زندگی عصری مسائل سے گھرے رہے، اور اپنے اردگرد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی وثقافتی انقلابات کو مختلف انداز سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے رہے۔ عبدالحلیم شرر کے بعد ناول نگاروں نے تاریخی ناول لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ جن میں مولانا صادق سردھنوی، نسیم حجازی اور پھر مائل ملیح آبادی ایسے ناول نگار ہیں۔ جنہوں نے نری تعداد میں تاریخی ناول تحریر کئے۔ مذکورہ ناول نگاروں کے درمیان مائل ملیح آبادی کی شخصیت زیادہ انقلابی اور تاریخی نظر آتی ہے۔

مائل ملیح آبادی اردو کے ممتاز ناول نگار، افسانہ نگار اور صحافی تھے۔ ان کا تعلق ملیح آباد ضلع لکھنؤ اتر پردیش سے تھا، اسی نسبت سے وہ ملیح آبادی کہلائے۔ مائل ملیح آبادی کا پورا نام عبدالواحد مائل ملیح آبادی ہے۔ یہ قصبہ ملیح آباد لکھنؤ کے آفریدی پٹھانوں کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو اپنی دلیری، شجاعت، روایت، طرز معاشرت، سیاسی سوجھ بوجھ اور خودداری کے لحاظ سے مشہور ہے۔ والد عبدالقادر خان نے مائل صاحب کو ابتدائی تعلیم مقامی مڈل اسکول سے دلوائی اس کے علاوہ اساتذہ اور خاندانی بزرگوں کی صحبتوں کا اثر بھی مائل صاحب پر پڑا۔ اسی لیے شعروادب کا شوق بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ اور فن وشعور میں قدم رکھتے ہی ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگے۔ ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ جہاں تک نثر کا تعلق ہے انہوں نے اپنے ماموں عبدالرزاق ملیح آبادی کی صحبتوں سے حاصل کیا۔ آپ نے متعدد مضامین اور تاریخ اسلام پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ نے مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں ناول لکھ کر اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا، مائل صاحب نے تقریباً ایک سو تیس ناول لکھے ہیں۔

پہلا دور 1900 سے شروع ہوتا ہے جس میں سماجی، اسلامی اور معاشرتی ناولوں کے درمیان میں اکثر انہوں نے تاریخی ناول بھی سپرد قلم کیے۔ جن میں "پاسبان"، "معمار"، "نوروز"، "سفر"، "غزنی دروازہ"، "فلسفی ابن رشد"، "انقلاب 1857" اور لال قلعہ" بہت زیادہ مقبول ناول ہیں۔ جنہوں نے اردو داں حلقوں میں پذیرائی بھی حاصل کی اور ان کے کئی کئی ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔" پاسبان" ایسا ہی ایک ناقابل فراموش ناول ہے۔ یہ ناول 1954 میں نسیم بکڈپو سے شائع ہوا تھا۔ لیکن بعد میں اس کے دوسرے ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔

مائل ملیح آبادی کے تاریخی ناولوں میں سب سے اہم عنصر واقعات کی صداقت ہے۔ مائل ملیح آبادی کے تاریخی ناولوں کی ایک لمبی فہرست ہے جنہیں ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

مائل ملیح آبادی کی تحریروں میں؛

سماجی مسائل

مذہبی رواداری

ہندوستانی تہذیب وثقافت

گنگا جمنی تہذیب کی جھلک

آپ کے سماجی ناولوں میں آبرو، سکھ، گمراہ، بازار، زیتون، کونپل، نیا آدمی، اپنا گھر، خانمہ برباد، شیشے میں بال، برف کی دیوار، روشندان، خزاں کے پھول، تیسری منزل وغیرہ ہیں۔ جب ہم مائل صاحب کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہ مائل صاحب نہ تو ترقی پسند ہیں، اور نہ ہی رجعت پسند بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر لکھنے والا خود اپنے آپ میں ترقی پسند ہوتا ہے۔ چنانچہ مائل صاحب کی اپنی الگ دنیا ہے جو ان کے فن پاروں میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے طرز تحریر اور اسلوب بیان سے پہچانے جاتے ہیں۔

ناولوں میں سیاسی معاشی اور سماجی حالات کا تفصیلی جائزہ اور ان مسائل کا حل یعنی آپ کا ہر ناول کسی نہ کسی مقصد سے جڑا ہوا ہے۔ آپ کا قلم سماج کے کمزور طبقوں، غریبوں، دکھیوں، اور دوسرے سرمایہ داروں کے ہاتھ ستائے ہوئے لوگوں کے لیے اٹھا۔ اور ان لوگوں کے دکھ درد کو جس طرح محسوس کیا اور انہیں کے جذبات میں انہیں کی زبان میں کردار کو سچائی کے ساتھ ہو بہو اسی انداز میں پیش کیا۔

مائل صاحب کے ناول تحریر کرنے کی رفتار کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں۔ کہ کبھی کبھی وہ ایک ہی رات میں مسودہ لکھ ڈالتے تھے۔ انہوں نے کتنا لکھا اور کیا کیا لکھا اس کا مکمل حساب موجود نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مطبوعہ صفحات کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے تقریباً ایک سو تیس ناول سپرد قلم کیے۔ ایک تنقیدی کتاب جوش اور دیار دکن" تحریر کی۔ دو حصوں میں تاریخ ہند کا جائزہ پیش کیا۔ ایک شعری مجموعہ لازوال" مطبوعہ اور دوسرا غیر مطبوعہ لاکلام" مکمل کیا۔ اور سات سو صفحات پر مشتمل رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی سیرت سپرد قلم کی۔ ایک غیر مطبوعہ مسودہ " تخلیق کائنات کا فلسفہ" تحریر کیا اور کئی سارے مضامین لکھے۔

مائل ملیح آبادی کا مطالعہ ہی کم کیا گیا ایسی صورت میں ان کے فکر وفن کا کوئی مطالعہ کیوں کر سامنے آتا۔ ان کے متعدد ناولوں کے مطالعے کے بعد جو نتیجہ میرے سامنے آیا ہے اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

سبق اردو نومبر 2025
70

ناول حج اکبر پہلی مرتبہ مکتبہ دین وادب، لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے جون 1970 میں شائع ہوا تھا۔ناول کے صفحات کی تعداد ۲۲۴ ہے۔ یہ ناول بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

مائل ملیح آبادی نے اپنے اس ناول میں ملیح آباد قصبہ کا ذکر بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

ہندوستان اپنی گوناگوں تہذیب اور زرخیز زمین کے باعث ہمیشہ سے نمایاں رہا ہے۔اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ کے قریب واقع ایک خوبصورت اور تاریخی قصبہ ہے ملیح آباد ،جو اپنی انفرادیت، قدرتی حسن اور ادبی وثقافتی ورثے کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ یہاں کی زمین نہایت زرخیز ہے۔اور باغبانی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ملیح آباد کی تاریخ کئی صدیوں پر محیط ہے یہاں مغلیہ دور میں باغات اور بستیوں کی بنیاد پڑی۔خصوصاً آم کے باغات نے ملیح آباد کو عالمی سطح پر پہچان بخشی ہے۔اس علاقے کی معیشت زیادہ تر باغبانی اور زراعت پر قائم رہتی۔ یہاں پیدا ہونے والے دسہری آم اپنی مٹھاس خوشبو اور ذائقے کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اسی وجہ سے ملیح آباد کو " آموں کا گہوارہ " کہا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ دسہری آم کی پیوندکاری بھی ملیح آباد میں کی گئی تھی۔

ملیح آباد کے گلی کوچے آج بھی گنگا جمنی تہذیب کی جھلک دکھاتے ہیں۔ یہاں مسلم اور غیر مسلم صدیوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ عید کی محفلوں میں ہولی اور دیوالی کی خوشیوں میں سب برابر شریک ہوتے ہیں۔ یہ مشترکہ تہذیب ملیح آباد کی اصل پہچان ہے۔

ملیح آباد صرف باغات کی وجہ سے مشہور نہیں، بلکہ اردو ادب میں بھی اس کی ایک نمایاں پہچان ہیں۔عظیم انقلابی شاعر" جوش ملیح آبادی " کا تعلق بھی یہیں سے تھا۔جوش کی شاعری نے اردو ادب کو نئی بلندی عطا کی۔اور ہندوستانی تہذیب وانقلاب کی عکاسی کی۔ان کے علاوہ بھی کئی ادیب اور شعرا نے ملیح آباد کی سرزمین سے اپنی شناخت بنائی۔

ناول حج اکبر میں اگر ہم سب سے پہلے زبان وبیان کی طرف دیکھیں تو ناول کی اصل خصوصیت یہی ہے۔کہ اس میں اردو کی نرمی شائستگی کے ساتھ ساتھ ہندی کے مقامی الفاظ اور محاورے بھی شامل ہیں۔ناول حج اکبر کے کردار رحمت کی گفتگو میں اردو ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ عوامی بولیوں کی جھلک بھی ملتی ہے۔یہ امتزاج دراصل گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔جہاں زبان ایک ایسا پل ہے۔جو مختلف طبقوں اور برادریوں کو جوڑتا ہے۔مائل ملیح آبادی کی زبان عام فہم ہے۔آیئے دیکھتے ہیں کہ کیسے ناول نگار نے ایک تسلسل کے ساتھ ان واقعات اور خیالات کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ملاحذہ ہو:

" انسان نہ اچھا ہے نہ برا۔اس کے بارے مین کوئی رائے مت قائم کرو۔ دل میں ہر وقت خیالات آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ انسان انہیں خیالات کا بندہ ہے۔جس رفتار سے خیالات بدلتے ہیں، اسی رفتار سے وہ بھی بدلتا رہتا ہے۔اور لکھنے والے نے ابھی پہلی سطر بھی ختم نہیں کی تھی کہ معلوم ہوا سامنے والا آدمی بدل گیا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں کسی آدمی یا کچھ لوگوں کے بارے میں لکھنا شروع کروں اور لکھتے لکھتے اس آدمی کی زندگی کا رخ بدل جائے تو آپ 9(یہ اعتراض نہ کریں کہ لکھنے والے نے انسانی زندگی کی صحیح تصویر نہیں پیش کی، وہ بہک گیا۔

(ایضاً،ص

چائے کی کیتلی کھول کر دیکھتے ہوئے بولے

'سبحان اللہ کیا رنگ آیا ہے۔معلوم ہوتا ہے عناب گھول دئے ہیں۔ یہی اصلی رنگ ہے۔نہ سیاہ نی بھورہ ، نہ عنّابی

مسکرا کر کہا

'مولانا آزاد کو کیا سلیقہ ہوگا چائے کی پتی اصل چیز ہے۔جیسے وہ بازار سے لاتے نہ ہوں گے۔معلوم نہیں کہاں رکھی سنی ہونو کر تو اٹھا لائے گا اور میں بازار چھان ڈالتا ہوں۔ پنساری کے یہاں سے دبہ لیا اور پتی بیکار نکلی وہ ہر طرح کی خوشبودار اور بدبودار چیزوں کے ساتھ چائے کے دبہ مین بھر دیگا۔کوئی خوشبو یا بدبو پتی کے قریب سے نکلی اور پتی نے اس کا اثر قبول کر لیا بس پھر چائے نہیں رہی۔"

پیالی میں انڈیلتے ہوئے فخریہ نگاہوں سے نصرت علی کی طرف دیکھ کر بولے چائے کے یس فلسفے پر مولانا آزاد کی نظر ہی گئی تھی۔انہوں نے تو بس کیتلی (13(کے بعد کی چائے کا زکر کیا ہے۔حالانکہ ضروری یہ تھا کہ پتی کے حاصل کرنے کا ذکر کرتے۔ (ایضاً،ص

"حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیا تھا۔انہوں نے کہا "میرے پروردگار میں ساری دنیا کی طرف سے منہ پھیر کر تیری طرف رخ کرتا ہوں تو بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

اس وعدہ کے بعد اللہ تعالی نے ان کی آزمائش کی اس ملک کے بادشاہ نمرود نے انہیں پکڑ لیا اور کہا کہ میرے دیوتاؤں کی عبادت کرو ورنہ تجھے آگ میں ڈال دوں گا۔

حضرت ابراہیم نے جواب دیا " اے بادشاہ نمرود کیا میں یہ جاننے کے بعد بھی کی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہی جسے چاہتا ہے جلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے 24 (مار ڈالتا ہے ، تیری اور تیرے دیوتاؤں کی عبادت کرنے لگوں گا۔)" ایضاً،ص

لیکن رحمت نے یہ سب نہیں سنا دل کہہ رہا تھا' وہ لوگ کتنی مصیبت میں ہیں انہیں کوئی اس دلدل سے نکال نہین سکتا۔"

" کیون نہ دو دن ٹھہر کر علاج کرادوں۔ "

جہاز چھوٹنے میں تو ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔

" بمبئی میں تو بیکار رہی تو پڑا رہنا ہوگا۔ "

"رک جاؤ رحمت۔" اللہ کے یہ بندے شاید تمہاری آزمائش کے لئے تمہیں دکھائے گئے ہیں۔ "

وہ جیسے چیخ کر بولا' گاڑی روکو۔"

ارجن سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔پھر بیلوں کی راس کھینچ لی۔

" کیا بات ہے۔ "ان نے پوچھا۔

سبق اردو نومبر 2025
71

"میں دو دن ٹھہر جاؤں گا۔ رحمت بولا۔"
پال سنگھ نے اس کی طرف دیکھا۔" تمہیں حج کو جانا ہے میاں جی۔"
چلا جاؤں گا۔' وہ بولا جہاز ایک ہفتہ بعد چھوٹے گا۔"
رحمت بولا وہ واقعی مر جائے گا ، اس غریب کی کون مدد کرے گا۔"
85(ارجن سنگھ نے کہا۔" میاں تم سچ مچ آدمی ہی ہو۔) "ایضاً، ص

ناول کی یہ فضا صرف مائل کے ناولوں میں نظر آتی ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ جس عہد کی کہانی بیان کرتے ہیں اس عہد کے لباس، برتن اور اسلحہ سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ اور جغرافیائی حالات کا نقشہ بھی بڑی چابک دستی کے ساتھ کھینچ دیتے ہیں۔ ناولوں کی مقبولیت میں ان کی صاف وسادہ اور روزمرہ استعمال ہونے والی عام آدمی کی زبان استعمال کی ہے۔

اسلوب کی تشکیل میں یہ نقطہ بہت اہم ہے کہ ادیب کس کے لیے لکھ رہا ہے؟ جن کے لیے تخلیق کر رہا ان کا ادبی ذوق کیسا ہے؟ وہ کس طبقے اور کس عہد کے پروردہ ہیں؟ کیونکہ ایک اچھے اسلوب کی پہلی کڑی ترسیل وابلاغ ہے۔ مصنف جن کے لیے لکھ رہا ہے ، ان تک براہ راست فن پارے کی ترسیل کا نام ہی فنکاری ہے۔

مائل ملیح آبادی اسلوب کے علمبردار ہیں ، انہیں لفظیات پر دسترس حاصل ہے۔ وہ لفظوں کے ذریعے کرداروں کے مردہ جسم میں روح پھونکتے ہیں۔ شہر کی زبان ہو یا دیہات کی، مقامی زبان ہو یا تہذیب کی، یا کہ علامتی و استعاراتی زبان ہو، مائل ملیح آبادی کو ان پر قدرت حاصل ہے۔ مائل ملیح آبادی کے اسلوب میں کشش و جاذبیت سادگی و شائستگی وقطعیت ، انانیت پسندی ، خطیبانہ انداز بیان اور تخلیقی نثر کا ایک ہرا بھرا گلستاں آباد ہے۔

مائل ملیح آبادی ناول کو قصے کی حیثیت سے دلچسپ بنانے کا گر جانتے ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت ہر کردار کو ایک روشن انفرادی پیکر بخشتی ہے۔ مائل ملیح آبادی کو فضا آفرینی اور ماحول سازی سے انتہائی انسیت ہے۔ وہ پلاٹ کے ہر موڑ پر منفرد فضا آفرینی اور منظر کشی کا جوہر دکھاتے ہیں۔ موصوف کی یہ خوبی ہے کہ ان کے اکثر ناولوں اور افسانوں کا آغاز منظر کشی سے ہوتا ہے۔ مائل صاحب منظر نگاری کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں اس کے ذریعے کسی کہانی کو کیسے قائم کیا جاتا ہے، کہانی کے فن کا یہ ایک بہترین آرٹ ہے۔ جس کے ذریعے کہانی کی فضا اور زمان ومکان پر خصوصی روشنی پڑتی ہے۔ ذیل کے اقتباسات میں موصوف کی فنی مہارت اور ندرت بیان کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"جہاز سمندر کی موجوں کو پیچھے چھوڑتا رہا۔ موجوں کو بھی اور مختلف ملکوں اور بندرگاہوں کو بھی۔

آخر جہاز کے کپتان نے یہ خوشخبری سنائی کہ چند گھنٹوں کے بعد جہاز بندرگاہ جدّہ پر لنگر انداز ہونے والا ہے۔

اللہ اکبر اللہ اکبر "
اے اللہ میں حاضر ہوں ،اے اللہ میں حاضر ہوں۔ ""
دیار رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے اشتیاق میں مسافر جہاز کے عرشے پر آ گئے۔ سرزمین عرب پر پہلی نظر ڈالنے کے لیے ان کے دل بے چین ہو گئے۔ آنکھیں شوق دیدار میں آب ہو گئیں۔

184) جہاز کی رفتار کم ہو گئی جدّے کی عظیم الشان عمارتوں کی چوٹیاں نظر آنے لگیں۔ جہاز ڈولتا ہوا بندرگاہ کی گودی میں داخل ہوا۔) " ایضاً ، ص،

مائل ملیح آبادی کی خوبی یہ ہے کہ وہ کہانی سے کہانی پیدا کرتے ہیں۔ وہ کرداروں کے حال کو ماضی سے منسلک کر کے نہ صرف قصے میں تہداری لاتے ہیں۔ بلکہ کرداروں کے ماضی سے قارئین کو واقف بھی کراتے ہیں۔ جس سے کہانی میں شاخ در شاخ تہداری آجاتی ہے اور پیچیدگی بھی۔ مائل ملیح آبادی کو مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ وہ کرداروں کی پیشکش میں ان کی شخصیت زیبائش اور خارجی و داخلی صورت کو جزئیات نگاری کی مدد سے نمایاں کر دیتے ہیں۔

مائل ملیح آبادی جس معاشرے کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ یا جس تہذیب کو اپنے قلم نابغہ سے پروان چڑھاتے ہیں اسے ایک نباض کی حیثیت سے جانچتے ، پرکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ ان کی نفسیاتی بہت تیز ہے۔ انہوں نے اپنے موضوعات اور کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ جس گہرائی ، گیرائی اور فہم و فراست کے ساتھ پیش کیا ہے ، یہ انہیں کا حصّہ ہے۔ انکی گہری سماجی بصیرت بھی اس عمل میں صاف جھلکتی ہے۔ انہوں نے جاگیرداروں کے زوال کو جس درد وکرب کے ساتھ اور منفرد پیرائے میں بیان کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

مائل ملیح آبادی پیکر تراشی کے فن میں طاق ہیں۔ و※ پیکر کے بیان یا مرقع سازی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ و※ پیکر تراشی کے ذریعے کردار کی شخصیت ، افکار اور قول وعمل کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

مکالمہ ، ناول نگار کے اظہار خیال کا ایک بہترین آلہ ہے۔ مصنف اپنے کرداروں کی زبان سے ، اس کا جو جی چاہتا ہے ، ادا کرتا ہے۔ مکالمے میں موقع محل اور کردار کی زبان کا صحیح اور بروقت استعمال ، بڑی کامیابی کی دلیل ہے۔ اچھے مکالمے میں چستی ، آمد ، روانی اور بے ساختگی کا ہونا ضروری ہے۔ مائل صاحب نے اپنے ناولوں میں اختصار اور ربط کے ساتھ ناولوں میں سیاسی، معاشی اور سماجی حالات کا تفصیلی جائزہ اور ان مسائل کا حل یعنی آپ کا ہر ناول کسی نہ کسی مقصد سے جڑا ہوا ہے۔ آپ کا قلم سماج کے کمزور طبقوں، غریبوں ،دکھیوں اور دوسرے سرمایہ دار کے ہاتھوں ستائے ہوئے لوگوں کے لیے اٹھا۔ اور ان لوگوں کے دکھ درد کو جس طرح محسوس کیا انہیں کے جذبات میں انہیں کی زبان میں کرداروں کو سچائی کے ساتھ ہو بہو اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

'جب اسٹیشن ماسٹر کو چھٹی ملی تو انہوں نے رحمت کا پورا واقعہ بیان کیا۔ اس کے جانے کے بعد جس طرح دو چار گاؤں کے ہندو جمع ہو کر اسٹیشن سے مسلمانوں کو لے گئے تھے۔ اس کا بھی ذکر کر کے بولے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ آدمی نہیں فرشتہ تھے ،اور اسی کام کے لیے یہاں بھیجے گئے تھے۔

سید صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا " آپ سچ کہتے ہیں ایسا آدمی واقعی فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔ ""

سبق اردو نومبر 2025
72

اور جب سید صاحب اپنے سامان کے پاس آ کر بیٹھے تو تنہائی میں انہوں نے ایک ہی بات سوچی۔ " معلوم نہیں اللہ نے میرا حج قبول بھی کیا یا نہیں لیکن رحمت کو اللہ تعالی نے حج ہی نہیں کرایا" ، حج اکبر" بھی کرایا۔

اب انہوں نے غور کیا کہ ان کے آگے فرائض حج ادا کرنے والا رحمت ہی تھا جیسے فرشتے حج ادا کرا رہے تھے۔ وہ خود پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور رحمت (212 آگے آگے چل رہا تھا خوش نصیب رحمت اس نے اللہ کے گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی حج اکبر کا ثواب حاصل کر لیا تھا۔) " ایضاً ،ص

سید صاحب نے کہا

رخدا کی قسم میں نے رحمت کو حج میں دیکھا کہ وہ مجھ سے آگے آگے تمام فرائض ادا کر رہے ہیں اللہ نے انہیں حج کرا دیا۔" حج اکبر "

سید صاحب کی آواز کانپنے لگی انہوں نے اپنے گلے سے پھولوں کا ہار اتار کر رحمت کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ان پھولوں کے حقدار رحمت ہیں۔ میں نہیں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ انہیں کی طرح دوسرے مسلمانوں کا بھی حج قبول فرمائے۔

رحمت جیسے چیخ اٹھا۔ یہ کیا کر رہے ہیں سید صاحب۔

اور سسکیاں لینے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

سب حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ سب کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

سید صاحب نے رحمت کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چوما اور پھر آنکھوں سے لگایا۔

بولے ۔۔۔ لوگو، اللہ کے بندوں کی خدمت کرو وہ تمہیں حج اکبر کا ثواب عطا فرمائے گا۔ "

224) سب نے تائید کی ۔۔۔ " آپ سچ کہتے ہیں۔ اللہ سب کو اپنے بندوں کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ " آمین۔) "ایضاً ،ص

ناول حج اکبر " کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں مصنف نے اس وقت کے سماجی حالات اور مسلم و غیر مسلم تعلقات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک ہی خطے میں ہم ایک ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ ان کی زبان ، لباس ، رہن سہن اور رسومات میں فرق ہونے کے باوجود ان کی زندگیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں ۔تہواروں ، میلوں اور دکھ سکھ کے موقعوں پر وہ ایک دوسرے کے شریک کار ہیں۔

کرداروں کی زندگی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاشرتی ہم آہنگی اور باہمی احترام ہی ہندوستانی سماج کی اصل طاقت ہے۔ مصنف نے یہ پیغام دیا ہے کہ مذہب کی بنیاد پر نفرت معاشرے کو کمزور کرتی ہے۔ لیکن اگر انسانیت اور بھائی چارے کو فوقیت دی جائے تو معاشرہ مزید مضبوط اور خوشحال ہو سکتا ہے

۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول حج اکبر صرف ایک فرد یا ایک طبقے کی داستان نہیں بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی بھرپور عکاسی ہے۔ مائل ملیح آبادی نے اپنے ناول کے ذریعے یہ پیغام دیا ہے کہ گنگا جمنی تہذیب ہمارے تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہے ، جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ اور ہماری ثقافت کو ایک نیا رنگ عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول آج بھی اپنی ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ تہذیبی اعتبار سے بھی ہمارے لیے ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

نفرت و عناد بھرے ماحول میں بھی وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کی آبرو ہیں۔ قومی یکجہتی، مذہبی، ہم آہنگی اور گنگا جمنی تہذیب کا جیتا جاگتا چلتا پھرتا قابل رشک نمونہ ہیں۔ آیئے

آج ان لوگوں کو یاد کریں خراج عقیدت پیش کریں اور اپنے آپ سے یہ وعدہ کریں کہ ہم انہیں کے راستے پر چلیں گے۔

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
دل بدست آور کہ حج اکبر است
(شیخ سعدی)

Gulafsha Khan
Research Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus
Lucknow: 226020

سبق اردو نومبر 2025
73

اکیسویں صدی کے تعلیمی نظام میں فلپڈ لرننگ

سنجیدہ خاتون
ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد
Khatoonsanjeeda25@gmail.com

اکیسویں صدی کے تعلیمی نظام نے روایتی تدریسی طرز کو تبدیل کر دیا ہے اور جدید ٹیکنالوجی پر مبنی نئے تدریسی ماڈلز نے تعلیم کے معیار کو بہتر بنایا ہے۔ انہی جدید طریقوں میں فلپڈ لرننگ ایک مؤثر اور فعال تدریسی طریقہ کے طور پر ابھری ہے۔ فلپڈ لرننگ میں تدریس کا بنیادی ڈھانچہ تبدیل ہوتا ہے، جہاں طالب علم گھر پر ویڈیو لیکچر، ڈیجیٹل مواد یا آن لائن وسائل کے ذریعے ابتدائی مطالعہ کرتے ہیں، جبکہ کلاس روم کا وقت بحث و مباحثہ، عملی سرگرمیوں اور گروپ ورک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس طریقے سے طلبہ سیکھنے کے عمل میں زیادہ سرگرم کردار ادا کرتے ہیں اور استاد ایک رہنما اور معاون کی حیثیت ثابت قدم رہتا ہے۔

تعارف

فلپڈ لرننگ اکیسویں صدی کا جدید اور مؤثر تدریسی طریقہ ہے۔ اس میں طالب علم کلاس سے پہلے گھر پر ویڈیو لیکچر دیکھتے ہیں اور کلاس روم میں عملی سرگرمیاں، گفتگو اور مسئلہ حل کرنے پر توجہ دی جاتی ہے۔ یہ تحقیق فلپڈ لرننگ کی اہمیت، فوائد، چیلنجز اور تعلیمی کارکردگی پر اثرات کو واضح کرتی ہے۔ اکیسویں صدی کا دور جدید ٹیکنالوجی اور تیز رفتار تبدیلیوں کا دور ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کی طرح تعلیم کا نظام بھی مسلسل بدل رہا ہے۔ پہلے زمانے میں تعلیم کا طریقہ بہت سادہ تھا۔ استاد کلاس میں آ کر لیکچر دیتے تھے، طلبہ صرف سنتے تھے اور نوٹس لکھتے تھے۔ اس طریقے میں طلبہ کی شمولیت کم ہوتی تھی اور زیادہ تر توجہ یاد کرنے پر ہوتی تھی۔

فلپڈ لرننگ وہ تدریسی طریقہ ہے جس میں طالب علم گھر یا آن لائن وقت پر لیکچر، ویڈیو یا مطالعہ کا مواد دیکھتے / پڑھتے ہیں، اور کلاس روم میں اس مواد کی بنیاد پر عملی سرگرمیاں، بحث و مباحثہ اور ٹیم ورک کرتے ہیں۔ کلاس میں صرف سنتے رہنے کی بجائے، طلبہ زیادہ فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، طلبہ لیکچر گھر پر دیکھیں گے، پھر کلاس میں اس موضوع پر سوال جواب کریں گے، گروپ ورک کریں گے، استاد سے رہنمائی لیں گے۔ اس سے وقت کا بہتر استعمال اور سیکھنے کی گہرائی بڑھتی ہے

مگر اب حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ آج تعلیم صرف کتابوں اور بلیک بورڈ تک محدود نہیں رہی۔ انٹرنیٹ، کمپیوٹر، سمارٹ فون، ویڈیو لیکچر، آن لائن کلاسز اور ڈیجیٹل لرننگ پلیٹ فارم تعلیم کا اہم حصہ بن چکے ہیں۔ طلبہ اب مختلف ذرائع سے سیکھنے کے مواقع حاصل کرتے ہیں اور اپنی ضروریات کے مطابق سیکھ سکتے ہیں۔ اسی پس منظر میں Flipped Learning ایک جدید اور مؤثر طریقہ تدریس کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس طریقے میں پورا نظام روایتی کلاس کے متبادل چلتا ہے۔ یعنی جو کام پہلے کلاس میں ہوتا تھا، وہ گھر پر کیا جاتا ہے اور جو کام گھر پر ہوتا تھا، وہ کلاس میں انجام پاتا ہے۔ مثال کے طور پر: طلبہ گھر پر ویڈیو لیکچر، پریزنٹیشن، آن لائن مواد یا ریکارڈ شدہ کلاس دیکھ کر موضوع کو سمجھتے ہیں۔ کلاس روم میں بیٹھ کر رٹہ لگانے یا لیکچر سننے کے بجائے، اب وہ سوال جواب، بحث و مباحثہ، عملی سرگرمیاں، گروپ ورک اور مسئلہ حل کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔ اس طرح طلبہ تعلیم کے عمل میں زیادہ سرگرم اور فعال ہو جاتے ہیں۔ استاد ان کی رہنمائی کرتے ہیں اور مشکل موضوعات کی وضاحت کرتے ہیں۔ Flipped Learning میں طالب علم کو سیکھنے کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ سیکھنے کو زیادہ دلچسپ، مؤثر اور عملی بناتا ہے۔ اس سے طلبہ خود سے سیکھنے کے قابل بنتے ہیں اور استاد کا کردار ایک رہنما اور معاون کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی میں Flipped Learning جدید تعلیمی نظام کی اہم ضرورت بن چکا ہے۔

آج کا تعلیمی ماحول بہت بدل چکا ہے۔ ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ اور اسمارٹ آلات نے سیکھنے کے طریقے تبدیل کر دیے ہیں۔ اس دور میں طلبہ صرف پڑھنے یا سننے سے کم سیکھتے ہیں، انہیں تجربہ، حل تلاش کرنا، ٹیم ورک اور خود سیکھنے کی صلاحیت درکار ہے۔

فلپڈ لرننگ ان ضروریات کو پورا کرتی ہے کیونکہ طلبہ خود اپنی رفتار سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔ کلاس کا وقت صرف لیکچر دینے میں ضائع نہیں ہوتا بلکہ

سبق اردو نومبر 2025
74

سوال کرنے، مسئلے حل کرنے اور دیگر سرگرمیوں میں گزرتا ہے۔

تحقیقی مطالعات سے ثابت ہوا ہے کہ فلپڈ لرننگ طلبہ کی تعلیمی کارکردگی، سیکھنے کی دلچسپی، راغبیت، ٹیکنالوجی کی مہارت، تنقیدی سوچ اور ٹیم ورک میں نمایاں بہتری لاتی ہے۔ اس طریقہ کار سے کلاس روم کا ماحول فعال اور پرجوش بنتا ہے اور طلبہ بہتر طور پر سمجھ حاصل کرتے ہیں۔ مزید برآں، فلپڈ لرننگ طلبہ کو اپنی رفتار سے سیکھنے کے مواقع فراہم کرتی ہے اور انفرادی فرق کو مدنظر رکھتی ہے۔ تاہم اس ماڈل کے مؤثر نفاذ کے لیے مناسب ٹیکنالوجی، منصوبہ بندی اور تدریسی حکمت عملی ضروری ہے۔ موجودہ تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلپڈ لرننگ اکیسویں صدی کی تعلیمی ضروریات کے لیے ایک کامیاب اور قابلِ اعتماد طریقہ ہے جو مستقبل کی تعلیم میں مستقل اور اہم کردار ادا کر سکتا ہے اور جدید مہارتوں کو فروغ دینے کے لیے ایک مضبوط بنیاد مہیا کرتا ہے۔

فلپڈ لرننگ کی اہمیت وافادیت

۱۔ طلباء کا مناسب وقت میں سیکھنا: ۔ فلپڈ لرننگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر طالب علم اپنی رفتار کے مطابق سیکھ سکتا ہے۔ ویڈیو لیکچر یا آن لائن مواد کو بار بار دیکھنے اور سمجھنے کی سہولت ہوتی ہے۔ اگر کوئی موضوع مشکل ہو تو طالب علم اسے دوبارہ چلانے، روکنے اور نوٹس بنانے کے ذریعے بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اس طرح وہ دباؤ سے آزاد رہتا ہے اور سیکھنے کا معیار بہتر ہوتا ہے۔

۲۔ استاد کا زیادہ وقت عملی کام پر استعمال ہونا: روایتی تدریس میں استاد کا زیادہ وقت لیکچر دینے میں گزر جاتا ہے اور طلبہ سوالات کرنے یا عملی سرگرمیوں کے لیے کم وقت پاتے ہیں۔ فلپڈ لرننگ میں لیکچر گھر پر دیکھ لیا جاتا ہے، اس لیے کلاس میں استاد طلبہ کی رہنمائی، گروپ ورک، مشق اور مہارت پر مبنی سرگرمیوں پر زیادہ توجہ دے سکتا ہے۔ اس سے سیکھنے کا عمل زیادہ مؤثر بنتا ہے۔

۳۔ کمرہ جماعت کا پرجوش ماحول : فلپڈ کلاس میں طالب علم خاموش بیٹھ کر صرف سننے کے بجائے عملی کام کرتے ہیں، سوالات پوچھتے ہیں، مسائل حل کرتے ہیں اور تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے کلاس روم کا ماحول متحرک اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ طلبہ زیادہ جوش اور شوق کے ساتھ حصہ لیتے ہیں جس سے بوریت ختم ہوتی ہے۔

۴۔ ٹیکنالوجی کی مہارت : ۔ فلپڈ لرننگ طلبہ کو ٹیکنالوجی کے بہتر استعمال کی تربیت دیتی ہے۔ ویڈیو لیکچر دیکھنے، آن لائن پلیٹ فارم استعمال کرنے، ڈیجیٹل ٹولز کے ساتھ کام کرنے اور انٹرنیٹ کے ذریعے تحقیق کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ مہارتیں مستقبل میں اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ زندگی میں بہت ضروری ہیں۔

۵۔ مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت: جب طلبہ کلاس میں گروپ ورک، پروجیکٹ اور عملی مشق کرتے ہیں تو وہ مختلف مسائل کا حل خود تلاش کرتے ہیں۔ اس سے ان کی تنقیدی سوچ (critical thinking) اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت مضبوط ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت اکیسویں صدی کی سب سے اہم مہارتوں میں سے ایک ہے۔

۶۔ یادداشت اور سمجھ میں بہتری: سیکھنے کا وہ طریقہ جس میں طالب علم خود کام کرے اور عملی سرگرمیوں میں حصہ لے، وہ زیادہ دیر تک یاد رہتا ہے۔ فلپڈ لرننگ میں نظریاتی علم کے ساتھ ساتھ عملی تجربات بھی شامل ہوتے ہیں، اس لیے سمجھ گہری ہوتی ہے اور نتائج بہتر آتے ہیں۔

۷۔ جدید دور کی تعلیمی ضروریات: ا۔ کیسویں صدی میں تعلیم صرف کتابوں تک محدود نہیں رہی ہے۔ طلبہ کو جدید مہارتوں کی ضرورت ہے جیسے تنقیدی سوچ اور ٹیم ورک۔ فلپڈ لرننگ ان مہارتوں کو فروغ دیتی ہے۔

۸۔ ٹیکنالوجی کے مؤثر استعمال کی ضرورت: آج ٹیکنالوجی ہر میدان میں استعمال ہو رہی ہے۔ تعلیم میں ٹیکنالوجی کو شامل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ فلپڈ لرننگ اس مقصد کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔

۹۔ فعال اور دلچسپ سیکھنے کا ماحول: روایتی لیکچر سسٹم میں طلبہ اکثر غیر فعال رہتے ہیں۔ فلپڈ سیکھنا انہیں کلاس میں سرگرم اور متحرک بناتی ہے۔

۱۰۔ وقت کا بہتر استعمال: کلاس میں لیکچر دینے کے بجائے عملی سرگرمیوں پر وقت خرچ ہوتا ہے، جس سے سیکھنے کے نتائج بہتر ہوتے ہیں

فلپڈ طریقہ نے طلبہ کی تعلیمی کامیابی، شمولیت اور اطمینان میں نمایاں بہتری دکھائیاں ہیں اس کے ساتھ ساتھ کمرہ جماعت کے نفاذ میں مختلف عوامل مؤثر ہوتے ہیں اور بعض اوقات توقع کے مطابق نتائج نہیں ملتے، اس لیے نفاذ کی معیاری حکمت عملی اہم ہے۔ کلاس روم میں وقت گفتگو، سوال جواب، گروپ ورک، عملی سرگرمی، مسئلہ حل کرنے میں گزرتا ہے۔ طلبہ اپنی رفتار سے گھر کا مطالعہ کر سکتے ہیں، اور کلاس میں وہ جو سمجھ نہ پائے ہوں اسے استاد کے ساتھ واضح کر سکتے ہیں۔ اس طریقے میں استاد کا کردار صرف لیکچر دینے والا نہیں بلکہ رہنما اور معاون ہوتا ہے۔

سبق اردو نومبر 2025
75

ٹیکنالوجی، ویڈیوز، آن لائن فورمز، کوئز وغیرہ کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔

فلپڈ لرننگ اکیسویں صدی کا جدید اور مؤثر تدریسی طریقہ ہے جو روایتی لیکچر سسٹم سے بالکل مختلف اور زیادہ بہتر نتائج فراہم کرتا ہے۔ اس طریقہ میں طالب علم کلاس سے پہلے گھر پر لیکچر دیکھتا ہے اور کلاس میں عملی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے۔ اس ماڈل سے نہ صرف سیکھنے کا معیار بہتر ہوتا ہے بلکہ طلبہ میں زندگی بھر سیکھنے کی صلاحیتیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے اہم فوائد درج ذیل ہیں:

(۱) مناسب سیکھنے کا عمل: ۔فلپڈ لرننگ میں طلبہ سیکھنے کے عمل میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ وہ صرف لیکچر سننے کے بجائے عملی کام کرتے ہیں، سوالات پوچھتے ہیں اور مسئلہ حل کرنے پر توجہ دیتے ہیں۔ اس سے کلاس کا ماحول زندہ اور دلچسپ رہتا ہے، بوریت کم ہوتی ہے اور سیکھنے کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔

(۲): ۔خود سے سیکھنے کی صلاحیت: ۔اس طریقے میں طالب علم خود اپنا وقت منظم کرتا ہے اور گھر پر ویڈیو مواد دیکھ کر سیکھتا ہے۔ اس عمل سے خود مختاری، ذمہ داری اور خود فیصلہ کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔ یہ صلاحیت مستقبل کی زندگی میں بہت اہم ہے۔

(۳) ۔اشتراک اور گروپ ورک: ۔کلاس میں گروپ ورک، ڈسکشن اور مشترکہ سرگرمیوں کے ذریعے طلبہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ اس سے ٹیم ورک، کمیونیکیشن اسکل اور سماجی رابطے بہتر ہوتے ہیں۔ یہ صلاحیتیں اکیسویں صدی کی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں۔

(۴) ۔استاد کی مؤثر رہنمائی: ۔روایتی نظام میں استاد زیادہ وقت لیکچر میں استعمال کرتا ہے، لیکن فلپڈ لرننگ میں استاد ہر طالب علم کی انفرادی ضرورت پر توجہ دے سکتا ہے۔ جو طالب علم کمزور ہوں انہیں زیادہ مدد ملتی ہے اور جو آگے ہوں انہیں مزید مواقع ملتے ہیں۔

(۵): ۔موافق ماحول: ۔طلبہ کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ سیکھ سکتے ہیں۔ ویڈیو لیکچر بار بار دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی سبق سمجھ نہ آئے تو دوبارہ سننا ممکن ہے۔ اس طرح سیکھنے پر جگہ یا وقت کی کوئی پابندی نہیں رہتی۔

(۶): ۔طلباء کی کارکردگی میں بہتری: ۔ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ فلپڈ لرننگ طلبہ کی تعلیمی کارکردگی بہتر بنانے میں مدد کرتی ہے۔ بہتر سمجھ اور عملی سرگرمیوں کی وجہ سے امتحانی نتائج اور گریڈ نمایاں طور پر بہتر ہوتے ہیں۔

(۷): ۔تنقیدی سوچ اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت: ۔ پروجیکٹ ورک اور عملی کام کے ذریعے طلبہ مختلف مسائل کے حل پر غور کرتے ہیں۔ اس سے ان میں تجزیاتی سوچ اور حل نکالنے کی صلاحیت بڑھتی ہے جو معاشرے اور پیشہ ورانہ زندگی میں بہت مفید ہے۔

(۸): ۔استاد اور طلبہ کے درمیان بہتر رابطہ: ۔تعلیمی گفتگو اور باہمی رابطہ بڑھتا ہے۔ طلبہ بے جھجک سوال کرتے ہیں اور استاد بہتر طریقے سے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

(۹): ۔سیکھنے میں دلچسپی اور حوصلہ افزائی: ۔ فلپڈ لرننگ تعلیم کو دلچسپ بناتی ہے، جس سے سیکھنے کا شوق بڑھتا ہے اور طلبہ علم کے حصول میں فعال رہتے ہیں۔

(۱۰): ۔انفرادی فرق کا خیال: ۔ ہر طالب علم کی سیکھنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ فلپڈ لرننگ میں ہر طالب علم اپنی رفتار سے سیکھ سکتا ہے، جس سے انفرادی فرق کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

(۱۱): ۔وقت اور وسائل کا بہتر استعمال: ۔ کلاس روم میں وقت لیکچر کے بجائے عملی سرگرمیوں میں استعمال ہوتا ہے، جس سے سیکھنے کے معیار میں نمایاں بہتری آتی ہے۔

مجموعی طور پر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اکیسویں صدی کے تعلیمی نظام نے تدریسی طریقوں کو جدید خطوط پر استوار کر دیا ہے، اور فلپڈ لرننگ اس تبدیلی کا ایک نمایاں اور مؤثر ماڈل ہے۔ یہ طریقہ روایتی تدریس سے بالکل مختلف ہے جس میں طلبہ کلاس سے پہلے گھر پر ویڈیو لیکچر یا ڈیجیٹل مواد کا مطالعہ کرتے ہیں، جبکہ کلاس روم کا وقت عملی سرگرمیوں، سوال جواب، بحث و مباحثہ، گروپ ورک اور مسئلہ حل کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔ اس ماڈل سے طلبہ محض خاموش سننے والے نہیں رہتے بلکہ فعال شریک بن جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں سیکھنے کا عمل زیادہ دلچسپ اور مؤثر ہوتا ہے۔

تحقیقی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ فلپڈ لرننگ طلبہ کی تعلیمی کارکردگی، سیکھنے کی دلچسپی، خود اعتمادی، ٹیکنالوجی کے استعمال کی مہارت، تنقیدی سوچ، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت اور ٹیم ورک میں نمایاں بہتری پیدا کرتی ہے۔ یہ طریقہ وقت اور وسائل کے بہتر استعمال کو یقینی بناتا ہے اور ہر طالب علم کے انفرادی فرق کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے کمزور طلبہ کو بہتر رہنمائی ملتی ہے جبکہ ذہین طلبہ کو مزید آگے بڑھنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ جدید دور میں جب تعلیم صرف کتابوں تک محدود نہیں رہی بلکہ عملی تجربہ اور ڈیجیٹل مہارتیں ناگزیر ہو چکی ہیں، فلپڈ لرننگ

سبق اردو نومبر 2025
76

ایک کامیاب اور قابلِ اعتماد ماڈل ثابت ہوتا ہے جو مستقبل کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

فلپڈ لرننگ کے کامیاب نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کو مناسب تربیت فراہم کی جائے، ہر تعلیمی ادارے میں ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل سہولیات کو یقینی بنایا جائے تاکہ طلبہ سیکھنے کے وسائل تک باآسانی رسائی حاصل کر سکیں۔ اس ماڈل میں استعمال ہونے والا تعلیمی مواد جیسے ویڈیوز اور ڈیجیٹل لیکچر واضح، مختصر اور معیاری ہونا چاہیے تاکہ طلبہ بہتر سمجھ حاصل کر سکیں۔ والدین کو بھی اس طریقہ کار کی اہمیت سے آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ وہ گھر پر بچوں کی مدد اور رہنمائی کر سکیں۔ مزید یہ کہ فلپڈ لرننگ کے اثرات جانچنے اور بہتری کے لیے باقاعدگی سے فیڈبیک اور جائزہ لیا جائے۔ اس کے علاوہ فلپڈ لرننگ جدید دور کی تعلیمی ضروریات سے ہم آہنگ، مناسب ، دلچسپ اور نتیجہ خیز تدریسی ماڈل ہے جو طلبہ کی مہارتوں اور تعلیمی کامیابی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

References

1.Alsobaie, M. F. (2018). Effective Teaching and Learning: Flipped Learning in the Classroom [Doctordissertation]. https://scholarworks.wmich.edu

2.Baker, J. W. (2000). The Classroom Flip: Using Web Course Management Tools to Become the Guide by the Side [Paper presentation]. 11th international Conference on College Teaching and Learning, Jacksonville, Florida Community College.

3.Bergmann, J., & Sams, A. (2012). Flip your classroom: Reach every student in every classeveryday.International Society for Technology in Education. 4) Sciences Communications, 8(1). https://doi.org/10.1057/s41599-021-00860

4.Cheryl P. Talley, & Stephen Scherer. (2013). The enhanced flipped classroom: Increasing academicperformance with student-recorded lectures and practice testing in a "Flipped" STEM Course. TheJournal of Negro Education, 82(3), 339. https://doi.org/10.7709/jnegroeducation.82.3.0339

5. Definition of flipped learning. (2019, January 18). Flipped Learning Network Hub. https://flippedlearning.org/definition-of-flipped-learning/

6.Iyer, M. S. (2019). Flipped English as a second language (ESL) classroom approach to scaffold the slow learners. Language in India, 19(2), 114-119.

7.Lin, Y. (2021). An Analysis of the Flipped Classroom Based on the Bloom's Taxonomy of the Educational Objectives 4th International Conference on Humanities Education and Social Sciences (ICHESS 2021).

8.Subramaniam, S. R., & Muniandy, B. (2016). Concept and characteristics of flipped classroom. International journal of Emerging Trends in Science and Technology, 3(10), 4668 4670. https://doi.org/10.18535/ijetst/v3i10.01

9.Tan, C., Yue, W., & Fu, Y. (2017). Effectiveness of flipped classrooms in nursing education: Systematic review and meta-analysis. Chinese Nursing Research, 4(4), 192 200. https://doi.org/10.1016/j.cnre.2017.10.006

10.Yousufi, U. (2019). A Review of Flipped Classroom Model. GSJ, 7(12), 16-20.

سنجیدہ خاتون
ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد
Khatoonsanjeeda25@gmail.com

سبق اردو نومبر 2025
77

ٹونک راجستھان میں اردو تحقیق : ابتداء تا حال

کرشن گوپال مینا
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج، ٹونک
Mob : 9667905968

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ تحقیق بلاشبہ ایک مشکل اور محنت کا کام ہے، اس لئے تحقیق کے اصول ومبادیات سے ہر محقق کو واقف ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اصل تحقیق کے نکات۔

محققین ان ہی تحقیق کے اصول ومقاصد اور اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنا تحقیقی کام کرتے ہیں اس وجہ سے ہر محقق کا کام کچھ نیا، نمائندہ اور اہمیت کا باعث بن جاتا ہے۔ جو تحقیق جتنی معتبر ہوتی ہے اس کی مقبولیت اور افادیت اتنی ہی زیادہ بڑھ جاتی ہے اور ہر دور میں اس کی اہمیت ومقبولیت اور افادیت بڑھتی ہی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے کسی محقق کا محض ایک شاہکار ہی ان کی زندگی کو جاودانی بخش دیتا ہے اور ان کا کام رہتی دنیا تک کے لئے چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔

تحقیق کی تعریف :

''تحقیق عربی لفظ ہے۔ یہ بابِ تفصیل سے مصدر ہے۔ اس کے اصلی حروف ح ق ق ہیں۔ اس کا مطلب ہے حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف پھیرنا۔'' (بحوالہ تحقیق کا فن از گیان چند جین، ص ۱۷)

گیان چند جین اپنی کتاب میں ڈاکٹر عبداللہ کے مطابق تحقیق کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی تحقیقات کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔'' (بحوالہ تحقیق کا فن، از گیان چند جین، ص ۱۹)

تحقیق کے اقسام :

ڈاکٹر وجے پال سنگھ (سابق پروفیسر وصدر شعبۂ ہندی، بنارس ہندو یونیورسٹی) نے تحقیق کی مندرجہ ذیل اقسام بتائی ہیں :

(۱) نفسیاتی تحقیق (۲) تہذیبی تحقیق (۳) تاریخی تحقیق (۴) علومِ بلاغت وشعریاتی تحقیق (۵) لسانیاتی تحقیق (۶) تقابلی تحقیق

تحقیق کے مقاصد :

تحقیق کے مقاصد کا تعین اس کے نفاظ کے لئے ایک اہم مرحلہ ہے، کیونکہ محقق جو سارے فیصلے عمل میں لائے گا ان ہی پر انحصار کرتا ہے کہ اس مسئلے کو حل کیا جاسکے، جس سے پہلے اس کی نشاندہی کی گئی ہو۔

مزید برآں بعض مقاصد میں محقق کو اشارے کے ذریعہ ان کی کامیابیوں کی پیائش کرنے کی اجازت دینے کا کام ہوتا ہے۔ ہی مخصوص مقاصد کا معاملہ ہے، جس کو اس طرح مرتب کرنا چاہئے کہ ان کا دائرہ کار نتائج کے بعد کی پیائش کی اجازت دے۔

اردو تحقیق کے حوالے سے راجستھان کے ٹونک ضلع کا نام روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے۔ یہاں اردو ادب کا ایک بہت بڑا دبستان بسا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کو ادبی کتابوں اور نصابوں میں وہ جگہ نہیں دی گئی جس کا وہ حقدار ہے۔

ٹونک کے اردو ادب میں تحقیق کے اولین نقوش ریاست کے قیام کے بعد سے نظر آنے لگے۔ بساون لال شاداں کی ''امیر نامہ''، دیبی پرشاد کی ''تذکرہ آثار الشعراء ہنود''، استاد آبرو کی ''وقائع راجستھان'' اور محمود شیرانی کی کئی تصانیف قابل ذکر ہیں۔ ٹونک کے حوالے سے تحقیق کے میدان میں محمود شیرانی کا بین الاقوامی مقام ہے۔ ان کی کئی تصانیف بین الاقوامی سطح پر مقبول ومشہور ہیں۔ ان میں خاص طور پر ''پنجاب میں اردو'' کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ ابوالفیض عثمانی صاحب کا نام بھی اس زمرے میں قابل ذکر ہے۔ ان کی تصنیف ''راجستھان میں اردو ادب 1857ء تک'' اور ''راجستھان کی ادبی تاریخ کے چند اردو مآخذ'' قابلِ ذکر ہیں۔ ابوالفیض عثمانی صاحب نے ٹونک میں اردو تحقیق کی راہیں ہموار کیں۔ جس سے ایک بڑا ادبی طبقہ فیضیاب ہوتا رہا ہے۔

ٹونک کے اردو تحقیق نگاروں میں قابلِ ذکر نام محمود شیرانی، ابوالفیض عثمانی کے علاوہ صاحبزادہ شوکت علی خاں، منظور الحسن برکاتی، ڈاکٹر رفعت اختر، ثروت علی خان، ہنومان سنگھل، مخمور سعیدی، محمد صادق بہار ٹونکی، ڈاکٹر ارشد عبدالحمید، سید صادق علی، ڈاکٹر حسن آرا، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، ڈاکٹر راشد میاں، ڈاکٹر حسین رضا، ڈاکٹر ناصرہ بصری، ڈاکٹر قائد علی خاں، ڈاکٹر صاحبزادہ صولت علی خاں، سید ساجد علی ٹونکی، مختار ٹونکی، اکبر شہابی، ڈاکٹر خورشید انور، ڈاکٹر عارفہ سلطانہ، ڈاکٹر عمر جہاں اور نئی نسل کے ریسرچ اسکالروں میں ڈاکٹر عاطف صدیقی، جمیلہ عرشی، ڈاکٹر شگفتہ، ثوبیہ قمر، سعادت رئیس وغیرہ کے اردو تحقیقی کاموں نے ٹونک کا نام روشن کیا ہے۔

ٹونک میں تحقیق کے کئی شعبے ہیں جن پر گاہے بگاہے چند مضامین ومقالات مندرجہ ذیل عنوانات سے شائع ہوا ہے۔

اردو تحقیق راجستھان اور ٹونک کے پس منظر میں، ٹونک کے اردو محققین اور ان کے شاہکار ابتداء تا حال، ٹونک میں سندی تحقیق۔ اس کے تحت کئی تحقیقی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔

اردو تحقیق کے آغاز میں جن محققین نے تحقیق وتدوین کی ان میں مولوی عبدالحق، پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، سید مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کے صوبوں

سبق اردو نومبر 2025
78

میں صوبائی تحقیق کا آغاز ہوا۔ اسی ضمن میں رجستھان میں بھی تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا۔

راجستھان میں تحقیق کے آغاز میں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہاں پہلے فارسی زبان وادب کے اثرات بارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوئے۔ راجستھان میں درویشوں صوفیوں فقیروں کی آمد اور سکونت کے بعد فارسی زبان میں خواجہ معین الدین چشتی اور صوفی حمید الدین ناگوری کی فارسی تصنیفات منظر عام پر آگئیں۔

علاوہ ازیں فارسی بولنے والے عساکر شاہی سپاہی لشکری کی آمد ورفت اور مفتوح علاقوں کے عامل حاکم نے بھی فارسی زبان کو بات چیت اور آپسی تعلق کے لحاظ سے فروغ دیا۔ قلعوں مسجدوں خانقاہوں وغیرہ پر فارسی زبان کے کتبے نصب ہوئے۔ ان حالات میں فارسی زبان وادب کو ترویج ملی۔ مغل دربار اکبری کے نورتن فارسی کے نامور شاعر وادیب ملک الشعراء فیضی اور ان کے برادرِ خورد ابوالفضل پسران شیخ مبارک ناگور میں پیدا ہوئے۔

یہاں درباروں اور دفتروں میں فارسی سرکاری زبان رہی۔ فارسی کے ساتھ اردو بھی بولی جانے لگی۔ اردو میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ انیسویں صدی سے شروع ہوا، راجپوتانہ کی ریاستوں میں اردو ادب پروان چڑھا۔

ٹونک میں مندرجہ ذیل تحقیق پر کتب شائع ہوچکی ہیں :

(۱) ابوالفیض عثمانی، ڈاکٹر، راجستھان میں اردو زبان وادب 1857ء تک، ناشر اے پی آر آئی، ٹونک مطبوعہ 1929ء

(۲) ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، راجستھان میں اردو زبان وادب کے لئے غیر مسلم حضرات کی خدمات، ناشر اے پی آر آئی ٹونک، مطبوعہ 1958ء

(۳) ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، راجستھان کی ادبی تاریخ کے چند اردو مآخذ، ناشر اے پی آر آئی ٹونک، مطبوعہ 2008ء

(۴) استاد آبرو، حدیقۂ راجستھان، ناشر ستارہ پریس آگرہ، مطبوعہ 1901ء

(۵) ڈاکٹر راشد میاں ، سید ساجد علی: شخصیت اور فن، ناشر روشن علی، دہلی، مطبوعہ 1867ء

(۶) ڈاکٹر رفعت اختر، اردو تنقید اور راجستھان، ناشر راجستھان اردو اکادمی، جے پور، مطبوعہ 1994ء

(۷) ڈاکٹر سید صادق علی، اقبال کے فن کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ناشر ٹونک، مطبوعہ 2010ء

(۸) شمیم ٹونکی، تذکرہ شعرائے ٹونک، ٹونک، مطبوعہ 1993ء

(۹) صاحبزادہ شوکت علی خاں، حضرت امیر خسرو اور ٹونک، ناشر اے پی آر آئی ٹونک، مطبوعہ 1981ء

(۱۰) صاحبزادہ عبدالمعید خاں، حدیقۂ مآخذ (حصہ ۲)، ناشر اے پی آر آئی ٹونک، مطبوعہ 2013ء

(۱۱) ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، تذکرہ معاصر شعرائے ٹونک، ٹونک مطبوعہ 2013ء

(۱۲) ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، راجستھان میں مختلف زبانوں کے اردو تراجم، ٹونک مطبوعہ 1998ء

(۱۳) ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، ادراکِ ادب، ٹونک مطبوعہ 1994ء

(۱۴) محمد صادق بہار ٹونکی، مسدس آئینۂ ٹونک، ناشر انیس کتاب گھر، ٹونک مطبوعہ 2010ء

(۱۵) مولانا محمد عمران خاں، تاریخ علماء ٹونک، قلمی 1920ء

(۱۶) حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ناشر مکتبہ کلیاں لکھنؤ، مطبوعہ 1960ء

(۱۷) حافظ محمود شیرانی، تنقید شعر العجم، ناشر انجمن ترقی اردو دہلی، مطبوعہ 1942ء

(۱۸) حافظ محمود شیرانی، مقالاتِ محمود شیرانی، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور، مطبوعہ 1987ء

(۱۹) مختار ٹونکی، فکر پارہ پارہ، ناشر مختار ٹونکی، مطبوعہ 2010ء

(۲۰) مخمور سعیدی، عمر گذشتہ کا حساب، ناشر سیفی اکیڈمی ٹونک، مطبوعہ 2021ء

(۲۱) منظور الحسن برکاتی، غالب اور مضمون (مضمون)، ناشر رسالہ آج کل، مطبوعہ 1960ء

(۲۲) ہنومان سنگھل، تاریخ ریاست ٹونک، ٹونک مطبوعہ 1996ء

(۲۳) ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی مندرجہ ذیل تحقیقی کتب بڑی اہمیت کی حامل ہیں :

ادبیاتِ راجستھان، نگارخانۂ راجستھان، ادبی جائزے، تنقیدی تجزیے، صحرا میں گلزار، کتابوں کے روبرو، راجستھان کے موجودہ اردو شاعر (ترجمہ)، مکتوبات پروفیسر پریم شنکر سریواستو، نقوشِ روشن وغیرہ۔

بحیثیت مجموعی ٹونک میں اردو تحقیق کی راہیں ہموار ہورہی ہیں مزید تاریخ ادب ٹونک پر بھی تحقیقی کام ہورہے ہیں۔ یہاں کی ادبی انجمنیں بھی تحقیق کی طرف متوجہ ہورہی ہیں۔ ٹونک کی شعری ادبی فضا نے محققین اور ادباء کو تیار کیا ہے۔ خصوصاً سندی تحقیق کی راہیں ہموار ہورہی ہیں۔ راجستھان کی یونیورسٹیوں میں نہ صرف ٹونک بلکہ پورے راجستھان کی ادبی شخصیتوں پر تحقیقی کام ہورہا ہے۔ ٹونک میں تحقیق کا مستقبل روشن ہے۔

سبق اردو نومبر 2025

79

نوال السعداوی: عرب حقوق نسواں کی علمبردار

*مطہر احمد لوہار

(ریسرچ اسکالر، عربی)

شیخ العالم سنٹر فار ملٹی ڈیسپلنری اسٹڈیز، یونیورسٹی آف کشمیر

7006644794

mutahir.sacscholar@kashmiruniversity.net

191111,Kashmir Jammu,Arath Narbal,Budgam

**توصیف احمد

(ریسرچ اسکالر، کشمیری)

شیخ العالم سنٹر فار ملٹی ڈیسپلنری اسٹڈیز، یونیورسٹی آف کشمیر

6006737070

tawseefbundh786@gmail.com

Batipora Haripari Gam, Tral, Pulwama, J&K,

192123

خلاصہ: اس تحقیق i کا مقصد مصری مصنفہ ڈاکٹر نوال السعداوی کی تخلیقات کے ذریعے عرب حقوق نسواں کی شناخت کرنا ہے جو اپنی علمی راہ مںT طب، ادب اور فلسفے کو یکجا کرنے کے قابل تھی۔ وہ اپنی تحریروں اور آراء کے ذریعے عرب اشرافیھ کے درمیاکن بڑے پماaنے پر تنازعات کو ہوا دیتی رہی، اس نے نہ صرف عرب خواتین کے حقوق کے دفاع اور ان کے شہری اور سیاسی حقوق کے حصول کے لیے اجدوجہد کی بلکہ مروجہ عرب ثقافت کے خلاف اپنی بڑھ چڑھ بغاوت بھی کی ہے۔ جنس اور مذہب کی ممنوعات کو توڑنے والی تحریریں اس کے علاوہ وہ اسلامی فکر مںھ چھوٹی باتوں کے بارے مں بھی گفتگو کر رہی ہے، جسےق کہ اس نے جنس کو اخلاقی، سماجی اور مذہبی سوالات سے جوڑ کر تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

کلیدی الفاظ: حقوق نسواں، عورت، پدرانہ نظام، مردانہ تسلط، فلسفہ

حقوق نسواں کا فلسفہ اصل میں ایک مغربی فلسفہ ہے جو مردوں کی طرح ایک انسان کی حیثیت سے خواتین کے حقوق، ان کی آزادی اور وقار کے دفاع کے لیے ابھرا ہے۔ یہ عورتوں پر مسلط ہونے والے مردانہ تسلط، ظلم وستم اور پدرانہ نظام کے خلاف ایک عالمی تحریک چلی، یہ تحریک نہ صرف مغرب میں بلکہ اس کی بازگشت عرب دنیا تک پہنچی اور نمودار ہوئی۔ عرب میں جن مفکروں اور دانشوروں نے نسوانی فکر کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے، ان میں فاطمہ المرنیسی (مراکش)، سحر الخلیفہ (فلسطین)، غادہ السمان (سیریا)، ڈاکٹر نوال السعداوی (مصر) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ السعداوی (1931-2021) جس نے اپنی تخلیقات کے ذریعے تانیثی ادب میں ایک منفرد مقام حاصل کیا اور اسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ السعداوی نے عرب خواتین کے مسائل کو نہ صرف حل کیا بلکہ انہیں جرأت اور دلیری کا سبق دیا۔

السعداوی کے تحریروں مںن ہم عرب نسوانی فکر کے بارے مںی کس حد تک بات کرسکتے ہںخ؟

کاس واقعی کوئی عرب فیمنزم ہے، یا یہ صرف مغربی حقوق نسواں کی بازگشت ہے؟ یا یہ اصل مںن عرب حققتک کے مرکز سے نکلا ہے؟

اس مطالعہ اور تجزیے کے ذریعے نوال السعداوی کے حقوق نسواں کی فکر کے کچھ خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تانیثی فکر اور اس کے مسائل پر بھی بحث کی گئی ہیں۔

نوال السعداوی اور حقوق نسواں

نوال السعداوی کی زندگی اور کارنامے: نوال السعداوی ایک مصری ڈاکٹر اور مصنفہ ہے۔ وہ 1931ء میں مصر کی قلوبیہ گورنریٹ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ انھوں نے 1954ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے میڈیسن اور جنرل سرجری میں بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے 1966ء میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی سے پبلک ہیلتھ میں ماسٹرس کی ڈگری بھی حاصل کی۔ نوال نے اپنے پیشہ ورانہ کیریئر کا آغاز 1955ء میں قاہرہ کے قصر العینی میں ایک ممتاز معالج کے طور پر کیا، پھر ان کی کتاب "المرأ※ والجنس (خواتین اور جنس)" کی وجہ سے انہیں وزیر صحت نے ملازمت سے برطرف کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے ادبی تحریروں کی طرف توجہ دی، چونکہ ان کی تخلیقات کا بنیادی نظریہ ایک طرف عورت کی آزادی اور انسان کے درمیان تعلق کے گرد گھومتا ہے اور دوسری طرف قوم کی آزادی کے مختلف ثقافتی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں سے تعلق ر※ ھتا ہے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے 1982ء میں "عرب خواتین کی یکجہتی ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی اور "عرب فاؤنڈیشن فار ہیومن رائٹس" کے قیام میں بھی مدد کی۔ اس نے "ہیلتھ ایجوکیشن ایسوسی ایشن" اور مصری خواتین مصنفین کے لیے ایک انجمن بھی قائم کی۔ قاہرہ میں ہیلتھ میگزین کے چیف ایڈیٹر اور میڈیکل ایسوسی ایشن کے جرنل میں ایڈیٹر کے طور پر ایک مدت تک کام کیا۔

نوال تین براعظموں سے تین اعزازی ڈگریاں حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ 2004ء میں اسے یورپ کی کونسل سے نارتھ ساؤتھ پرائز ملا۔ 2005ء میں اس نے بیلجیم سے انانا انٹرنیشنل پرائز جیتا اور 2012ء سوئٹزرلینڈ میں انٹرنیشنل

سبق اردو نومبر 2025
80

پیس آفس سے شان میک برائیڈ پیس پرائز سے نوازی گئی۔ السعد اوی کے ادبی کیرئیر کے دوران اس نے بہت سے ایوارڈز بھی حاصل کیے جن میں افریقن لٹریچر ایسوسی ایشن ایوارڈ، جبران لٹریری ایوارڈ، عرب فرنچ فرینڈ شپ سوسائٹی کا ایک ایوارڈ، اور سپریم کونسل برائے آرٹس اینڈ سوشل سائنسز کا ایک ایوارڈ شامل ہے۔

السعداوی کا انتقال 2021ء میں نوے (90) برس کی عمر میں ہوا، انہوں نے عربی ادب میں قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے، اور ان کی سب سے اہم تخلیقات میں "الأنث※

ي الأصل (عورت ہی اصل ہے)، المرأ※ والجنس (عورت اور جنس)، قضایا المرأ※ (خواتنا کے مسائل)، الف※ روالسیاس※ (فکر اور ساست)، المرأ※ والغرب※ (خواتنج اور بگاینگی)، المرأ※ والصراع النفسي (عورتں ا اور نفساشتی کشمکش)۔ اس کے علاوہ اس نے کئی مختصر کہانوں کے مجموعے اور ڈرامے بھی شائع کےت، جن مں ن سب سے نمایاں "تعلمت الحب" (مں ونے محبت سیھع)، "لحظ※ الحقیق※ (حق کا لمحہ)"۔ عین الحیا※ (زندگی کی آنکھ)، ہں ا۔

حقوق نسواں کے نظریے کی تعریف:-

حقوق نسواں سے مراد وہ سوچ ہے جو خواتین کے حقوق کی حمایت کرتی ہے اور ان کے خلاف مردانہ اختیارات کے ذریعے کیے جانے والے جبر سے ان کی آزادی کا مطالبہ کرتی ہے۔ یورپ میں انیسویں صدی کے وسط میں روشن خیالی کے ایک حصے کے طور پر اس کا آغاز ہوا ۔ حقوق نسواں کا فلسفہ عرب ثقافت کا ایک حالیہ فلسفہ ہے۔ محققہ یمنا طریف الخولی کا خیال ہے کہ فیمنزم (feminism) کی اصطلاح کا ظہور پہلی بار مغرب میں انیسویں صدی کے آخر میں ہوا۔ حقوق نسواں اپنی ابتداء میں ایک ایسی سیاسی تحریک ہے جس کا اجتماعی مقصد خواتین کے حقوق ہے ۔ وہ یہ بھی مانتی ہیں کہ حقوق نسواں کا فلسفہ موجودہ حالات کے نازک نقطہ نظر سے مابعد جدید اور مابعد نوآبادیاتی اقدار کا ایک مجسمہ ہے، جو سماج کی خامیوں، کوتاہیوں اور انحرافات پر روشنی ڈالتا ہے۔

حقوق نسواں کے فلسفے نے پدرانہ نظام سے باہر فلسفے قائم کرنے اور حقوق نسواں کے فلسفیانہ نظاموں کو تشکیل دینے کی کوشش کی جو دنیا کو خواتین کے لیے ایک بہتر جگہ بنانے کے لیے مروجہ سماجی ثقافت کے تابع ہوں۔ محققہ خدیجہ العزیز کا ماننا ہے کہ آج کے دور کے مغربی معاشرے میں حقوق نسواں کا بنیادی نقطہ نظر خواتین کا کوئی ایک اسکول یا تحریک نہیں ہے جو اس سوچ کی نمائندگی کرتی ہو۔ بلکہ مختلف نظریات اور فلسفوں سے تعلق رکھنے والی بہت سی تحریکیں ہیں جو مغرب اور دنیا کے بہت سے ممالک میں متنوع طور پر پروان چڑھی ہیں۔ جیسے سیاہ فام تحریک کے بارے میں لبرل فیمنسٹ فکر، مارکسسٹ، مادیت پسند، سوشلسٹ، ہم جنس پرست، بنیاد پرست اور فیمنسٹ فکریں موجود ہیں۔

مندرجہ بالا کی روشنی میں ہم پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عام طور پر حقوق نسواں ہر اس نظریے کو کمزور کرنے کا کام کرتی ہے جو معاشرے میں خواتین کی کمتری کو قائم کرے، یا ان پر جبر و تشدد کی کوشش کرے۔ مرد اساس سماج نے عورت کو ایک پسماندہ وجود بنا کر رکھ دیا اور اس طرح عورت ہر شعبے میں مرد کے پیچھے رہ گئی۔

نوال السعد اوی کے مطابق تانیثی گفتگو

مغربی حقوق نسواں اور عرب حقوق نسواں کے درمیان: نوال السعد اوی ایک وسیع ذہن کی ملکہ تھی۔ ان کا خیال ہے کہ "عرب حقوق نسواں کی طرف سے پیش کردہ سب سے اہم مسئلہ فکری یکطرفہ ازم کو ختم کرنے کی کوشش ہے جو چیزوں کو ایک آنکھ (مرد کی آنکھ) سے دیکھتی ہے یا دوسرے کو دیکھے بغیر اپنی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ چونکہ حقوق نسواں فلسفہ اپنی اصل میں ایک مغربی فلسفہ ہے، تو کیا کوئی ایسی چیز ہے جو عرب اسلامی ثقافت میں اس کی پیوند کاری کو جواز بناتی ہو اور اس طرح حقوق نسواں دوسرے درآمد شدہ فلسفوں کی طرح بن جاتی ہے؟

نوال السعد اوی کا کہنا ہے کہ جو کوئی یہ تصور کرتا ہے کہ عرب خواتین کی آزادی کی تحریک کی کوئی تاریخ نہیں ہے اور یہ مغرب سے درآمد کی گئی ہے، گویا مغربی خواتین ہی ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرنے کی اہل ہیں، جب کہ ہم عرب خواتین کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں اس بات کی تصدیق کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی کہ خواتین کی آزادی کا نظریہ کوئی مغربی نظریہ ہے، بلکہ ایک قدیم فرعونی خیال ہے، جو قدیم مصر میں اس وقت شروع ہوا جب فرعونی ظلم کے خلاف مزاحمت میں خواتین نے غلاموں کے ساتھ حصہ لیا۔

اگر عورتوں کو جبر، استبداد اور پسماندگی سے نجات دلانے کا تصور صرف مغرب تک محدود ہوتا تو پھر عرب مردوں کا کیا ہوگا؟ کیا ہم نے حقوق نسواں کی پرواہ کرنے کے لیے مردانہ فلسفہ حاصل کر لیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب معاشرے کی حالت ٹھیک نہیں ہے کیوں کہ وہ ظلم وستم کی زندگی گزارتا ہے، وہ عزت، آزادی اور باوقار زندگی چاہتا ہے، وہ اس بات کا اعتراف اپنے تجزیے میں کرتی ہے کہ عرب کی سماجی اور سیاسی حالات عرب میں مرد اور عورت کا صورت حال اس وقت ظاہر کرتا ہے جب مرد خدا، بادشاہ اور وطن کا نعرہ لگاتے ہیں، جبکہ عورتیں خدا، باپ، شوہر کو پکارتی ہیں، وہ اس لیے کہ دونوں ظلم وستم کی زندگی گزارتے ہیں۔، السعد اوی کا خیال ہے کہ مردوں پر ڈھائے جانے والا ظلم صرف ایک طرح کا ہے جو کہ ریاست یا جاگیردارانہ اور معاشی نظام کی حکومت ہے، جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، ان پر ڈھائے جانے والے ظلم دو طرح کے ہیں وہ یہ کہ ایک طرف حکومت ریاست اور دوسری طرف شوہر کا جور وستم یا پدرانہ خاندان ہے۔ اس لیے عرب خواتین کی آزادی اس وقت تک حقیقت نہیں بن سکتی جب تک کہ حکومت ریاست اور خاندان دونوں کی طرف سے ان پر مسلط ظلم کو ختم نہ کیا جائے۔

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عرب نسوانی گفتگو عرب مرد اور عورت دونوں کو آزاد کرنے کی خواہش رکھتی ہے، اگر عرب مرد مظلوم ہے تو پھر عرب عورت اس

INTERNATIONAL PEER REVIEWED (REFEREED) JOURNAL
ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

سبق اردو نومبر 2025
81

سے زیادہ مظلوم ہے۔ آیئے مظلوم عرب مرد کو چھوڑیں اور اس عورت کی بات کریں جو اس سے زیادہ مظلوم ہے۔ چونکہ عورت کو صرف اس جیسی عورت ہی سمجھ سکتی ہے، اس لیے اس کے بارے میں مرد کی ہر بات یا تقریر متعصّبانہ اور غیر منصفانہ رہتی ہے۔ اس میں نوال السعد اوی کا خیال ہے کہ خواتین کو خواتین کے بارے میں درست معلومات کی ضرورت ہے۔ جو ان کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کو تبدیل کرتی ہے اور وہ عورت ان معلومات کو درست کرتی ہے جو عورتوں کے بارے میں دنیا میں پھیلائی گئی تھیں، بلکہ یہ خواتین کے بارے میں مردوں کا نقطہ نظر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ السعد اوی اپنی علمی بنیادوں پر حقوق نسواں کے نظریات کو اپنانے کی ضرورت پر زور دیتی ہے جو نظریات دنیا کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔، کیونکہ یہ وہ نظریات ہیں جو تاریخ میں عورتوں اور غلاموں پر ڈھائے جانے والے ظلم کی جڑوں کو تلاش کرتے ہیں ۔

اس بات کی طرف اشارہ کرنا اور متنبہ کرنا ضروری ہے کہ السعد اوی کی حقوق نسواں کی فکر نہ صرف عرب خواتین کو مخاطب کرتی ہے بلکہ تمام خواتین کو، خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب، جس طرح غلاموں اور اجرت لینے والوں نے ایسے انقلاب برپا کیے ہیں جو پوری انسانی تاریخ میں آج تک پھیلے ہوئے ہیں، لیکن خواتین کا انقلاب دنیا کے کسی ملک میں آج تک نہیں آیا۔ اس کا کہنا ہے کہ عورتیں خواہ عرب ہوں یا مغربی، اس وقت تک آزاد نہیں ہوگی جب تک کہ نہ دنیا پر حکمرانی کرنے والا نظام، پدرانہ طبقاتی نظام کی توسیع بند ہو جائے۔

حقوق نسواں اور مذہبی فکر

السعد اوی کا خیال ہے کہ اگر عورت کی کمتری معاشرے نے اپنی اقدار اور اصولوں کے ساتھ مسلط کی ہے تو کیا عورت کی کمتری کو برقرار رکھنے میں مذہب کا ہاتھ ہے؟ ایسا بالکل بھی نہیں ہے کیونکہ مذہب عورت کے حقوق کی بات کرتا ہے نہ کہ اسکی کمتری اس میں ہمیں معلوم ہوا کہ خواتین پر ظلم کی وجہ مذہب نہیں ہے، بلکہ اس کی وجوہات معاشیت اور سیاسیت ہیں، اور عرب خواتین کو یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کے حقوق کا نقصان اور ان کی محکومی کے وجوہات کیا ہیں۔ اسلام یا دیگر مذاہب وجوہات نہیں ہیں بلکہ وہ سیاسی اور معاشی وجوہات ہیں جو مادری نظام کو پدرانہ طبقاتی نظام میں تبدیل کرتے ہیں۔

وہ دوسری جگہ یہ بھی کہتی ہے کہ مذاہب وہ بنیادی تاریخی وجہ نہیں ہے جس نے عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کمتر بنایا ہے۔ بلکہ غلامانہ نظام میں عورتوں کی کمتری ظاہر ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں حکمران سیاسی قوتیں ہوتی ہیں جو مذاہب کی دوبارہ تشریح اپنے حق میں کرتی ہیں نہ کہ اس کے برعکس۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب مذہب سیاست کا خادم بن جاتا ہے اور سیاسی حکمران ہر چیز کو اپنے فیصلوں میں اور خدمت میں بروئے کار لانے کا میاب ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ السعد اوی کہتی ہے: "سچا مذہب ایک انسان اور دوسرے انسان میں فرق نہیں کرتا، نہ ہی مرد اور عورت، غریب اور امیر، ہ سیاہ و سفید میں فرق کرتا ہے۔ مذہب لوگوں کو جھوٹ بولنے، اپنے سچے جذبات کو چھپانے یا چھپ کر ان پر عمل کرنے اور لوگوں کے سامنے عفت و عصمت کا اظہار کرنے کا نہیں کہتا، بلکہ سچا مذہب نفرت کے خلاف ہے اور روح سے نکلنے والی مخلصانہ محبت کے ساتھ ہے ۔السعد اوی ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں فرق نہیں کرتی، کیونکہ معاملہ اس کے لیے یکساں ہے، جیسا کہ تمام مذاہب عورت ہو یا مرد دونوں سے اخلاقی اور انسانی اصول، ایمانداری، محبت، آزادی اور انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تمام مذاہب جیسے اسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندومت، یا بدھ مت، انسانی زندگی میں ایک خالص روحانی رجحان ہے جو سچائی اور مساوات پر مبنی ہے، ناانصافی اور تفریق پر نہیں، اور انقلاب اور ترقی پر مبنی ہے، جمود اور پسماندگی پر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ السعد اوی ان مذاہب کی دوبارہ تشریح کا مطالبہ کرتی ہے جن کی تشریح صرف مردوں کے لئے کی گی تھی، اور وہ فیمنسٹ تھیالوجی" کی بات کرتی ہے۔ یہی وجہ کہ وہ یہودیت، عیسائیت، اسلام، ہندومت، بدھ مت اور دیگر مذاہب کے احیاء کا مطالبہ کرتی ہے۔ بشرطیکہ ان مذاہب کی تشریح خواتین کے نقطہ نظر سے کی جائے۔" وہ یہ بھی مانتی ہے کہ یہ اس کا حق ہے کہ وہ مذہب کو اپنے ذہن سے سمجھے نہ کہ بعض مولویوں کے ذہنوں سے، اسکا ماننا ہے کہ اسلام میں کوئی مولوی یا پادری نہیں ہے، اور وہ دین کے بارے میں علم کو اپنا فرض سمجھتی ہے، اور وہ اپنے مذہب کے بارے میں جو کچھ سمجھتی ہے اس کے لیے وہ خدا کے سامنے ذمہ دار اور مکلف ہے۔

السعد اوی نے خواتین سے متعلق کچھ فقہی مسائل، ولایت، کفالت، وراثت اور دیگر متعلقہ مسائل کو سمجھنے میں مہنت اور مستعدی سے کام لیا ہے۔ چونکہ مرد کو اسلام نے عورت کا سرپرست اور ذمہ دار ٹھرایا ہے، لیکن اگر عورت کسی مرد پر خرچ کرتی ہے تو کیا وہ اس کی سرپرست بن جائے گی؟ اگر عورت کو وراثت میں مرد کی وراثت کا آدھا حصہ ملے اس بہانے کہ وہ خرچ کرنے کی ذمہ دار نہیں ہے۔ پھر اگر وہ مرد کی طرح خرچ کرنے لگے تو کیا ہوگا؟ کیا میراث میں وہ پھر مرد کے برابر ہے؟ اگر اسلام میں ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کے برابر ہے تو پھر اگر کوئی عورت ڈاکٹر یا یونیورسٹی کی پروفیسر یا وزیر بن جائے تو کیا ہوگا؟ کیا وہ تب بھی گواہی نہیں دے سکے گی جب کہ مرد کو ایسا کرنے کی اجازت ہے چاہے وہ ناخواندہ ہی کیوں نہ ہو ؟ السعد اوی نے اتنی جرأت اور دلیری کے ساتھ فقہی مسائل پر بحث کی اور اسلامی شریعت کے قوانین پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا۔ وہ یہ بھی مانتی ہے کہ اسے اپنے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں غلطی کرتی ہے تو اس کے پاس کوئی نہ کوئی عذر ہے۔

حقوق نسواں اور اخلاقیات:

السعد اوی کا خیال ہے کہ اگر ہم ان اخلاقیات اور اقدار کی بات کریں جو خواتین کو محدود کرتی ہیں اور ان پر ایسی پابندیاں عائد کرتی ہیں جو وہ مردوں پر عائد نہیں کر سکتی، تو یہ اخلاقیات مصنوعی ہیں، جو پدرانہ نظام کے ذریعے تخلیق اور

سبق اردو نومبر 2025
82

مسلط کی گئی ہیں، اور اس تناظر میں اس کا کہنا ہے کہ "معاشرہ جو اخلاقی معیارات مرتب کرتا ہے وہ رنگ یا جنس کو قطع نظر کرتے ہوئے اپنے تمام اراکین پر لاگو ہونا چاہیے۔" اگر معاشرہ جنسی عفت کو ایک اخلاقی قدر کے طور پر مانتا ہے، تو اس کا اطلاق معاشرے کے تمام افراد پر ہونا چاہیے۔ تاہم اگر اس کا اطلاق جنس کے ایک صنف کیا جائے دوسری پر نہیں، یا ایک طبقے کیا جائے دوسری پر نہیں، تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عفت ایک اخلاقی قدر نہیں ہے، بلکہ موجودہ سماجی نظام کی طرف سے نافذ کردہ قانون ہے۔

نوال السعد اوی نے اپنے بہت سے افسانوی میں عرب معاشرے میں عزت اور عفت کی اخلاقیات کے بارے میں بات کی ہے، اور ہم پر اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے کہتی ہیں: "جھوٹ مروجہ اخلاقیات کے معیار میں ہے، جس میں سب سے اہم کنوارے پن کا معیار ہے" اور اس کی وجہ میڈیکل سائنس کی ترقی ہے۔ سرجیکل میڈیسن کی ترقی کی بدولت ہائمنز کو ٹھیک کیا جاتا ہے اس لیے کنوارا پن اب اخلاقیات یا عزت کا پیمانہ نہیں رہا، معاشرے کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ لڑکیوں کی ہائمنز کو سرجیکل اسکیلپل سے ٹھیک کرنے کے بجائے اپنی عقل اور اخلاق کو درست کریں۔

السعد اوی کہتی ہے کہ اخلاقیات کے پیمانہ کے طور پر کنوارا پن کی قدر دنیا کے مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے ممالک میں گر گئی ہے، اس طرح کی فرسودہ اقدار نے بعض عرب معاشروں میں خواتین کے ختنے کا رواج مسلط کر دیا اور اس طرح خواتین کو ان کے فطری حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کے جسم میں کلیٹورس (بظر) اضافی عضو (اپینڈکس کی طرح) نہیں ہے بلکہ یہ جسم میں بنیادی عضو کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے عورت جنسی لذت محسوس کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ السعد وی لڑکوں اور یہاں تک کہ لڑکوں کے ختنے کے رواج کو بھی سختی سے مسترد کرتی ہے، اسکا کہنا ہے کہ کسی شخص سے اس کے جسم کا کوئی حصہ چاہے وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو شناخت، اقدار یا وراثت کے نام پر نکالنا ممکن اور درست نہیں ہے۔

نوال السعد اوی عورت بھی شدید سماجی تضاد میں رہتی ہے اسے نرم، پاکیزہ اور جنسی تعلقات سے بے نیاز ہونا چاہیے اور اسے لذت کا سامان ہونا چاہیے، اپنے شوہر کو نشہ کی حد تک مطمئن کرنی چاہیے۔ اس کے جسم سے تجارتی تشہیر اور اشیا کے اشتہارات کے لئے اسکی نمائش ضروری ہے یہ رسوائی نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے۔

نوال السعد اوی نے اس طرح کے اخلاق کو اپنے تجزیے میں ان معاشی اور استحصالی مقاصد سے منسوب کیا ہے جو نجی ملکیت کے ظہور کے ساتھ پیدا ہوے ہیں، جنہوں نے پاکدامنی کو عورتوں پر مسلط کیا نہ کہ مردوں پر۔ اخلاقی اقدار اور قوانین معاشی ضرورت کے تابع کرنے کے لئے تاریخی اور سائنسی حقائق معاشرے کی ترقی کے ہر مرحلے پر ثابت کرتی ہیں۔ زراعت سے لیکر مینوفیکچرنگ تک اور صنعت کاری سے لیکر ٹیکنالوجی تک اور جدید مشینوں کے دور میں معاشرے کے بدلنے کے بعد بھی مرد اور عورت کے تعلقات میں جو پیش رفت ہوئی اس سے زیادہ اس کا واضح ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بعض ممالک میں مرد اور عورت کے تعلقات میں اس قدر تبدیلی آئی جیسا کہ معاشرہ سرمایہ داری سے سوشلزم میں منتقل ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ السعد اوی نہ صرف اس صورت حال کی شناخت کر رہی ہے جکا وسامنا خواتین کو کرنا پڑتا ہے، بلکہ وہ ایسے حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے جو پوری تاریخ میں خواتین کے مصائب اور تکالیف سے چھٹکارا پانے کے لیے مناسب سمجھا جائے اور ظلم و جبر سے ان کی نجات اور آزادی کے لیے کوشاں ہوں۔ تاکہ خواتین پر ڈھائے جانے والے ظلم کو اس کے اصل اور اصل اسباب کو ختم کیا جا سکے۔ خواتین کو تب تک آزادی نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ نہ ہر قسم کی معاشی، جنسی، اخلاقی یا نفسیاتی جبر کو ختم کر دیا جائے۔ مردوں کے برابر اجرت اس وقت تک حقیقی آزادی کا باعث نہیں بن سکتی جب تک کہ پدرانہ نظام رائج ہے جس میں عورتیں مردوں کے تابع ہیں۔

جساپ کہ السعد وی کہتی ہے کہ خواتن کو درپشس جنگ ایمان اور الحاد کے درمابن کوئی فلسفاینہ جنگ نہں ہے، یا ترقی یا جدیدیت کے درماان جنگ نہں ہے، بلکہ یہ معاشی اور ثقافتی ثروت کے ذرائع کو عوام کے ہاتھوں مں الانے کی جنگ ہے اور پدرانہ نظام کے کھنڈرات پر ایک نا نظام تشکلے دینے کی جنگ ہے ۔

نوال السعد اوی کے حقوق نسواں کے نظریہ سے ہمیں یہ بات واضح ہو جاتا ہے کہ سوشلسٹ نقطہ نظر خواتنس کو آزادی دلانے اور انہں جبر سے نجات دلانے کے لےق موزوں ترین حل ہے۔ اور ہمس ح ان کا یہ قول بھی ملتا ہے کہ تاریخ مں ا جنسی جبر اور معاشی جبر مردوں کا عورتوں پر سب سے پہلا ظلم ہے جہاں تک سرمایہ دارانہ معاشروں میں خواتین کی پست حیثیت کا تعلق ہے، ان کی سائنسی اور تکنیکی ترقی اور نسبتاً دولت کے باوجود السعد اوی کو احساس ہے کہ سوشلزم عورتوں اور مردوں کی ایک ساتھ آزادی کا راستہ ہے۔ کیونکہ سوشلزم کے حقیقی معنوں میں خواتین کی آزادی اتنی ہی زیادہ ہوگی جینی معاشرے میں تبدیلی کی گنجایش زیادہ ہوگی۔۔

جب السعد اوی قدیم معاشرے کے بارے میں بات کرتی ہے، جو ان کے نظریے کے مطابق عورتوں کے سنہری دور کی نمائندگی کرتا ہے جس معاشرے میں ماں کا کنٹرول تھا، سیمون ڈی بیوویرا (French feminist writer) کے خیال مطابق یہ محض ایک مفروضہ ہے جسے اینگلز (Friedrich Engels) نے باشوفین (Johann Jakob Bachofen) سے لیا تھا اور اس پر غور کیا تھا کہ معاشرہ ماں کے کنٹرول کے دور سے پدرانہ کنٹرول کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ تانیثیت کا عظیم تاریخی زوال ہے اور خواتین کے لیے یہ سنہری دور ایک افسانہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

نوال السعد اوی مختلف علوم کے میدان میں مردانہ نقطہ نظر کو یکطرفہ نظریہ کے

سبق اردو نومبر 2025

83

بنیاد پر رد کرتی ہے اور مردانہ نقطہ نظر کے جیسے معاملے جیسا کہ: نفسیات میں فرائیڈ کے نظریہ کو رد کرتی ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی کہتی ہے کہ مارکس، اینگلز اور دوسرے مارکسسٹوں کے نظریات بھی یکطرفہ نقطہ نظر (مردانہ خیالات) میں شامل ہیں ۔

ماحصل:

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نوال السعداوی، خواہ ہم ان سے متفق ہوں یا نہ ہوں، عربی حقوق نسواں کی علمبردار ہے، اور ان کی تخلیقات اور تحریریں جن کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ خواتین اور یہاں تک کہ پوری انسانیت کا دفاع ان کے جنس سے قطع نظر جراحی اور دوا کی چھلنی سے نہیں بلکہ سوچ اور عقل کے چھلکے سے ہوتا ہے۔ اس نے عورتوں کی بگڑتی ہوئی حقیقت اور ان پر مسلط جبر و محکومیت کو بیان کیا اور عرب ماحول سے نکلنے والی نسوانی گفتگو کو عام طور پر مغربی نقطہ نظر اور خاص طور پر مارکسی نقطہ نظر کے ساتھ بھی پیش کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اس کے باوجود اس کی کچھ آراء اور موقف کو پدرانہ نظام کے ذریعے وضع کردہ قدامت پسند اور مردانگی پر مبنی عرب اسلامی معاشروں میں قبول نہیں کیا گیا۔ اور اس کے کچھ خیالات کو سرکاری، مذہبی اداروں کی طرف سے مذمت اور نامنظور کیا گیا۔ تاہم ابھی بھی عرب معاشرے میں حقوق نسواں کی فکر خصوصیات کے ساتھ زیادہ سے زیادہ موافقت کی طرف گامزن ہے۔ اور اسی واضح ثبوت کی وجہ سے ہم اسے عرب حقوق نسواں کہتے ہیں۔

حواشی:

مظفر رزاق، رواي※ اجتماعي※ ”موت الرجل الوحيد عل※ الأرض“ لنوال السعداوي، ایم فل مقالہ، مشرف: سید حسنین اختر، ڈیپارٹمنٹ آف عربک دلھی یونیورسٹی، 2021ء، ص54،55

خديج※ العزيزي، الأسس الفلسفي※ للف※ر النسوي الغربي، ط 1، بيسان للنشر والتوزيع، بيروت، 2005ء، ص17

الخولي يمن※ طريف، النسوي※ وفلسف※ العلم، مؤسس※ نداوي، وندسور المملك※※ المتحد※، 2018ء، ص263-266

الخولي يمن※ طريف، الفلسف※ النسوي※ فلسف※ تطبيقي※، ط 1، روابط للنشر والتوزيع، القا※ر※ 2018، ص12

رفق※ رعد، النقد الثقافي والنسوي※، ط 1، منشورات ضفاف، بيروت 2012ء، ص1661

خديج※ العزيزي، الأسس الفلسفي※ للف※ر النسوي الغربي، ط 1، بيسان للنشر والتوزيع، بيروت، 2005ء، ص21

نوال السعداوي، قضايا المرأ※ والف※ر والسياس※، مؤسس※ نداوي، ونسدور المملك※※ المتحد※، 2018ء، ص299

نوال السعداوي، المرأ※ والدين والأخلاق، ط 1، دار الف※ر، دمشق، 2000ء، ص70

نوال السعداوي، قضايا المرأ※ والف※ر والسياس※، مؤسس※ نداوي، ونسدور المملك※※ المتحد※، 2018ء، ص84

نوال السعداوي قضايا المرأ※ والف※ر والسياس※، مؤسس※ نداوي، ونسدور المملك※※ المتحد※، 2018ء، ص25

نوال السعداوي، الوج※ العاري للمرأ※ العربي※، مؤسس※ نداوي، وندسور المملك※※ المتحد※، 2017ء، ص196

نوال السعداوي، المرأ※ والدين والأخلاق، ط 1، دار الف※ر، دمشق، 2000ء، ص222

نوال السعداوي قضايا المرأ※ والف※ر والسياس※، مؤسس※ نداوي، ونسدور المملك※※ المتحد※، 2018ء، ص21

نوال السعداوي قضايا المرأ※ والف※ر والسياس※، مؤسس※ نداوي، ونسدور المملك※※ المتحد※، 2018ء، ص91

نوال السعداوي قضايا المرأ※ والف※ر والسياس※، مؤسس※ نداوي، ونسدور المملك※※ المتحد※، 2018ء، ص159

نوال السعداوي، الوج※ العاري للمرأ※ العربي※، مؤسس※ نداوي، وندسور المملك※※ المتحد※، 2017ء، ص136

نوال السعداوي، المرأ※ والدين والأخلاق، ط 1، دار الف※ر، دمشق، 2000ء، ص80

نوال السعداوي، المرأ※ والجنس، ط 2، المؤسس※ العربي※ للدراسات والنشر، بيروت 1990ء، ص149

نوال السعداوي، المرأ※ والجنس، ط 2، المؤسس※ العربي※ للدراسات والنشر، بيروت 1990ء، ص305

سبق اردو نومبر 2025
84

ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کا نمائندہ شاعر: فراق گورکھپوری

ڈاکٹر رشی کمار شرما

اسوسیٹ پروفیسر

ہندوستانی زبانوں کا مرکز جواہر لال نہرو یونی ورسٹی

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

ہند آریائی زبان کی مختلف شاخیں پیدا ہوکر اپنی انفرادی شناخت قائم کیں مگر اردو زبان میں جو کشش، دلکشی، شیرینی اور چاشنی ملتی ہے وہ کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کی لطافت سے لطف اندوز ہونے کے لیے دوسری زبانوں کے ماہرین بھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ماضی قریب میں اردو زبان کو فروغ دینے میں بہت سارے ایسے ناقد، دانشور اور ادیب پیدا ہوئے جن کا تعلق براہ راست اردو زبان سے نہیں رہا مگر اردو زبان کی کشش اور لطافت کے گرویدہ ہوکر اس کے فروغ میں پوری زندگی صرف کر دی۔ ان ادیبوں میں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا نام بحیثیت شاعر، نقاد اور دانشور سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔

اگر چہ فراق کی اصل شہرت کا معیار غزل گوئی ہے مگر رباعیات کے ساتھ ساتھ نظم نگاری میں بھی انفرادی شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی شاعری میں سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی مسائل کی باز یافت جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے دنیا کے تمام ادیبوں کی طرح اپنی سرزمین اور مادرِ وطن سے اپنا رشتہ مستحکم رکھا۔ اردو شاعری کی روایت میں نظیر اکبرآبادی کے بعد فراق پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مکمل طور پر ہندستانی تہذیب و معاشرت کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ یہاں کے تیوہار، موسم، رنگ برنگ پھول، ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں، شادی و بیاہ کے مختلف رسومات اور رمناظر فطرت کی عکاسی خواہ چاندنی رات ہو کہ برسات کا موسم، ساون کی بہاریں ہوں یا موسم خزاں کے تھپیڑے، ہرے بھرے جنگلات یا راجستھان کے خشک اور ریتیلے صحرا یا گنگا و جمنا کی اٹھتی ہوئی لہریں وغیرہ تمام چیزیں ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''آدھی رات'' نظم کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

شعاع مہر نے یوں ان کو چوم چوم لیا
ندی کے بیچ کمدنی کے پھول کھل اٹھے
نہ مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دنیا
یہ جھائیں جھائیں سی رہ رہ کے ایک جھینگر کی
حنا کی ٹیٹوؤں میں نرم سرسراہٹ سی
فضا کے سینے میں خاموش سنسناہٹ سی
یہ کائنات اب اک نیند لے چکی ہوگی
یہ سرنگوں ہیں سرشاخ پھول گڑہل کے
کہ جیسے بے بجھے انگارے ٹھنڈے پڑ جائیں

فراق نے اپنی شاعری میں عربی فارسی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت الفاظ کو بھی بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ ہماری شاعری میں جس طرح ہندستان کا ذکر ہونا چاہیے وہ ابھی تک معدوم ہے۔ انھیں گلہ بھی ہے کہ اردو شاعری میں ہندوستانیت بہت کم ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ جس طرح اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بھی برمحل استعمال کرنے سے اردو زبان میں مزید وسعت اور ہمہ جہتی پیدا ہوسکتی ہے۔ اپنے اس خیال کو وسعت دیتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

''اردو کو سنسکرت اور ہندی شاعری دونوں کی قدروں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ صرف بھاشا کی شاعری سے استفادہ کر کے اردو شاعری کو ہندستانی کلچر اور اس کی روح کا صحیح نمائندہ اور آئینہ دار نہیں بنایا جا سکتا لیکن اردو میں سنسکرت الفاظ کی بھر مار یا زیادتی کو راہ دینا یا تنگ نظر ہندوئیت کو جگہ دینا نقصان ہوگا''۔

(روپ چند باتیں۔ص 12)

فراق نے نہ صرف اردو شاعری میں عربی و فارسی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت الفاظ کی شمولیت پر زور دے کر اس کی وکالت کی بلکہ اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اپنی شاعری میں استعمال کر کے بھی دکھایا۔ مثال کے طور پر فراق کی یہ رباعی دیکھیں:

آنسو سے بھرے بھرے وہ نیناں رس کے
ساجن کب سکھی تھے اپنے بس میں
یہ چاندنی رات یہ برہ کی پیڑا
جس طرح الٹ گئی ہو ناگ ڈس کے

اس میں نینا، ساجن، سکھی، برہ، پیڑا، ناگ اور ڈسنا وغیر سنسکرت کے الفاظ ہیں مگر فراق نے اردو شاعری میں ان کو اس طرح استعمال کیا کہ شاعری میں مزید لطف اور نغمگی پیدا ہوگئی ہے۔

ہندستانی روایت میں عورت کو دیوی کے روپ میں دیکھا جاتا ہے اور ماں کا کردار سب سے باعزت اور پُروقار تصور کیا جاتا ہے۔ ماں سے محبت وعقیدت ہندستانی روایت اور تہذیب کا بھی اہم حصہ مانا جاتا ہے۔

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

سبق اردو نومبر 2025
85

فراق نے ماں جیسی عظیم ہستی کو ''نظم جگنو'' میں نئے طریقے سے پیش کر کے ماں اور اولاد کے آپسی خوشگوار رشتے کی تقدیس میں اضافہ کیا۔ فراق نے نظم ''جگنو'' میں ماں کی روحانی و معنوی تمول کا بیان بڑی عرق ریزی کے ساتھ کیا کہ ماں کی وفات کے بعد ایک بچے کی طبعی حالت اور ذہنی کیفیت کیسی ہوتی ہے؟ اس نظم میں بیس برس کا جوان لڑکا جذبات سے لبریز ہو کر ماں کی ممتا کو یاد کر کے پوری انسانیت کو ایک درس دیتا ہے کہ جن کی ماں ابھی باحیات ہیں وہ یقیناً قابل رشک اور خوش قسمت ہیں۔ ماں کی ممتا بھری گود میں لیٹ کر سونا، ماں کے ہاتھوں مار کھا کر منہ بسورنا پھر روتے ہوئے ماں کی باہوں سے لیٹ جانا، ماں کا مٹی کھانے سے روکنا، ڈانٹنا، جھڑکنا اور شرارت کرنے پر گھامڑ جیسے القابات سے نوازنا وغیرہ بچپن کی پوری کیفیت کو فراق نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس طرح بیان کیا کہ ہندستانی ماں کا تصور سامنے آجاتا ہے۔ ''نظم جگنو'' کے یہ چند اشعار ملاحظہ کریں:

وہ ماں جس کی محبت کے پھول چن نہ سکا
وہ ماں جس سے محبت کے بول سن نہ سکا
وہ ماں کہ سینے سے جس کے کبھی چمٹ نہ سکا
وہ ماں میں جس سے شرارت کی داد پا نہ سکا
میں جس کے ہاتھوں محبت کی مار کھا نہ سکا
جو مٹی کھانے پر مجھے کبھی پیٹ نہ سکی
نہ ہاتھ تھام کے مجھ کو کبھی گھسیٹ سکی
کبھی پیار سے مجھ کو نہ کہہ سکی گھامڑ

فراق کے ان اشعار کو پڑھ کر ہندستانی ماں کی حقیقی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً: بچوں کا بچپن میں مٹی کھانا، ماں کی ڈانٹ اور مار سہنا پھر منہ بسور کر رونا وغیرہ بنیادی طور پر مذکورہ بالا اشعار میرے مافی الضمیر کی نمائندگی کرتے ہیں اور انھیں پڑھ کر یقیناً بچپن کی شرارتیں اور ماں کے ممتا بھرے ہاتھوں سے مار کھانا پھر چاکلٹ کی لالچ دے کر ماں کا چپ کرانا یاد آجاتا ہے اور دوبارہ اسی بچپن میں جانے کو جی چاہتا ہے۔

فراق اپنے عہد کے ہندستان کی حالت زاری سے بہت نالاں تھے۔ کسی قوم کی ترقی کا انحصار اس ملک کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہوتا ہے۔ بچوں کی اعلیٰ تعلیم اور بلند تخیل سے ملک ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر بچوں کی تعلیم و تربیت سے روگردانی کی جائے تو اس ملک کو پستی میں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ فراق وقت شناس اور نباض قوم شاعر تھے۔ بدیسی حکومت کے زیر سایہ ملک کے بچوں کی اخلاقی اور ذہنی کدورتیں دیکھ کر فراق کا کلیجہ منہ کو آجاتا۔ وہ ان نازک حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہر خطرے کو مول لینے کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ جب تک بچوں کے اندر انقلابی جذبہ بیدار نہیں ہوگا، ہماری خوشحالی کا سورج طلوع نہیں ہوسکتا۔ ملک کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے ''نظم ہنڈولہ'' لکھتے ہیں:

زمینِ ہند ہنڈولا نہیں ہے بچوں کا
کروڑوں بچوں کا یہ دیس اب جنازہ ہے
ہم انقلاب کے خطروں سے خوب واقف ہیں
کچھ اور روز ہی رہ گئے جو لیل و نہار
تو مول لینا پڑے گا ہمیں یہ خطرہ بھی
کہ بچے قوم کی سب سے بڑی امانت ہیں

الہ آباد جسے دیوتاؤں کا شہر اور گنگ و جمن کے ملن کی بھومی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہر بارہ سال بعد جب مہا کمبھ میلے میں مختلف علاقے کے زائرین اور سادھو سنتوں کی آمد ہوتی ہے تو اس شہر کی رنگت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ فراق کے زمانے میں الہ آباد یونی ورسٹی میں ہندی اور اردو ادیبوں کا جمگھٹا ہوا کرتا تھا جس میں سید اعجاز حسین، احتشام حسین، آنند نرائن ملا، مہادیوی ورما، سمتر آنندن، ہری ونش رائے، تارا چند اور جواہر لال نہرو وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان عظیم شخصیات کی وجہ سے ہر محفل علمی اور ادبی محفل کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ فراق نے ایسے ادبی محافل کے زیر اثر فارسی تراکیب، استعارات اور تشبیہات سے انحراف کرتے ہوئے خالص ہندستانی تہذیب و روایت پیش کر کے اردو شاعری کو نئے معنی سے متعارف کرایا۔ ان کی شاعری میں تشبیہات، استعارات اور تلمیحات بھی ہندستانی روایت سے ماخوذ ہیں۔ بطور مثال یہ اشعار ملاحظہ کریں:

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو زندگی ہے رام کا بن باس
یہ کیف و رنگ نظارہ یہ بجلیوں کی لپک
رام ہوں یا ہوں کرشن کہ مجنوں کہ ہم تم
ملن کے بعد بیوگ جگت کی ریت یہی

(غزل کیا ہے مضمون از فراق گورکھپوری)

فراق ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شاعری اور مضامین سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تاریخ عالم کے ساتھ ساتھ عالمی ادب اور مذاہب عالم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے جن میں کالی داس، والمیکی، تلسی، کبیر، خسرو، شیکسپیر، ملٹن، ہومر، دانتے، فردوسی، خیام، حافظ، میر، غالب، ٹیگور اور اقبال وغیرہ کا ذکر خاص طور سے ملتا ہے۔ فراق کا خیال تھا کہ وہی ادب کامیاب ہوتا ہے جس میں آفاقیت کی فضا پائی جائے اور پوری دنیا کے کلچر کو اپنا کلچر تصور کیا جائے اور ہر تہذیب کی نمایاں خصوصیات کو بلا جھجک قبول کیا جائے۔ اس تعلق سے اپنے ایک خط میں، جو محمد طفیل کے نام سے لکھا تھا، لکھتے ہیں:

''بڑا ادب کسی قوم کے اپنی کھال میں مست رہنے کا ادب نہیں

سبق اردو نومبر 2025
86

ہوتا اس میں آفاقیت اور مقامیت کا سنگم ہوتا ہے۔ علاحدگی قوموں، تہذیبوں اور فنون کے لیے موت کا باعث بن جاتی ہے۔ ہم ہندستانی ضرور ہیں لیکن کرۂ ارض یا کائنات کے بھی شہری ہیں۔

(فراق اور اسلامی ادب از صادق۔ ص ۱۷۳)

فراق نے اردو اساتذہ سے استفادہ کرتے ہوئے مغربی ادبا سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا جس میں اہم نام ورڈز ورتھ کا ہے۔ ان مشرقی اور مغربی ادیبوں سے خوشہ چیں ہونے کی وجہ سے فراق کی شاعری میں جمال پرستی، روحانیت کی تلاش، حسن کو مذہب اور عشق کو ایمان بنانے کے ہنر نے فراق کو اگر ایک طرف آسکر وائیلڈ سے ملا دیا تو دوسری طرف قدیم مذہبی ادب کی روایات کا فیض بھی عطا کیا۔ اس تعلق سے ڈاکٹر محمد حسن اپنے ایک مضمون ''فراق کا طرز احساس'' میں اسی بات کو یوں رقم کیا ہے:

''فراق ہندوستانی میں اور اردو شاعری کی روایت کے باشعور وارث، اس لیے فراق کے کلام میں یہ رچاؤ ایک طرف ہندو آرٹ سے آیا جس میں پیکر تراشی، مادی کثافت سے روحانی لطافت پیدا کرنے کی کوشش روایت کا جز بن چکی ہے اور دوسری طرف اردو کے شعری ورثے سے جس میں داخلیت سپردگی اور لہجے کی نرمی کو درجۂ امتیاز حاصل ہے''۔

(فراق گورکھپوری از راج بہادر گوڑ، ص ۸۷)

فراق کی وہ نظمیں جن کا تعلق عہدِ طفلی سے ہے وہ قدم قدم پر ورڈز ورتھ کی نظموں کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ ان میں جگنو، ہنڈولا، شام عیادت، پرچھائیاں اور آدھی رات وغیر نظمیں خاص طور پر ہیں۔ فراق نے عہدِ طفلی کے بعض دلکش اور حسین لمحات کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے کہ جس کی مثال اردو شاعری میں فراق سے پہلے شاید ہی کسی شاعر کے یہاں متنوع صورت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

یہ کھیل کود کے لمحوں میں ہوتا تھا احساس
دعائیں دیتا ہو جیسے مجھے سکوت دوام
مجھے ہے یاد ابھی تک کہ کھیل کود میں بھی
کچھ ایسے وقفے پُر اسرار آ ہی جاتے تھے
کہ جس میں سوچنے لگتا تھا میرا بچپن
کئی معانی بے لفظ چھونے لگتے تھے

ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ سماج میں ہونے والے حالات وکوائف سے ہر ادیب ضرور متاثر ہوتا ہے اور وہ اثرات اس کی تخلیقات میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس پس منظر میں اگر فراق کی شخصیت کو پرکھا جائے تو فراق ایک اچھے شاعر، نقاد اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ گاندھی جی کی قیادت میں فراق جنگ آزادی کی جدو جہد میں شامل ہو گئے جس کی پاداش میں انھیں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ جیل میں گزارے ہوئے لمحات کو یاد کرتے ہوئے فراق لکھتے ہیں:

''کچھ ہی دنوں بعد مہاتما گاندھی نے تحریک آزادی شروع کر دی۔ میں زندگی سے بیزار ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں تمام سرکاری عہدوں کو چھوڑ کر جنگ آزادی میں شریک ہو جاؤں''۔

(فراق کی سیاسی زندگی از علی احمد فاطمی، ص ۹۰)

اگر چہ انقلابی شاعری کے اعتبار سے فراق کا مقام ان کے ہم عصر شعرا جوش، مجاز اور فیض سے کم ہے مگر ملک کی آزادی کے لیے انھوں نے کچھ انقلابی اشعار بھی کہا ہے۔ فراق کی نظم ''آزادی'' کے چند مصروں کو دیکھیں:

یہ مہر و ماہ یہ تارے یہ بام ہفت افلاک
بہت بلند ہے ان سے مقام آزادی
ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراق
ہماری سانس سے روشن ہے نام آزادی

فراق کی ذات آفاقی ذہنیت کی حامل تھی جس طرح آج پوری دنیا globalisation کے دور میں ایک گاؤں بن چکی ہے کہ گھر کی چہار دیواری کے اندر بیٹھ کر مختلف ممالک کے افراد سے بآسانی گفتگو ہو سکتی ہے۔ گھر بیٹھے یوکرین و روس کے تصادمات اور فلسطین و اسرائیل کے خونی مناظر کی پوری تصویر سیکڑوں میل دور ہونے کے باوجود سامنے ہوتے ہوئے معلوم پڑتی ہے۔ فراق عدم ٹکنالوجی کے باوجود بھی عالمی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ عظیم کے انسانیت سوز حادثات سے بخوبی واقف تھے۔ ان ہلاکت خیز مناظر کا اظہار اپنے اشعار میں جابجا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ''آدھی رات'' نظم کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

سیاہ روس ہے اب کتنی دور برلن سے
جگا رہا ہے کوئی آدھی رات کا جادو

فراق بحیثیت انسان مشربِ کل کے حامی تھے۔ تمام مذاہب کی تہذیب وثقافت پر گہری نظر رکھتے تھے بلکہ یہ کہا جائے کہ وہ مشترکہ تہذیب کے حامی تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے بلکہ تمام مذاہب کے پیروکاروں سے ان کی دوستی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ کسی ملک کی تہذیب کسی خاص قوم یا مذہب کی دَین یا جاگیر نہیں ہوتی بلکہ اس ملک کی تہذیبی اور معاشرتی ارتقا میں مختلف قوموں کی حصے داری برابر ہوتی ہے۔ ہندستان کی تہذیب و معاشرت تو دوسرے ممالک کے مقابلے میں اس لیے مختلف ہے کہ یہ ملک صدیوں سے باہری لوگوں کی میزبانی کرتا رہا ہے اور اس وسیع و عریض چمن میں ان کے بود و باش ہونے کی وجہ سے ہندستان کی تہذیب مختلف تہذیبوں کے مجموعے کے طور پر ایک گلدستہ کی شکل میں دنیا کے سامنے آئی۔ فراق کی شاعری میں اگر ایک طرف

سبق اردو نومبر 2025
87

ہندستانی تہذیب وروایت موجود ہے تو دوسری طرف اسلامی تہذیب وثقافت کی جھلک بھی بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔مثال کے طور پر ہندو روایت کی عظیم شخصیات کو نظم ''ہنڈولہ'' میں فراق اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

دیار ہند تھا گہوارا یاد ہے ہمدم
بہت زمانہ ہوا کس کے کس کے بچپن کا
اسی زمین پہ کھیلا ہے رام کا بچپن
اسی زمین پہ ان کے ننھے ننھے ہاتھوں نے
کسی سمے میں دھنش بان کو سنبھالا تھا
اسی دیار نے دیکھی ہے کرشن کی لیلا
یہیں گھروندوں میں سیتا سلوچنا رادھا
کسی زمانے میں گڑیوں سے کھیلتی ہوں گی

اسی طرح فراق اسلام کے پیغمبر محمد کو اسلام کے پیروکاروں تک ہی محدود رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ان کا ماننا تھا کہ محمد صاحب صرف عرب یا مسلمانوں ہی کے رسول اور پیغمبر نہیں تھے بلکہ پورے عالم کے ہادی ورہنما تھے۔

انوار ہیں بے شمار معدود نہیں
رحمت کی شاہراہ مسدود نہیں
معلوم ہے کچھ تجھ کو محمد کا مقام
وہ امت اسلام میں محدود نہیں

فراق کی اردو شاعری کی ایک اہم خصوصیت سراپہ نگاری ہے۔ ہماری اردو شاعری کی روایت میں معشوق کی سراپہ نگاری کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے جس میں معشوق کے ہر ہر عضو کو مختلف انداز میں بیان کر کے یا پیکر کی شکل میں ڈھال کر نئے نئے معانی پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ خوبی دوسرے شاعروں کی طرح فراق کے یہاں بھی پائی جاتی ہے مگر فراق کی شناخت ہندوستانی تہذیب کی وجہ سے سب سے منفرد ہو جاتی ہے۔

بس ایک ستارہ شنگرف کی جبیں پہ جھمک
وہ چال جس سے لبالب گلابیاں چھلکیں
سکوں نما خم آبرو یہ ادھ کھلی پلکیں
ہر ایک نگاہ سے ایمن کی بجلیاں لپکیں
یہ آنکھ جس میں کئی آسماں دکھائی پڑیں
گھٹائیں وجد میں آئیں یہ گیسوؤں کی لٹک

ان اشعار میں فراق نے سراپا نگاری کی عکاسی کرتے ہوئے مختلف عضو کو اس دلکش انداز میں بیان کیا کہ ہندستانی عورت کی پوری تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے کیوں کہ پیشانی پر جھمکا لٹکانا یہ صرف ہندستانی عورتوں کی ہی پہچان ہے۔

الغرض اس طرح اگر فراق کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا کہ ان کی شاعری میں زندگی کے تمام پہلوؤں اور مسائل کو موضوع بنایا گیا۔فراق انگریزی کے پروفیسر ہونے کے باوجود اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دی ہے یقیناً ناقابل فراموش ہے۔ اگر فراق ذہنی کشمکش اور ازدواجی زندگی کی تلخیوں کے شکار نہ ہوتے اور طویل نظموں کے بجائے مختصر نظمیں لکھی ہوتی تو شاید عوامی سطح پر بھی غالب واقبال کی طرح بلند مرتبے پر فائز ہوتے۔فراق نے اپنی رباعیات کے ذریعے ہندستان کی حقیقی تصویر پیش کر کے ایک بار پھر سے تلسی اور کبیر کی روایت کو زندہ کر دی جس کا نقش ہمارے قلوب واذہان میں تادیر قائم رہے گا۔

تیرے اشعار پر سر دھنتی جائیں گی نئی نسلیں
بچا کر وقت رکھے گا یہ دستاویز انسانی

Dr Rishi Kumar Sharma
Associate Professor(Urdu)
Centre of Indian languages
School of Language Literature and Culture studies
Jawahar Lal Nehru University New Delhi.110067

ترقی پسند تحریک
اور
راجندر سنگھ بیدی کے افسانے

ڈاکٹر شیو پرکاش
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی، دہلی

دنیا کی کسی بھی دوسری بڑی زبان کی طرح ہر صغیر کی سب سے مقبول زبان اُردو کا ادبی سفر بھی مختلف رجحانات اور تحریکات کی منزلوں سے گذرتا ہوا آج اس مقام پر آ پہنچا ہے جہاں اُردو نظم ونثر میں قدیم وجدید اصناف قابل فخر تخلیقی سرمایہ سے مالا مال ہو چکی ہیں۔ اُردو نظم ونثر کو اس ترقی یافتہ مقام پر فائز کرنے میں خاص طور پر علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک کا اہم ترین کردار رہا ہے۔ گرچہ ان تحریکات کے پہلو بہ پہلو، حقیقت پسندی، رومانیت، حلقۂ اُرباب ذوق اور جدیدیت کے رجحان سے لے کر مابعد جدید تصورّ ادب کی اثر پذیری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ہر ایک ادبی روّیہ اور رجحان کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے لیکن اُنیسویں صدی کے وسط میں شروع ہونے والی سرسید تحریک کی غیر معمولی ادبی خدمات سے قطع نظر بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک، عوامی بیداری، سماجی تبدیلی اور سیاسی جدوجہد کے حوالے سے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔

جرمن فلسفی کارل مارکس کے فلسفیانہ تصورات نے عالمی سطح پر سماجیات ،اقتصادیات، سیاسات اور جمالیات پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ دراصل مارکس نے ہیگل کی آئیڈیالزم اور فوئر باخ کے انفعالی مادی فلسفے سمیت ان تمام سابقہ مادی فلسفوں کو رد کیا کیونکہ یہ سبھی حد درجہ میکانکی، مجہول مابعد الطبیعاتی اور یک رُخے تھے۔ دراصل مارکس سے پہلے کے ان فلسفوں کی تشکیل خارجی زندگی سے تو ہوئی تھی لیکن یہ خود انسان کی خارجی زندگی پر اثر انداز ہونے کی زیادہ صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ جبکہ کارل مارکس نے اپنے فلسفے کو جدلیاتی اور فعال قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے فلسفے میں انسانی زندگی کی حقیقتوں پر اثر انداز ہونے والا وہ عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ہے جو عنصر آئیڈیالوجی یا تخلیقیت کے تمام مظاہر میں جن میں ادب وفن بھی شامل ہیں۔ مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہو کر زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مارکسزم سے لیا گیا یہی وہ تصور ہے جو اُردو شعر وادب کے لسانی، ثقافتی اور شعری محاسن کے ساتھ مل جل کر ترقی پسند نظریہ و ادب کی شکل میں ظہور پذیر ہوا اور جس نظریے نے عالمی سطح پر نمایاں ہونے والی بیداری اور غلام ہندوستان میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں غریب عوام، کسانوں اور مزدوروں کے استحصال جیسے عوامل کی وجہ سے ایک عوام دوست ادبی تحریک کی شکل اختیار کی۔ عام طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کو محض ایک نظریاتی تحریک قرار دیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد صرف مارکس کے مادی نظریات کا فروغ ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں جو غلط فہمیاں بڑے شدومد کے ساتھ ادبی دنیا میں پھیلائی گئیں انھیں تین خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ترقی پسند ادب محض اشتراکیت (Communism) کا پراپگنڈہ ہے

۲۔ ترقی پسند ادب عریانی اور فحاشی کا دوسرا نام ہے۔

۳۔ ترقی پسند ادیب ادب کی خدمت نہیں کر رہے ہیں بلکہ زبان وادب میں ناموافق عناصر کو شامل کر کے ان کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ان الزامات میں ایک حد تک تو سچائی ہے لیکن زیادہ تر انھیں بہتان تراشی ہی کہا جا سکتا ہے ترقی پسند تحریک کی پہلی صنف کے نقاّد اور دانشور ڈاکٹر عبدالعلیم نے ایسے سارے الزامات کے تسلی بخش جوابات اپنے مضامین میں تفصیل کے ساتھ دیئے ہیں۔ جنھیں اس طرح اختصار کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ''اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند ادیبوں میں بہت سے اشتراکی ہیں اشتراکیت سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ جو اشتراکی نہ ہو وہ ترقی پسند ہو ہی نہیں سکتا۔''

۲۔'' کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جن کی ادبی کاوشوں میں جنسی تعلقات کا ذکر حد سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن ترقی پسند ادب کا بنیادی موضوع جنسی مسائل نہیں، سیاسی، اور معاشی مسائل ہیں۔''

۳۔'' ترقی پسند ادیب زبان و ادب میں ناموافق عناصر شامل نہیں کر رہے بلکہ ادب کو موضوع، ہئیت اور اسلوب کے اعتبار سے تازہ کاری سے ہم کنار کر رہے ہیں۔''

دراصل ترقی پسند تحریک اپنے آغاز (۳۶۔۱۹۳۵ء) سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے شانہ بہ شانہ چل رہی تھی۔ یہ وقت کا تقاضا تھا۔ اس لئے بعض ترقی پسندوں نے ہنگامی ادب کی بھی تخلیق کی جس میں نعرہ بازی بھی راہ پا گئی تھی۔ بعض ترقی پسند ادیب انگریزوں اور ان کے بہی خواہ سرمایہ داروں کے جبر واستحصال کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے چنانچہ ان کی تخلیقات میں ادبیت کم اور نعرہ بازی کی مخالفت کرتے ہوئے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ:

''شاعر کے پاس کہنے کے لئے کچھ چاہئے لیکن کہنے کے لئے کچھ ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ کہنے کا سلیقہ بھی ضروری ہے، استحصال اور جبر کی قوتوں کو پہچاننا بھی ضروری ہے۔ لیکن شاعری کو نعرے بازی سے بچانا بھی فن کار کا کام ہے۔''

اور اگر دیکھا جائے تو یہی مارکسی جمالیات اور ترقی پسند نظریہ ادب کا خلاصہ ہے۔ مارکس کی مشہور کتاب ''سرمایہ''(Das capital) کی اشاعت کے بعد مارکس کے دیگر مضامین، ان کی ڈائری اور بیٹی کے نام ان کے خطوط کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مارکس نے جمالیاتی سرگرمیوں کو بھی معاشی سرگرمیوں ہی کی طرح اہم قرار دیا ہے کیونکہ مارکس کے نزدیک ادب وفن، انسان کی بنیادی ضرورتیں ہی نہیں اس کے انسان ہونے کے ثبوت بھی ہیں۔ اسی بنا پر ٹیری ایگلٹن نے مارکس کو دنیا کے عظیم تین ماہرین جمالیات میں شمار کیا ہے۔ ادب اور فن کے حوالے سے مارکس نے ہیئت اور مواد کے جدلیاتی رشتے اور سماجی حقیقت نگاری کے لچکدار کردار کی وضاحت کرتے ہوئے فن پارے میں فنی و جمالیاتی محاسن کے آزادانہ التزام پر اصرار کیا ہے تا کہ حسّی تلذذ اور لطف وانبساط جیسے لوازمات کے ساتھ فن پارہ قاری پر اثر انداز ہو

سبق اردو نومبر 2025
89

سکے۔ دراصل ادب وفن بھی مارکس کی تحریروں کے مرکزی نقطے ہیں لیکن عام طور پر مارکس کو ان مخالفین نے عموماً ایک ماہر اقتصادیات کے طور پر ہی پیش کیا ہے۔ دراصل سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش۔ ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر وغیرہ متعدد ہندوستانی طلبا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن میں مقیم تھے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا زمانہ تھا۔ ہندوستانی طلبا اپنے ملک کی غلامی اور اپنے ہم وطنوں پر برطانوی حکمرانوں اور ان کے حاشیہ بردار دیسی زمینداروں، جاگیرداروں کے مظالم اور استحصال سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اپنے ہم وطنوں میں ظلم اور جبر کے خلاف بیداری پیدا کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے شعر وادب کو ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے بھی سودیت روس اور فرانس وغیرہ ممالک کے علاوہ کئی دیگر نو آزاد ممالک میں ادب وفن کو ہی عوامی بیداری کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں مقیم ہندوستانی طالب علم نوجوانوں نے جن میں سجاد ظہیر پیش پیش تھے۔ ایک ادبی تنظیم قائم کی جس کا نام انجمن ترقی پسند مصنفین رکھا گیا اور جب اس انجمن کا باضابطہ منشور تیار کیا گیا اور اسکے اغراض ومقاصد طے ہوئے تو گویا ترقی پسند تحریک کے خطہ وخال طے ہو گئے۔ اس منشور کی نقلیں تیار کروا کر اُن ہندوستانی تعلم یافتہ نوجوانوں کو بھجوائی گئیں جو نوجواں تعلیم مکمل کر کے ہندوستان واپس لوٹ چکے تھے ڈاکٹر محمد اشرف، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں لکچر رہو گئے تھے محمود الظفر امرت سر میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں وائس پرنسپل تھے ان کے ساتھ ان کی اہلیہ ڈاکٹر رشید جہاں بھی تھیں جو بعد میں ایک افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہوئیں اسی طرح حیدر آباد دکن میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ بمبئی میں ہتھی سنگھ تھے۔ اس منشور کو تمام لوگوں نے پڑھا اور پھر باہمی صلاح ومشورہ سے ان میں ترمیم واضافہ بھی کیا گیا اور پھر ۱۹۳۶ء میں لکھنئو میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس اُردو کے ممتاز افسانہ و ناول نگار پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں اُردو ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ ہندی، بنگلہ، گجراتی، مراٹھی، تیلگو، ملیالم، کنٹر اور انگریزی صحافیوں اور سیاسی وسماجی رہنماوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ لکھنئو کانفرنس کی شاندار کامیابی کے ساتھ ہی ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک (Progessive Literary Movement) کا آغاز ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کا پورا ادبی سماج ترقی پسند ادبی تحریک کے دائرے میں آ گیا۔

راجندر سنگھ بیدی اپنے بیشتر افسانوں کے موضوعات کو ماحول اور معاشرے کے رسم و رواج اور وہاں کے طور طریقوں کی مناسبت سے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا افسانہ 'من کی من میں' بھی گاؤں کے ایک سیدھے بھولے اور سچے انسان کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس افسانے میں کہانی کا مرکزی کردار 'مادھو' گاؤں کا ایک سیدھا سادہ اور معمولی انسان ہے جو بچپن ہی سے ایک عجیب ذہنی ناآسودگی ٹھکرائے جانے کے احساس کے ساتھ زندگی بسر کیے جارہا ہے۔ اس کی معصوم اور سادہ ذہنیت کا یہ عالم ہے کہ گاؤں والوں کے کہنے کے مطابق وہ خود بھی یہی سوچا کرتا ہے کہ بچپن میں اسے اس کا باپ مچھلی کے شکار سے پکڑ لایا تھا۔ وہ نہ تو تعلیم یافتہ ہے اور نہ ہی دنیاوی مکروفریب سے واقف ہے۔ وہ تو سچائی، ایمان داری اور سیدھے ڈھنگ سے زندگی گزارنے کا عادی ہے۔ اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی ایک مثال بنا ہوا ہے۔ مگر دیکھنے والے اسے نہ تو کوئی اہمیت دیتے ہیں اور نہ ہی اس کے کاموں کو قابل تحسین سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اس کی بیوی 'کلکارنی' اس کے بعض کاموں سے ناخوش رہتی ہے۔ اس کی انسان دوستی، محبت، ایثار اور شرافت کا اظہار اس بات سے بھی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قریب کے گاؤں گلاب گڑھ میں ایک بیوہ 'انبوہ' کی مدد کرنا شروع کرتا ہے۔ مادھو ایک بار اپنی بیوی سے بیس روپے لے کر کسی تہوار پر انبوہ کو دے آتا ہے۔ تا کہ وہ ساہوکار کا قرضہ ادا کر سکے۔ مگر گاؤں کے بہت سارے لوگ مادھو کی اس مدد کا غلط مطلب نکالنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی بھی بدظن ہو جاتی ہے اور رات کو واپسی پر بیوی کے دروازہ نہ کھولنے کی وجہ سے مادھو سخت سردی کی وجہ سے بیمار پڑ جاتا ہے، اور آخر کا مر جاتا ہے۔ مگر تمام گاؤں والوں کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اس کی معمولی خاموش طبیعت میں ایثار کا ایک زبردست جذبہ چھپا ہوا تھا جو پر خلوص تھا۔ بے لوث تھا اور قابلِ احترام بھی۔ وہ اکثر اپنی زبان سے اپنے دلی جذبات کا اظہار بھی کرتا تھا اور ہر بات من کی من میں رہ جاتی تھی۔

راجندر سنگھ بیدی کے اس افسانے میں گاؤں کی زندگی کی ایک ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جہاں طبقاتی کش مکش، کسانوں اور غریب دیہاتیوں پر ظلم وستم کی داستانیں ظاہر کرنے کے بجائے اس زندگی میں پائیے جانے والے بعض کرداروں کی سادگی اور بھولے پن کو پیش کیا گیا ہے۔ کیوں کہ کبھی کبھی انسان کی معصوم، سادہ اور بے کیف شخصیت کے اندر بھی کوئی نہ کوئی ایسا پہلو چھپا ہوتا ہے جو ہر ایک کو متاثر کر جاتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے ہاں دیہات نگاری کی نموان کے فن کے افزائش کے اولیں مرحلے پر ہوئی۔ بیدی کے فن نے 'بھولا' سے لے کر 'ایک باپ بکاؤ ہے' تک متعدد ارتقائی مرحلے طے کیے ہیں اور ان میں عمودی ارتقا اور افقی پھیلاؤ کے واضح نقوش نظر آتے ہیں۔ موضوعاتی طور پر اس تمام عرصے میں بیدی نے دیہات سے قصبہ کی طرف اور پھر قصبے سے بڑے شہر کی طرف سفر کیا ہے۔ تاہم 'سارگام کے بھوکے' جوان کے آخری جاری دور کے افسانوں میں شمار ہوتا ہے پڑھیں تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ دیہات کے موضوعات نے اسے متعدد مرتبہ صدا دی۔ اور بیدی نے اس صدا پر ایک سچے فن کار کی طرح لبیک کہا۔ بیدی دیہات کا ایک زیرک اور ہوش مند ناظر ہے۔ وہ بالعموم دیہات اور اس کی معاشرتی زندگی کے دو متضاد لہروں کو گرفت میں لینے کی کاوش کرتا ہے۔ ان لہروں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ آپس میں ملتی ہیں تو مدغم نہیں ہوتیں بلکہ شعلہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ شعلہ بعض اوقات پھل جھڑی کی طرح آنکھوں کو تازگی کی طراوت عطا کرتا ہے اور کبھی جلتے ہوئے تنور کی مانند ہر چیز کو بھسم کر ڈالتا ہے۔ اول الذکر کی مثال بیدی کا افسانہ 'بھولا' ہے۔ جس میں بیدی نے ایک معصوم دیہاتی بچے کی کہانی بیان کی ہے اور ایک بے حد معمولی بات کو غیر معمولی بنا دیا ہے۔ اجمال اس کا یوں ہے۔

بھولا کو اس کا دادا بتاتا ہے کہ دن کے وقت کہانی سننے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں لیکن بھولا کے اصرار پر اس کا دادا کہانی سنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اتفاق سے اسی روز بھولا کا ماموں راکھی بندھن کے لیے گاؤں آنے والا ہے۔ بھولا کو اب یہ خدشہ لاحق ہو گیا ہے کہ ماموں راستہ بھول جائیں گے تو کیا ہوگا؟ وہ کسی کو بتائے بغیر لالٹین ہاتھ میں لے کر ماموں کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ اس کے گھر والے سمجھتے ہیں کہ بھولا کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ مگر کچھ دیر کے بعد بھولا ماموں کے ساتھ واپس آجاتا ہے۔ ماموں انکشاف کرتا ہے کہ وہ واقعی راستی بھول گیا تھا اور بھولا اسے ڈھونڈ لایا ہے تو اس کہانی کو ایک نئی جہت مل جاتی ہے۔ کہانی سنانا ایک معمول کی بات ہے۔ دن کے وقت کہانی سنانے کے ساتھ جو مفروضہ وابستہ ہے۔ اس نے بھولا کی گم شدگی کو حقیقی شعلے میں تبدیل کر دیا ہے۔ لیکن یہ شعلہ بھسم نہیں کرتا بلکہ جب بھولا اپنے ماموں کے ساتھ واپس آجاتا ہے تو پھل جھڑی کی طرح ہر طرف مسرتیں بکھیر دیتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے دیہاتی افسانوں میں دیہات کا فرد معصومیت کے غلاف میں لپٹا ہوا ہے۔ اس کے یہاں مسرت ناممکن الحصول نہیں، تاہم مایوسی بھی اس

INTERNATIONAL PEER REVIEWED (REFEREED) JOURNAL
ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

سبق اردو نومبر 2025
90

پر اتنی ہی جلدی حملہ زن ہوتی ہے۔اس کی بہترین مثال بیدی کا افسانہ 'من کی من میں' ہے۔اس افسانے میں دیہاتی معاشرے کے روشن اور تاریک پہلو جڑواں نظر آتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے دیہات کو صرف کسان کا معاشرہ بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ اس نے بیشتر اس معاشرے کے ایسے نچلے متوسط طبقے کے کرداروں کو موضوع بنایا ہے جن پر ہر دوسرے افسانہ نگاروں نے نسبتاً کم توجہ دی ہے۔'من کی من میں' کا مادھو اور کلکارنی'، سارگام کے بھوکے' کی وینا اور گووند اس کی نمائندہ مثالیں ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کے دیہاتی افسانوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔تاہم دیہات اس کے تجربے کا ایک اہم ترین جز نظر آتا ہے۔اس کے افسانوں میں جو خلوص سادگی ہے۔وہ دیہاتی معاشرے کی عطا نظر آتی ہے۔وہ انسانی مسائل کو سادہ لوح دیہاتی کی نظر سے دیکھتا ہے اور حقیقت کی تندی میں بہہ جانے کے بجائے حقیقت کو ہموار انداز میں یوں پیش کرتا ہے کہ بیدی کا آدرش بڑی ملائمت سے افسانے سے قاری کو منتقل ہو جاتا ہے۔

''اس خیال سے کہ پٹواری خانقاہ والے کنویں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گاؤں کا رخ نہ کر لے، میں جلدی جلدی مگر اپنے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا۔گو مایا نے جوتی کو سرسوں کا تیل لگا دیا تھا، تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی تھی۔''

(بھولا، ص46، کلیات)

''پھر موقع آیا کہ برسوں کے روٹھے ہوئے منائے جائیں۔امبو سے تو گاؤں کا ہر ایک بچہ بوڑھا روٹھ گیا تھا۔وہ کس کس کو مناتی۔ایک رُلیا اور مادھو کے روٹھ جانے سے کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے روٹھ گیا تھا۔ہائے! رُلیا اور مادھو ایسے روٹھنے والے کوئی ماننے کے لئے تھوڑے ہی روٹھے تھے!''۔(من کی من کی، ص69، کلیات)

''لوگ چاہتے تھے کہ کرودھی ماتا کو ہریا کے تالاب کے پاس مہاتما جی کی کٹیا کے قریب ان ہی کی نگہبانی میں چھوڑ دیا جائے تاکہ ماتا اس گاؤں سے کسی دوسرے گاؤں کا رخ کرے۔وہ ماتا کو خوشی خوشی روانہ کرنا چاہتے تھے تاکہ ان پر الٹی نہ برس پڑے۔سکھی بھی جلوس کے ساتھ۔بابو بھی شامل ہوا۔نہ بابو کو سکھی کے بلانے کی جرأت پیدا ہوئی، نہ سکھی کو بابو کے بلانے کی۔ہاں کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے''۔(ٹلا دان، ص136، کلیات)

''۔۔۔اور پھر عورتیں چھمن کی تعریف کرنے لگیں۔۔۔''بہت بہادر آدمی ہے چھمن۔راٹھور ہے نا، دوسری بولی۔چھمن کا بیاہ ہوگا۔میں اس کی گھوڑی گاؤں گی۔گھوڑی کی باگ تھاموں گی۔جوڑا گاؤں میں اس کی ماں کے میکے ہیں۔میری ماں کے میکے بھی جوڑا گاؤں میں تھے۔میں چھمن کی بہن ہوئی نا۔اور ایک کہنے لگی۔''مجھے تو بھاوج کا رشتہ ہی پسند ہے۔میں اس کی آنکھوں میں سلائی ڈالوں گی۔میری گاگر بھری تو کیا احسان کیا؟ دیور، بھابیوں کے سینکڑوں کام کرتے ہیں۔گوری بہو! چڑھے پوہ کوئی ساہا نکلے۔گلابی سی سردی ہو۔بڑا مزا رہے گا۔اس سال نہ بھی ہو تو جلدی کا ہے کہ ہے۔چھمن بھائی کوئی بوڑھا تھوڑے ہی ہو گیا ہے۔۔۔''

(چھمن، ص159-158، کلیاتِ بیدی)

اردو مختصر افسانہ کی تاریخ میں راجندر سنگھ بیدی کا شمار صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی نے کم وبیش ایک ساتھ لکھنا شروع کیا اور اپنے اپنے مزاج، اور انداز بیان کی وجہ سے اردو افسانہ میں الگ الگ روایتیں قائم کیں۔دیکھا جائے تو یہی وہ قلم کار ہیں جنھوں نے اردو افسانہ کی کلاسیکی روایات کا احترام کرتے ہوئے اردو افسانہ کو فنی وتکنیکی ہر اعتبار سے نئی جہات سے روشناس کروایا۔کرشن چندر اپنی رومانیت اور شاعرانہ اسلوب کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں بس گئے سعادت حسن منٹو نے جنسی اور نفسیاتی مسائل کو گرفت میں لے کر لازوال افسانے لکھے، عصمت چغتائی نے مسلم معاشرہ میں عورتوں کے مسائل پر افسانے لکھ کر شہرت حاصل کی لیکن راجندر سنگھ بیدی نے ان سب سے الگ ہندوستان کے عام لوگوں کے روزمرہ کے حقائق اور مسائل کا مشاہدہ کر کے انھیں تخیل اور تصور کی آمیزش کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کرنے کا طریقہ کار اپنایا۔اسی لئے بیدی کا فن انکے معاصرین سے الگ مزاج اور منہاج کا حامل ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانوی مجموعہ ''گرہن'' کے پیش لفظ میں خود ہی لکھا ہے کہ:

''جب کوئی واقعہ، مشاہدے میں آتا ہے تو میں اسے من وعن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اس کو حیطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ آزادی سے بہت پہلے ۱۹۳۹ء۔میں ''دانہ ودام'' کے نام سے' مکتبہ اردو لاہور کی جانب سے شائع ہوا۔اس مجموعہ کے بعد میں کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔''دانہ ودام' میں جو افسانے شامل ہیں وہ اس طرح ہیں۔

۱۔بھولا۔۲۔ہمدوش۔۳۔من کی من میں۔۴۔گرم کوٹ۔۵۔چھوکری کی لوٹ۔۶۔پان شاپ۔۷۔منگل اشٹکا۔

۸۔کوارنٹین۔۹۔ٹلادان۔۱۰۔دس منٹ بارش میں۔۱۱۔وٹامن بی۔۱۲۔چھمن۔۱۳۔ردِعمل۔۱۴۔موت کا راز۔

مذکورہ بالا افسانوں میں کئی ایسے ہیں جن پر بحیثیت افسانہ نگار بیدی کی شہرت اور معنویت قائم ہے۔راجندر سنگھ بیدی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''گرہن'' بھی آزادی سے پہلے ہی ۱۹۴۲ء میں مکتبہ اردو لاہور سے ہی شائع ہوا۔اس کے بعد بھی راجند سنگھ بیدی کے افسانے شائع ہوتے رہے۔راجندر سنگھ بیدی کا افسانوی مجموعہ گرچہ ۱۹۴۹ء۔میں شائع ہوا لیکن اس کے اکثر افسانے آزادی سے پہلے کے ہی لکھے ہوئے ہیں۔لیکن آزادی سے پہلے ریڈیو کی ملازمت کی وجہ سے انھوں نے متعدد ڈرامے بھی لکھے۔راجندر سنگھ بیدی کے ڈراموں کا ایک مجموعہ ''سات کھیل'' کے نام سے ۱۹۴۶ء۔میں ادبی سنگم، لاہور سے شائع ہوا۔بیدی کے افسانوی مجموعوں کی طرح انکے ڈراموں کے مجموعے کے بھی کئی کئی ایڈیشن آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اب تک شائع ہو

سبق اردو نومبر 2025

91

رہے ہیں ۔آزادی کے بعد بیدی نے جوافسانے لکھے ان کا جائزہ میرے مقالے کے اگلے باب میں پیش کیا جائے گا لیکن اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کرشن چندراور منٹو کی طرح بیدی نے بھی اپنے زیادہ تر شاہکار افسانے آزادی سے قبل ہی لکھ چکے تھے۔

آج ۱۹، ۲۰۱۸ تک آکر بھی یہ مانا جاتا ہے کہ اردو میں افسانے کا معیار اوروقار کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی کے افسانوں پر ہی قائم ہے۔انھیں کی قائم کی ہوئی روایتیں ہیں جن پر آج دنیا کی تمام اردو بستیوں کے افسانہ نگار چل رہے ہیں ۔جہاں تک بیدی کی افسانوی روایت، انفرادیت اور ادبی اہمیت کا سوال ہے اس کے بارے میں کم وبیش اردو کے تمام نقادوں نے الگ الگ زاویوں سے بہت کچھ لکھا ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے کے افسانوں ''بھولا ، گرم کوٹ ، 'پان شاپ' اور 'دس منٹ بارش میں' جیسے افسانوں کی بدولت ہی ، بیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دانہ ودام'' (۱۹۳۹ء) شائع ہوتے ہی ارباب فکر ونظر کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ پروفیسر محمد مجیب ، آل احمد سروراور ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے اسے بے حد سراہا۔ پنجاب سرکار نے اس مجموعے کو خصوصی انعام کے لیے منتخب کیا۔اُردو فکشن کی دنیا میں ان کے ممتاز مقام، مرتبے اور فلموں کے تعلق سے ان کے گراں قدر تعاون کے اعتراف کے طور پر انہیں مختلف اعزازت سے نوازا گیا۔ان کے چھ افسانوی مجموعے شائع ہوئے ان افسانوں کی تعداد سو کے قریب ہے ۔اس کیے علاوہ ان کے کچھ اور افسانے بھی ہیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں کئے گئے ۔مثلاً مہارانی کا تحفہ، خودغرض، جہلم اور تارو، ناگفتہ، نورا، وغیرہ۔

آزادی سے قبل ہی راجندر سنگھ بیدیؔ اُردو کے افسانوی ادب میں جس اہم اور ممتاز مقام کے حامل ہیں اس کی وجوہات پر گفتگو کرنے سے قبل بہتر ہوگا کہ ہم اس نکتے کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے کہ کرشن چندر، منٹو اور بیدیؔ کے مثلث میں بیدیؔ نے سب سے کم افسانے لکھے یعنی تقریباً ستر اسّی افسانے ،لیکن افسانے کے فن اور تکنیک کے لحاظ سے ان کا کوئی بھی افسانہ کمزور نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ان کے پاس نہ تو منٹو کی طرح بات کہنے کا دوٹوک انداز ہے اور نہ ہی کرشن چندر جیسی شاعرانہ وخلاقانہ نثر ، پھر بھی ان کے ابتدائی افسانے بھی نہ صرف یہ کہ چونکا دینے والے ثابت ہوئے بلکہ بہت جلد انہیں افسانوی ادب کے شہ پاروں میں شامل کیا جانے لگا۔ جب کہ بیدی کے مقابلے میں کرشن چندراور منٹو کے یہاں ایسے متعدد افسانے ہیں جو فنی و تکنیکی اعتبار سے خود کرشن چندر اور منٹو کے بہترین افسانوں کے مقابلے میں کم تر درجے کے ہیں۔

اپنے معاصرین میں راجند سنگھ بیدیؔ کی انفرادیت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ انہوں نے چھوٹی چھوٹی اور نازک سے نازک بات پر گہری نظر رکھی ہے ۔دوسرے لفظوں میں وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ کسی بھی چیز کا جتنا حصہ بظاہر ہمیں نظر آتا ہے سچ صرف اتنا ہی نہیں ہوا کرتا اس لیے اپنے افسانوں میں زندگی کی ظاہری حقیقتوں کے ساتھ ساتھ اس کی تہہ درتہہ حقیقتوں کو بھی بیدی بہت غور وفکر کے بعد پیش کرتے رہے ہیں۔
بیدیؔ نے جو کچھ لکھا بہت سوچ سوچ کر لکھا۔ منٹو نے انھیں ایک مرتبہ ٹوکا بھی تھا:
''تم سوچتے بہت ہو، لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، بیچ میں سوچتے ہو، اور بعد میں سوچتے ہو'
چنانچہ فن پر توجہ شروع ہی سے بیدیؔ کے مزاج کی خصوصیت بن گئی، سوچ سوچ کر لکھنے کی عادت نے انھیں براہِ راست اندز بیان سے ہٹا کر زبان کے تخیلی استعمال کی طرف راغب کیا، ''گرہن'' کے پیش لفظ میں انھوں نے خود لکھا ہے:

''جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو میں اسے من وعن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے ۔اس کو احاطۂ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہوں''۔

(ایضاً، ص ۹۲)

آزادی سے قبل ، راجند سنگھ بیدی نے نے افسانوں میں رومانیت ، انقلابیت، جنس یا اسی نوع کے ہیجان انگیز تجربات سے ہٹ کر زندگی کے مانوس اور چھوٹے چھوٹے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔وہ کسی حقیقت کے فوری ردِ عمل کو بنیاد بنا کر خلا میں نہیں اڑنے لگتے بلکہ ان حقائق پر نظر جما کر اس کی گہرائیوں میں جاتے ہیں اور تحلیل و تجزیہ کے بعد ایک مکمل فن پارے کی تخلیق کرتے ہیں۔اسی لیے ان کا ہر افسانہ اپنی جگہ پر ایک نقش کامل ہوتا ہے۔جس کی تخلیق میں فنکار نے ضبط واعتدال سے کام لیا ہے۔

ردِ عمل اور ''چھوکری کی لوٹ'' جیسے آزادی سے قبل کے افسانوں کو سامنے رکھیں تو اندازہ ہوگا کہ راجند سنگھ بیدیؔ نسانی نفسیات کی تہہ میں کارفرما سماجی وتہذیبی عوامل پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔ وہ معاشرے کا مشاہدہ اس کی اجتماعیت میں نہ کر کے فرد کو ایک اکائی کے طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔اور انسانوں کے باہمی رشتوں ، وابستگیوں ، رفاقتوں اور علیحدگیوں کی سچی نیز حقیقی تصویریں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں ۔ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کا قاری نفساتی تجزیئے کے عمل سے گزرے اسی لیے وہ اپنے کرداروں کو منطقی بنیادوں کے برعکس حسیاتی وجذباتی سطح پر زیادہ فعال بناتے ہیں ۔اس کی مثال ان کے افسانے ''تلادان'' کا مرکزی کردار ''بابو'' ہے جو ایک دھوبی کے گھر پیدا ہونے کی وجہ سے سماجی تفریق کا شکار ہے سماجی انصاف، مساوات اور عزت نفس کی جستجو اس کی فطرت کا اہم حصہ ہے۔
اس کی عمدہ مثال ان کا اابتدائی دنوں کا افسانہ ''بھولا'' ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ جس فنی ریاضت سے انہوں نے یہ افسانہ لکھا ہے اور ایک بچے کی نفسیات نیز اس کے گردوپیش کے حالات وواقعات کی عکاسی میں حقیقت نگاری وجزئیات نگاری کا جس طرح حق ادا کیا ہے ۔ وہ اس افسانے کو اُردو کا اہم افسانہ بنا دیتاہ۔ بیدیؔ چیخوف سے بہت متاثر ہیں ۔اسی لیے آزادی سے قبل کے افسانوں میں راجند سنگھ بیدیؔ کے یہاں کہانی کہنے کی شعوری کوشش کہیں دکھائی نہیں دیتی ۔ وہ جیتی جاگتی زندگی کی باتیں کرتے ہیں اور زندگی کے کسی ایک پہلو ایک سچائی کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری، اس پہلوا س سچائی کو اپنے وجود کا حصہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ان کی کہانیاں ایک تاثر چھوڑتی ہیں جس سے ہماری بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور ہمارے تفکر کو مناسب سمت اور روشنی ملتی ہے

راجند سنگھ بیدیؔ کا مشاہدہ بہت تیز ہے انھوں نے زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں فلسفیانہ فکر اور نفسیاتی باریکیوں کے باوجود شروع سے آخر تک ایک دلچسپی بنی رہتی ہے صرف حقیقت نگاری سے ہی انہیں رغبت نہیں وہ ادب میں افادیت اور مقصدیت کے بھی اس حد تک قائل ہیں جس حد تک کہانی کار دوسروں کو ناصح محسوس نہ ہو بلکہ ایک نامحسوس طریقے سے اس کی کہانی لوگوں پر اثر نداز ہوں۔

غرض یہ کہ راجندر سنگھ بیدی نے آزادی سے قبل جو افسانے لکھے اور جوان کے افسانوی مجموعوں ''دانہ ودام'' (۱۹۳۹ء)۔اور ''گرہن'' (۱۹۴۲ء۔) میں شامل ہیں ،ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نے آزادی سے قبل پنجاب میں اردو افسانہ نگاری کی جو شاندار روایت قائم کی ، وہ روایت پوری اردو دنیائے افسانہ کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی اور آج اکیسویں صدی میں بھی اردو افسانہ نگاروں کی رہنمائی کر رہی ہے۔

☆☆

سبق اردو نومبر 2025

92

چکبستؔ کی نظموں وغزلوں کا انتخاب: ’روح چکبستؔ‘

(تنقیدی جائزہ)

مریم صبا

Mariyam Saba
Research Scholar
Department of Urdu
Banaras Hindu University
Mob: 8005090403
E.mail:mariyampdm13518@gmail.com

پندرہویں صدی میں کشمیری پنڈتوں نے بڑی تعداد میں ہجرت کی اور پنجاب، دہلی، اتر پردیش، بہار اور کلکتہ وغیرہ ملک کے مختلف صوبوں میں سکونت اختیار کی۔ جو خاندان کشمیر چھوڑ کر آئے چکبستؔ کے آبا واجداد بھی انہیں میں سے تھے۔ ان کے اجداد شجاع الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آ کر مقیم ہوئے۔ چکبستؔ کی پیدائش 19 جنوری 1882 میں فیض آباد میں ان کے ماموں کے گھر (محلہ راٹھ حویلی) ہوئی۔ چکبستؔ پانچ برس کے ہی تھے کہ ان کے والد اودت نارائن چکبستؔ کا انتقال ہو گیا۔

چکبستؔ کا پورا نام پنڈت برج نرائن چکبستؔ تھا۔ اردو ادب کا عام قاری یا طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ ان کا اصل نام ’برج نارائن‘ اور تخلص ’چکبستؔ‘ ہے۔ مگر ’چکبستؔ‘ ان کا تخلص نہیں بلکہ عرفیت ہے۔ اس بابت رضوان احمد لکھتے ہیں:

> ’’چکبستؔ ان کی عرفیت تھی۔ اسے ان کا تخلص نہ سمجھنا چاہیے۔ شاعر وہ ضرور تھے مگر تخلص کے گنہگار نہ تھے۔ اسی عرف عام کو لوگوں نے تخلص سمجھ رکھا ہے۔‘‘1

والد کے جلد انتقال کے سبب چکبستؔ کی ابتدائی تعلیم تاخیر سے شروع ہوئی۔ ابتدا میں اردو اور فارسی تعلیم کے لیے مولوی صاحب گھر پر رکھے گئے۔ 1895 میں ان کا داخلہ کاظمین مڈل اسکول میں کرایا گیا جہاں سے انہوں نے 1897 میں مڈل پاس کیا۔ 1902 میں گورنمنٹ جبلی ہائی اسکول سے ایف۔ اے۔ اور 1905 میں کنگ کالج سے بی۔ اے۔ پاس کیا۔ چوں کہ قانون کی تعلیم کا انتظام اس کالج میں نہیں تھا اس لیے الہٰ آباد یونیورسٹی میں ایل۔ ایل۔ بی۔ میں داخلہ لے کر 1907 میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ لکھنؤ آ کر سید شہنشاہ حسین ایڈوکیٹ سے وکالت کا کام سیکھ کر ضلع میں پریکٹس شروع کی اور بہت جلد اپنے پیشہ میں کامیاب ہو گئے۔

چکبستؔ کو ادبی محفلوں سے بہت انسیت تھی۔ کم عمری میں ہی وہ شعر کہنے لگے تھے۔ چکبستؔ کی زندگی میں ان کی نظموں کا مجموعہ ’صبح وطن‘ منظر عام پر آ چکا تھا۔ مختلف موضوعات پر مبنی ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک رسالہ ’ستارۂ صبح‘ بھی جاری کیا۔ چکبستؔ کی وفات کے بعد کالی داس گپتا رضا کی مرتب کردہ چار کتابیں ’کلیات چکبستؔ‘، ’مقالات چکبستؔ‘، ’چکبستؔ اور باقیات چکبستؔ‘ اور ’سہو دسراغ‘ منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے کلام کے انتخاب یا مرتب کردہ کتابیں یا ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ان کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب ’روح چکبستؔ‘ ہے۔

’روح چکبستؔ‘ چکبستؔ کی سیاسی نظموں اور غزلوں کا انتخاب ہے۔ اس کو الہٰ آباد یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر رضوان احمد نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ’رام نرائن لال ارن کمار‘ پبلشر سے پہلی بار 1988 میں شائع ہوئی۔ اس وقت اس کی قیمت 8 روپئے تھی۔ یہ کتاب ’تاج آفسیٹ پریس الہٰ آباد‘ سے طبع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت میں 1100 جلدیں تیار کی گئی تھیں۔ 1988 کے بعد اس کی دوسری اشاعت کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔

114 صفحات پر مشتمل اس انتخاب کے سرورق پر کتاب کا نام یعنی ’روح چکبستؔ‘ درج ہے اور اس کے بعد کے صفحے پر چکبستؔ کی ایک تصویر ہے۔ تصویر کے نیچے چکبستؔ کا ایک شعر لکھا ہوا ہے، جو درج ذیل ہے:

دل کیے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
جب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے 2

انتخاب کی ابتدا میں فہرست درج ہے۔ اس میں پیش لفظ، معروضات اور دیباچہ کے علاوہ چکبستؔ کی 24 نظموں کے عنوانات اور گیارہ غزلوں کے مصرعۂ اول مع سن تخلیق درج ہیں۔ بقول مرتب ان نظموں اور غزلوں کی ترتیب میں سن تخلیق کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ جس سے چکبستؔ کے شعری شعور کی پختگی کے تدریجی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کا پیش لفظ الہٰ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر سید رفیق حسین نے لکھا ہے۔ یہ تحریر تین صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انتخاب کے اصول وضوابط اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پیش لفظ کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

> ’’روح چکبستؔ پنڈت برج نارائن چکبستؔ کی سیاسی نظموں اور غزلوں کا انتخاب ہے جسے رضوان احمد صاحب نے مرتب کیا ہے۔ مجھے انہوں نے اسے لفظ بہ لفظ سنایا اور اپنے انتخاب کے اصولوں سے بھی واقف کرایا۔ اس میں کچھ نئی باتیں ہیں جو چکبستؔ کے کسی مجموعہ یا انتخاب میں نہیں ہیں۔ چکبستؔ کا پہلا مجموعہ ’صبح وطن‘ بہت کمیاب ہے۔ ’کلیات چکبستؔ‘ جسے گپتا رضا صاحب نے مرتب کیا ہے بہت ضخیم اور ساٹھ روپئے قیمت کا ہے۔ قارئین کرام جس میں طلبا بھی شامل ہیں انہیں کسی بھی طرح حاصل کر لیں تو ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ انہیں پڑھیں۔۔۔۔ اس لیے اچھے شاعروں کے کلام کا مختصر انتخاب جو کم قیمت کا ہو بازار میں دستیاب ہو جائے، انتخاب ایسا مکمل ہونا چاہیے کہ شاعر کا ذہنی ارتقا سامنے آ جائے۔ چکبستؔ نے اپنی زندگی ہی میں یہ اہتمام کیا تھا کہ ہر نظم و غزل کے شروع میں سنِ تخلیق اور تحتی نوٹ بھی لکھ دیا تھا۔ اس انتخاب میں ان کی اس انوکھی اور نرالی ادا کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ قارئین کرام ان کے ذہنی ارتقا کا تاریخی اعتبار سے اندازہ لگا ہی سکتے ہیں اور ان کے علاوہ ناقدین فن بھی چکبستؔ کے کلام کو اچھی طرح

سبق اردو نومبر 2025

93

جانچ اور پرکھ سکتے ہیں۔''3؎

کتاب کی افادیت اور اصول وضوابط پر روشنی ڈالنے کے بعد ڈاکٹر سید رفیق حسین، چکبستؔ کے کلام میں موجود قوم پروری اور وطن دوستی، کے جذبے پر بحث کرتے ہیں اور اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے چکبستؔ کے دل میں ہندوستانی لیڈروں کا احترام، ہم وطنوں سے محبت، غلامی کی کسک، آزادی کی چاہ، ہوم رول کا ذکر اور ان کی حساس طبیعت کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

پیش لفظ کے بعد 'معروضات' کے عنوان سے مرتب رضوان احمد کا ایک صفحہ پر مشتمل ایک نوٹ ہے۔ اس میں انھوں نے انتخاب کے مرتب کرنے کے اصول اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ رضوان احمد کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''روح چکبستؔ کا انتخاب (Haphazard) اٹکل پچّو نہیں ہے۔ اس کی منتخب شدہ نظمیں تاریخی تناول کے اعتبار سے ہیں، گویا سائنٹفک ہیں۔ چکبستؔ کا سیاسی شعور جیسے جیسے پختہ اور ترقی کرتا گیا ویسے ویسے انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کا گہری نظر سے سلسلہ وار مطالعہ کرنے کی ضرورت تھی جو خلط ملط انتخاب سے پوری نہیں ہوتی۔ سیاسی نظمیں مسز اینی بسنٹ کی رہائی تک ہیں جس سے انتخاب کی اہمیت دو بالا ہو گئی ہے۔ نظموں کے بعد انتخاب میں چند غزلیں بطور نمونہ منتخب کر دی گئی ہیں۔''4؎

معروضات کے بعد مرتب کا لکھا ہوا دیباچہ ہے جو 17 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تحریر میں چکبستؔ کی زندگی کے حالات، ان کی تعلیم و تربیت، شعر و شاعری سے ان کی وابستگی، وطنیت کا جذبہ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رضوان احمد رقمطراز ہیں:

''شروع ہی سے ان میں وطنیت کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا۔ ابھی وہ بی۔اے۔ کے طالب علم ہی تھے کہ 1904 میں انھوں نے شہنشاہ انگلستان کے نائب اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کرزن کا ایک ہجویہ قصیدہ موسوم بہ 'لارڈ کرزن سے ایک جھپٹ' بطور طنزیہ ظرافت نظم کیا جو بہت وقیع اور مکمل ہے۔''5؎

پیش لفظ میں مرتب نے اس انتخاب میں شامل چند نظموں کی وضاحت بھی کی ہے۔ ان میں 'لارڈ کرزن سے جھپٹ'، 'خاک ہند'، 'قومی مسدس'، 'فریاد قوم'، 'قوم کے سورماؤں کی الوداع'، 'ہم ہوں گے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا'، 'آوازۂ قوم'، 'مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیغام وفا'، 'رامائن کا ایک سین' کے علاوہ 'صبح وطن' کی چند غزلوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان نظموں و غزلوں کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے چکبستؔ کے شعری شعور کی پختگی کے تدریجی ارتقا اور اس وقت کی ہندوستانی سیاست کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ چکبستؔ کی غزلوں کے متعلق مرتب رضوان احمد رقمطراز ہیں:

''حالانکہ وہ (چکبستؔ) بہت عدیم الفرصت وکیل تھے۔ یوں تو ان کی اڑتالیسوں غزلیں اچھی ہیں مگر ان میں زیادہ اچھی گیارہ غزلیں اس انتخاب میں شامل ہیں۔ ان میں ان کا محبوب کوئی انسان (مرد یا عورت) نہیں ہے۔ گویا ان کا عشق ہندوستان سے ہے۔ یہی وطن پرستی اور قوم پروری ان کی غزلوں کا خاص موضوع ہے۔۔۔۔غزلیں خس و خاشاک سے پاک صاف ہیں۔ بناوٹ اور صنعت کاری جو لکھنوی شاعری کا جزو اعظم تھا ان کا نام و نشان بھی ان کی غزلوں میں نہیں ملتا۔''6؎

انتخاب 'روح چکبستؔ' میں شامل نظموں اور غزلوں کی ترتیب درج ذیل ہے:

لارڈ کرزن سے جھپٹ (1904)، خاک ہند (1905)، قومی مسدس (1912)، دردِ دل (1912)، حالتِ قوم (1912)، نوجوانوں سے خطاب (1912)، نوجوانوں کی حالت (1898)، فریاد قوم (1914)، قوم کے سورماؤں کی الوداع (1914)، ہم ہوں گے ایش ہوگا اور ہوم رول ہوگا (1916)، آوازۂ قوم (1916)، ہمارا وطن دل سے پیارا وطن (1916)، وطن کا راگ (1917)، مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیغام وفا (1917)، مسز بسنٹ کی رہائی (1918)، نالۂ درد (1918)، نالۂ یاس (1918)، مرثیہ گوپال کرشن گوکھلے (1915)، مرثیہ گنگا دھر تلک (1920)، رامائن کا ایک سین (1906)، ماں کا جواب (1912)، بن باس ہونے پر اجودھیا نگری کی حالت (1925)، آصف الدولہ کا امام باڑہ (1917)، پھول مالا (1917)، گائے (1912)، برسات (1900)۔

درج بالا نظموں کی ترتیب کو غور سے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید رفیق حسین نے پیش لفظ میں اور مرتب رضوان احمد نے معروضات میں نظموں کے انتخاب کی بابت جس سائنٹفک طریقۂ کار اور تاریخی تناول کا ذکر کیا ہے، اس کو پوری طرح ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا ہے۔ نظم 'نوجوانوں کی حالت' 1898 میں لکھی گئی جبکہ انتخاب کی ترتیب میں اس کو نظم 'نوجوانوں سے خطاب' 1912 کے بعد جگہ دی گئی ہے۔ اسی طرح 'مرثیہ گوپال کرشن گوکھلے' 1915 میں لکھا گیا جبکہ اس کو 'نالۂ یاس' 1918 کے بعد شامل کیا گیا ہے۔ یہی حال انتخاب کی آخری سات نظموں کا ہے، جس میں زمانی ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

روح چکبستؔ میں شامل غزلوں کی سنِ تخلیق اور ان کے مطلع کے اشعار حسب ذیل ہیں:

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادہ ہستی اُتر جانا (11اشعار،1910ء)

درد دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا (10اشعار،1911ء)

کچھ ایسا پاسِ غیرت اٹھ گیا اس عہد پرفن میں
کہ زیور ہو گیا طوقِ غلامی اپنی گردن میں (19اشعار،1911ء)

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں (20اشعار،1912ء)

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میر (11اشعار،1912ء)

سبق اردو نومبر 2025
94

دل کیے تسخیر بخشا فیضِ روحانی مجھے
حبِ قومی ہو گیا نقشِ سلیمانی مجھے (9اشعار،1911ء)

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا (10اشعار،1915ء)

کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پہ بھی
پر اب عروج وہ علم و کمال فن میں نہیں (5اشعار،1917ء)

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے (6اشعار،1917ء)

فنا نہیں ہے محبت کے رنگ و بو کے لیے
بہارِ عالمِ فانی رہے رہے نہ رہے (7اشعار،1917ء)

انہیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرزِ جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے (6اشعار،1919ء)

انتخاب میں شامل نظموں کی طرح غزلوں کی ترتیب میں بھی زمانی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

چکبستؔ کے شعری مجموعۂ کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان کا تقریباً پورا شعری سرمایا حب وطن یا سیاسی نظموں اور غزلوں پر محیط ہے۔ چکبستؔ جب تک باحیات رہے ان کی شاعری میں ملک کے عصری معاشرتی اور سیاسی تاریخ کے تمام اتار چڑھاؤ نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس عہد کی سیاسی اتھل پتھل اور مسلسل ہونے والی تبدیلیوں کا اپنی شاعری میں اظہار کیا ہے۔ مظفر حنفی اپنے مضمون 'چکبستؔ کی قومی نظمیں' میں رقمطراز ہیں:

''چکبستؔ کی زندگی تک ہمارے ملک کے سیاسی واقعات اور جنگِ آزادی کی مکمل داستان ان کی شاعری کے پردۂ سیمیں پر پوری وضاحت کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔''7

ان کا شعری مجموعہ 'صبح وطن' پانچ حصوں کے علاوہ 'نظم ظریفانہ' میں منقسم ہے۔ پہلے دو حصوں کی نظمیں سوائے تین آخری نظموں کے، وطنیت کے جذبے سے معمور ہیں۔ ان نظموں میں قومی یکجہتی یا ملت کے جذبے کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجموعے کے تیسرے حصے میں احباب یا ملک کی نامور شخصیات کے مرثیے پر مبنی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ چوتھا حصہ غزلیات پر مبنی ہے اور پانچواں حصہ چکبستؔ کی ابتدائی کلام سے متعلق ہے۔ رضوان احمد نے 'روح چکبستؔ' کے لیے 'صبح وطن' کے تمام حصوں سے چند نظموں اور غزلوں کا انتخاب کر لیا ہے۔ اس انتخاب میں نہ سیاسی نظموں کے موضوع کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اور نہ ہی ان کی ترتیب مین سن تخلیق کو۔ مثال کے طور پر انتخاب میں شامل نظمیں 'خاک ہند'، ہمارا وطن دل سے پیارا وطن'، 'رامائن کا ایک سین'، 'ماں کا جواب'، 'بن باس ہونے پر اجودھیہ نگری کی حالت'، 'آصف الدولہ کا امام باڑہ (لکھنؤ)'، 'گائے' اور 'برسات'۔ ان نظموں کا تعلق کسی طرح سیاسی منظر نامے سے نہیں ہے۔ یہ نظمیں خالص حب وطن کے جذبے اور قدرت کے حسین مناظر کی عکاسی اور تاریخی یا مذہبی واقعات پر مبنی ہیں۔

انتخاب 'روح چکبستؔ' کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چکبستؔ کے ہر دور کی نظموں کو شامل کیا گیا ہے، جس سے چکبستؔ شعری شعور کے ارتقا اور پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جیسے ان کے مجموعے کے پہلے حصے سے نظم 'نالۂ درد'، 'مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیغام وفا'، 'وطن کا راگ' اور 'ہمارا وطن دل سے پیارا وطن وغیرہ۔ دوسرے حصے سے 'گائے'، 'پھول مالا'، 'آصف الدولہ کا امام باڑہ'، 'رامائن کا ایک سین' اور 'نالۂ یاس' وغیرہ۔ تیسرے حصے سے 'گوپال کرشن گوکھلے'، 'بال گنگا دھر تلک'۔ چوتھے حصے سے غزلیں اور پانچویں حصے سے نظم 'برسات' کا انتخاب کیا گیا ہے۔

چکبستؔ کے کلام کا یہ انتخاب ان کی سیاسی نظموں اور غزلوں کا نہیں بلکہ ان کی عمدہ اور متفرق موضوعات پر مبنی نظموں کا انتخاب ہے۔ چکبستؔ کی یہ نظمیں محض خیالات کی سطح پر ہی متاثر نہیں کرتی ہیں بلکہ زبان و بیان کے اعلیٰ و ارفع محاسن سے مزین ہونے کے ساتھ فکری سطح پر بھی بہت بلند معیار کی حامل ہیں۔ حب وطن سے متعلق چکبستؔ کی مایہ ناز نظم 'خاک ہند' کا بند ملاحظہ ہو:

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عز و شاں ہے
ہر صبح ہے خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی
اس خاک دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغ عالم تھی سر زمیں ہماری
شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
طاباں تھا مہر دانش اس وادیٔ کہن میں

حوالہ:

1۔ احمد، رضوان۔ روح چکبست (مرتبہ)، رام نرائن لال ارن کمار، کٹرہ الہٰ آباد، 1988، ص8
2۔ ایضاً، ص1
3۔ ایضاً، ص4-5
4۔ ایضاً، ص7
5۔ ایضاً، ص10
6۔ ایضاً، ص22
7۔ نبیل، عزیز۔ پنڈت برج نرائن چکبست: شخصیت اور فن (تدوین)، مجلس فخر بحرین برائے فروغِ اردو، مملکت بحرین، 2018، ص245

سبق اردو نومبر 2025
95

اردو شاعری اور افسانے میں وجودیت اور جدیدیت کا جامع مطالعہ

کھیتاوت رادھیکا

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

اردو ادب کی تاریخ میں بیسویں صدی ایک غیر معمولی فکری، سماجی اور تہذیبی تبدیلی کی صدی ہے۔ اس عہد میں برصغیر کے انسان نے وہ سب کچھ دیکھا اور جھیلا جس نے اس کی صدیوں پرانی فکری اور تہذیبی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ نوآبادیاتی نظام کے زیرِ اثر زندگی، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریاں، آزادی کی تحریک، تقسیمِ ہند، ہجرت کا المیہ، فرقہ وارانہ فسادات، نئی قومی ریاستوں کا قیام، صنعتی ترقی، شہریت اور شناخت کے نئے تصورات' یہ سب عوامل انسان کے ذہن اور شعور پر گہرے نقوش چھوڑ گئے۔

اردو ادب، جو ہمیشہ اپنے عہد کے اجتماعی اور انفرادی شعور کا آئینہ دار رہا ہے، اس فکری بحران سے الگ نہ رہ سکا۔ اب ادب کے سامنے صرف یہ سوال نہیں تھا کہ سماج کیسا ہونا چاہیے، بلکہ یہ بنیادی سوال بھی درپیش تھا کہ انسان خود کیا ہے، اس کا وجود کیا معنی رکھتا ہے، اور اس بے یقینی سے بھری دنیا میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ انہی سوالات کے بطن سے اردو ادب میں وجودیت (Existentialism) اور جدیدیت (Modernism) جیسے فکری و ادبی رجحانات ابھرے، جنھوں نے اردو شاعری اور افسانے کے موضوعات، اسالیب اور فکری جہات کو یکسر تبدیل کر دیا۔

یہ ادب اس انسان کا ادب ہے جو روایت، مذہب، تاریخ اور سماجی ڈھانچوں کے سہارے سے محروم ہو کر اپنے وجود کے بوجھ کو خود اٹھانے پر مجبور ہے۔

وجودیت: فلسفیانہ تصور اور اردو تناظر

وجودیت ایک فلسفیانہ فکر ہے جس کی بنیاد انسان کے فردی وجود، آزادیِ ارادہ، ذمہ داری، تنہائی، اضطراب اور زندگی کی بے معنویت پر قائم ہے۔ ژاں پال سارتر، البرٹ کامیو اور کیرکیگارڈ جیسے مفکرین کے مطابق انسان کسی طے شدہ مقصد کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے عمل اور انتخاب کے ذریعے اپنی زندگی کو معنی دیتا ہے۔ سارتر کے الفاظ میں:

''انسان پہلے وجود میں آتا ہے، پھر اپنی ماہیت خود تخلیق کرتا ہے۔''

یہی آزادی انسان کو شدید اضطراب اور خوف میں مبتلا کرتی ہے، کیونکہ اب وہ اپنی ناکامی اور کامیابی دونوں کا خود ذمہ دار ہے۔ البرٹ کامیو کے نزدیک انسان ایک ایسی دنیا میں جی رہا ہے جو خاموش اور بے حس ہے، جہاں اس کے سوالوں کا کوئی قطعی جواب موجود نہیں۔ یہی کیفیت Absurdity کہلاتی ہے۔

اردو ادب میں وجودیت کسی فلسفیانہ اصطلاح یا نظریاتی اعلان کی صورت میں نہیں آئی بلکہ انسانی تجربے، داخلی کرب اور نفسیاتی شکست کے طور پر سامنے آئی۔ تقسیم کے بعد کا انسان، جو اچانک تاریخ، جغرافیہ اور تہذیب سے کٹ گیا تھا، اپنے ہی وجود پر سوال کرنے لگا۔ انتظار حسین اس کیفیت کو نہایت سادگی مگر شدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں: ''ہم ایک ایسے زمانے میں جی رہے ہیں جہاں انسان کو اپنے ہونے پر بھی یقین نہیں رہا۔'' یہ جملہ اردو ادب میں وجودی شعور کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے۔

جدیدیت: روایت سے انحراف اور نئے ادبی شعور کی تشکیل

جدیدیت محض ایک ادبی تحریک نہیں بلکہ ایک فکری رویہ ہے جو روایت، مروجہ اقدار اور کلاسیکی اسالیب سے انحراف کرتا ہے۔ اردو ادب میں جدیدیت کا ظہور بڑی حد تک ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل کے طور پر ہوا، جہاں ادب کو زیادہ تر سماجی حقیقت نگاری اور سیاسی مقصدیت تک محدود کر دیا گیا تھا۔ جدیدیت نے ادب کو یہ حق دیا کہ وہ فرد کے باطن، اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں، تنہائی اور بے معنویت کو بھی موضوع بنائے۔ جدید ادب میں علامت، تجرید، ابہام، داخلی خود کلامی، زمانی انتشار اور اساطیری حوالوں کا استعمال بڑھ گیا۔ شمس الرحمن فاروقی کے مطابق جدید ادب: ''قاری کو تیار شدہ معنی نہیں دیتا بلکہ اسے معنی کی تلاش میں شریک کرتا ہے۔''

وجودیت اور جدیدیت کا باہمی رشتہ

اردو ادب میں وجودیت اور جدیدیت ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں۔ جدیدیت نے وجودی تجربے کے اظہار کے لیے نئے اسالیب فراہم کیے، جبکہ وجودیت نے جدید ادب کو فکری گہرائی عطا کی۔ فرد کی تنہائی، اجنبیت، داخلی کرب، بے معنویت اور شناخت کا بحران' یہ دونوں رجحانات کے مشترکہ موضوعات ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں وجودیت جدیدیت کے فکری بطن سے جنم لیتی ہے۔ اسی لیے جدیدیت اور وجودیت اردو ادب میں ایک دوسرے سے گہری طور پر جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جدید اسلوب کے بغیر وجودی تجربے کا اظہار ممکن نہ تھا۔

اردو شاعری میں وجودیت اور جدیدیت

اردو شاعری میں وجودی اور جدید رجحانات کا سب سے گہرا اظہار آزاد نظم اور نثری نظم میں ہوا۔ یہاں شاعر خارجی حسن و عشق کے بجائے انسان کی داخلی کشمکش، تنہائی، وقت کی بے معنویت اور ذات کی تلاش کو موضوع بناتا ہے۔ ن۔ م۔ راشد کو اردو شاعری میں جدیدیت کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں انسان تہذیبی زوال، اخلاقی شکست اور داخلی اضطراب کے بیچ کھڑا نظر آتا ہے۔ نظم زندگی سے ڈرتے ہو میں زندگی خود ایک سوال بن جاتی ہے:

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں

یہاں انسان اپنی ہی ہستی سے خوف زدہ دکھائی دیتا ہے، جو خالص وجودی کیفیت ہے۔

میراجی نے اردو شاعری میں لاشعور، جبلت اور ذات کے پیچیدہ

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

سبق اردو نومبر 2025

96

پہلوؤں کو موضوع بنایا۔ان کی شاعری میں انسان اپنے ہی اندر اجنبی ہوجاتا ہے:

یہی اک بات تو مشکل ہے، یہی اک بات تو سادہ ہے
کہ آدمی اپنے ہی اندر سے اجنبی کیوں ہے

یہ اجنبیت وجودیت کی بنیادی علامت ہے۔بعد کے شعرا میں منیر نیازی، ظفر اقبال اور خصوصاً جون ایلیا نے وجودی کرب کو نہایت شخصی اور بے باک انداز میں پیش کیا۔جون ایلیا کی شاعری سوال، انکار اور خودآگاہی کا استعارہ بن جاتی ہے:

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

یہ شعر جدید اردو شاعری میں وجودی فکر کی انتہائی صورت کو ظاہر کرتا ہے۔

اردو افسانے میں وجودیت اور جدیدیت

اردو افسانہ وجودی فکر کا سب سے مؤثر اظہار بن کر سامنے آیا۔خاص طور پر تقسیم کے بعد کے افسانوں میں انسان ایک بے جڑ، تنہا اور ٹوٹا ہوا کردار بن کر ابھرا۔انتظار حسین کے افسانوں میں ماضی، اساطیر اور علامتوں کے ذریعے جدید انسان کے وجودی بحران کو پیش کیا گیا ہے۔ان کے یہاں وقت زوال پذیر ہے اور انسان اپنی شناخت کھو چکا ہے۔قرۃ العین حیدر اردو فکشن میں جدیدیت کی سب سے توانا آواز ہیں۔آگ کا دریا میں وقت، تاریخ اور انسان کا وجود ایک مسلسل سوال بن جاتا ہے: ''صدیوں بدل گئیں، سلطنتیں اجڑ گئیں، مگر انسان کا سوال وہیں کا وہیں رہا۔'' یہ سوالی کیفیت اردو ادب میں جدیدیت اور وجودیت دونوں کی نمائندہ ہے۔

خالدہ حسین اور انیس ناگی کے افسانوں میں وجودی کرب چیخ کی صورت میں نہیں بلکہ خاموشی میں ظاہر ہوتا ہے: ''وہ ہنستی تھی، مگر اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ زندہ کیوں ہے۔''

یہ خاموش اضطراب جدید اردو افسانے کی نمایاں خصوصیت ہے۔

اثرات، اعتراضات اور ادبی معنویت

وجودیت اور جدیدیت نے اردو ادب کو محض خارجی حقیقت نگاری سے نکال کر داخلی سچائی کی طرف موڑا۔فرد کی ذات، اس کا شعور، اس کی تنہائی اور اس کے سوالات ادب کا مرکز بن گئے۔اگرچہ اس رجحان پر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ اس نے ادب کو مشکل، مبہم اور خواص تک محدود کر دیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے اردو ادب کو فکری گہرائی اور عالمی ادبی دھارے سے ہم آہنگی عطا کی۔یہ ادب آسان جواب فراہم نہیں کرتا بلکہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

نتیجہ

اردو شاعری اور افسانے میں وجودیت اور جدیدیت جدید انسان کے فکری بحران، تہذیبی اضطراب اور داخلی کرب کی علامت ہیں۔یہ ادب اس انسان کی آواز ہے جو بدلتی ہوئی دنیا میں اپنی شناخت، آزادی اور معنویت تلاش کر رہا ہے۔ن۔م۔راشد کی نظم ہو یا جون ایلیا کی غزل، انتظار حسین کا افسانہ ہو یا قرۃ العین حیدر کا ناول ہر جگہ انسان اپنے وجود سے سوال کرتا دکھائی دیتا ہے۔آج کے عہد میں، جب انسان ایک بار پھر عدم تحفظ، تنہائی اور معنوی بحران سے دوچار ہے، وجودی اور جدید اردو ادب کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔یہی ادب ہمارے فکری ارتقا کی علامت بھی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک گہرا اور زندہ فکری سرمایہ بھی۔

حوالہ جات

☆ راشد، ن۔م۔: ماورا، مکتبہ جدید، دہلی۔
☆ راشد، ن۔م۔: ایران میں اجنبی، مکتبہ جدید، دہلی۔
☆ میراجی: کلیاتِ میراجی، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور۔
☆ جون ایلیا: شاید، مکتبہ دانیال،
☆ جون ایلیا: یعنی، مکتبہ دانیال، کراچی۔
☆ انتظار حسین: گلی کوچے، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور۔
☆ انتظار حسین: شہر افسوس، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور۔
☆ قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا، مکتبہ جامعہ، دہلی۔
☆ قرۃ العین حیدر: آخرِ شب کے ہمسفر، مکتبہ جامعہ، دہلی۔
☆ خالدہ حسین: پہچان، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور۔
☆ انیس ناگی: افسانے، مکتبہ خیال، لاہور۔
☆ فاروقی، شمس الرحمن: جدیدیت: کل اور آج، شب خون پبلی کیشنز، الٰہ آباد۔
☆ وزیر آغا: اردو ادب میں جدیدیت، اردو اکادمی، لاہور۔
☆ گوپی چند نارنگ: اردو افسانہ اور جدید ذہن، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔
☆ آلِ احمد سرور: تنقیدی اشارے، مکتبہ جامعہ، دہلی۔
☆ سلیم احمد: مشرق و مغرب کے ادبی نظریات، مکتبہ اسلوب، لاہور۔
☆ محمد حسن عسکری: جدید ادب، مکتبہ جدید، لاہور۔
☆ احتشام حسین: اردو ادب میں حقیقت پسندی اور جدید رجحانات، نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی۔
☆ Sartre, Jean-Paul: Existentialism Is a Humanism, Yale University Press.
☆ Camus, Albert: The Myth of Sisyphus, Vintage Books.
☆ Kierkegaard, Søren: Fear and Trembling, Penguin Classics.
☆ شب خون (ادبی جریدہ)، الٰہ آباد۔
☆ آج (ادبی جریدہ)، کراچی۔
☆ فکر و تحقیق، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔
☆ UGC NET Urdu Syllabus, Government of India.

+

سبق اردو نومبر 2025
97

انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے زیر اہتمام

یوم ذوق منعقد

انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے زیر اہتمام اور بہ تعاون غالب انسٹی ٹیوٹ و غالب اکیڈمی 'یوم ذوق' کا انعقاد 22/نومبر کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ہوا۔ جلسے کی صدارت فارسی کے معروف محقق و نقاد پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی۔ انھوں نے کہا ذوق کی شخصیت اپنے زمانے میں سب سے زیادہ ممتاز سمجھی جاتی تھی۔ یہ شاعری کو ایک مختلف زاویے سے دیکھنے کا رجحان تھا۔ اس رجحان میں جب تبدیلی آئی تو انھیں وہ مقبولیت حاصل نہیں رہی جو کسی زمانے میں حاصل تھی۔ پروفیسر محمد کاظم نے کہا درجہ بندی تنقید کا ایک فریضہ ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک شاعر کا امتیاز ثابت کرنے کے لیے دوسرے سے موازنہ کیا جائے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا ذوق غالب کے معاصر بھی ہیں اور حریف بھی اس لیے اس عہد کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کے رائج تمام رجحانات کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ انجمن ترقی اردو (دہلی) کے صدر جناب اقبال مسعود فاروقی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا ہم ہر سال 'یوم ذوق' کا اہتمام کرتے ہیں اور اس طرح اردو کے ایک نہایت ممتاز شاعر کا کلام اور ان کی زندگی زیر بحث آتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بار بھی جو گفتگو ہو اس سے ذوق فہمی کا کوئی نیا گوشہ سامنے آئے۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا ذوق کا عہد اردو کا زریں عہد ہے۔ اس دور میں ہر شخصیت اپنے کچھ امتیازات رکھتی ہے۔ ذوق کا دیوان دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں مختلف اصناف میں کیسی قدرت حاصل تھی۔ خصوصاً قصیدے کے میدان میں تو وہ بہت ممتاز ہیں۔ اجلاس کے بعد طرحی مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب ظفر مرادآبادی نے کی اور جناب معصوم مرادآبادی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ مشاعرے کی نظامت جناب معین شاداب نے کی۔ جن شعرا نے کلام پیش کیا ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: جناب وقار مانوی، جناب متین امروہوی، جناب اقبال فردوسی، جناب اسد رضا، جناب صہیب احمد فاروقی، پروفیسر عفت زریں، جناب شاہد انور، ڈاکٹر دلدار دہلوی اور جناب ارن شریواستو۔ انجمن ترقی اردو (دہلی) کے جنرل سکریٹری جناب خورشید عالم نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا مجھے بہت خوشی ہے کہ آج کا جلسہ بہت کامیاب رہا اور لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

--
Ghalib Institute,
New Delhi -110002 (INDIA)
011-42448492

سبق اردو نومبر 2025
98

ISSN 2321-1601

RNI UPURD/2016/67444

INTERNATIONAL PEER REVIEWED (REFEREED) JOURNAL

SABAQ E URDU (Monthly)

Infront of Police Chowki,G.T.Road,Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

INTERNATIONAL PEER REVIEWED (REFEREED) JOURNAL BOARD

INDIA

1.PROFESSOR Md. Ehsan
Head, Department of Urdu,B. N. Mandal University,North Campus,Madhepura (Bihar)
Mob.- 83407 94295
hod@urdu.bnmu.ac.in
2.PROFESSOR JAHANGIR IQBAL
DEPT. OF PERSIAN,UNIVERSITY OF KASHMIR,SRINAGAR-190006
E.Mail:Jahangiriqbal@uok.edu.in
M.:70062 67565
3.PROFESSOR. Syed Sanaulla
Chairman,Dept. of PG Studies and Research in Urdu
Kuvempu UniversitySahyadri College Campus,Shivamogga-577 203 Karnataka
Mobile: 94482 38327
Email: sana.smga@gmail.com
4. DR QAISER AHMAD
MAULANA AZAD NATION UNIVERSITY,HYEDRABAD(TELENGANA)
qaiserahmad@manuu.edu.in
5.Dr Abdul Haque
Associate Professor/ Head Dept.of Urdu Govt.Degree College Thannamandi J&K(UT)
Email: abdulhaqnaimi786@gmail.com[
Mob:7051075603
6.Dr.Shaivya Tripathi
Associate Professor
Dept.of Urdu Bareilly College, Bareilly
M.:96902 66266
7.Dr.Nilofer Firdaus
Dept.Of Urdu,Aliah University, Kolkata700014
nilofer@aliah.ac.in
M.: 97947 22271
8.Dr Tasneem Fatma
(Assistant Professor Urdu & Critic)Patna
tasneem.fatma1380@gmail.com
M.:8409430281

FOREIGN

1.Prof. Nasir Abbas Naiyer
Institute of Urdu Language and Literature, University of the Punjab, Lahore
Email: nanayyar@gmail.com
2.Prof. Muhammad Kamran
Professor Institute of Urdu and Director Urdu Development Center,
University of the Punjab, Lahore, Pakistan
Email: drmkamran@gmail.com
3.Prof. Halil Toker
Head Dept. Of Urdu Istanbul University, Istanbul,Turkey
Email: khtoker1@gmail.com
4.Professor Mohammad Golam Rabbani
Department of Urdu, University of Dhaka.
Former Chairman, Department of Urdu, University of Dhaka (2011-2014)
Editor, Dhaka University Journal of Urdu, Dhaka Universi
5.Prof Dr. Gala Elsaid Mostafa Elhefnawi
Dept. of Urdu, Faculty of Arts,
Cairo University, Egypt
Email: ghefnawi@yahoo.com
6..DR.ALI BYAT,DEPT.OF URDU UNIVERSITY OF TEHRAN,bayatali@ut.ac.ir
7. Mukhayu Abdur Rahmanova
Tashkent State University of Oriental studies
Tashkent, Uzbekistan
Email: muhayabdurahman @yahoo.com
8.Nasir Nakagawa
Editor (Urdu Net Japan)
Akayama CH0 4-6-12
Koshighya City-343-0807, Japan
Email: nasir.nakagawa@gmail.com

سبق اردو نومبر 2025

99

EDITORIAL BOARD

(INDIA)

9.PROFESSOR Md. Ehsan
Dept.of UrduB. N. Mandal UniversityNorth Campus,
P. O.-Singheshwar-852128 Madhepura (Bihar)
M.: 83407 94295
10.PROFESSOR Syed Sanaulla,
Dept. of PG Studies and Research in Urdu
Kuvempu UniversitySahyadri College Campus,
Shivamogga-577 203,Karnataka
M.: 94482 38327
11.Dr. Shaivya Tripathi
Associate Professor
Dept.of Urdu Bareilly College, Bareilly
M.:96902 66266
12.Dr.Md.Ruknuddin
Assistant Professor
Satyawati College,University of Delhi,DELHI
M.: 9891765225
Email: ruknuddin@ www.worldurdurnp.com
13.Sana Fatima
Managing Editor "Tarjeehat"
New Delhi 110025, India
Email:managingeditor@worldurdurnp.com
14.NILOFAR HAFEEZ
DEPT. OF PERSIAN, UNIVERSITY OF
ALLAHABAD,PRAYAGRAJ
neelofarhafeez@allduniv.ac.in
M.:75009 84444
15.Dr.Nilofer Firdaus
Dept.Of Urdu,Aliah University, Kolkata700014
nilofer@aliah.ac.in
M.: 97947 22271
16.DR WASI AHMAD AZAM ANSARI
KHWAJA MOINUDDIN CHISHTI LANGUAGE
UNIVERSITY,LUCKNOW
wasiazam@kmclu.ac.in
M.:9621272244
17.Dr. Abdul Hai
Dept. of Urdu& Persian,
C. M. College Darbhanga, Bihar 846004
E.Mail: ahaijnu@gmail.com
18.Dr Tasneem Fatma
(Assistant Professor Urdu & Critic),Patna
tasneem.fatma 1380 @gmail.com
M.:8409430281
19.Dr. Ramisha Qamer
Dept. of Urdu, Gulbarga University, Karnataka
E.mail: ramishaqamar@www.worldurdurnp.com

EDITORIAL BOARD

(FOREIGN)

8.Dr. Farzaneh Azam Lotfi
Dept. Of Urdu
University of Tehran, Iran
Email: f.azamlotfi@ut.ac.ir
9.Nasir Nakagawa
Editor (Urdu Net Japan)
Akayama CH0 4-6-12
Koshighya City-343-0807, Japan
Email: nasir.nakagawa@gmail.com

Dr. Shagufta Firdous
Director Student Affairs & Assistant Professor
Department of Urdu, G.C Women University,
Sialkot
Email: shaguftafirdous2 @gmail.com

10.Rubina Faisal
3615, Rainpark Court,
Mississauga, ON L5M 6X6, Canada
Email: rubinafaisal@ rogers.com
11.Sameera Aziz
Jeddah, Saudi Arabia
Email: sameera.aziz.media@ gmail.com
12.Professor Mohammad Golam Rabbani
Department of Urdu, University of Dhaka.
Former Chairman, Department of Urdu, University
of Dhaka (2011-2014)
Editor, Dhaka University Journal of Urdu, Dhaka
Universi

EDITOR: DR. MOHD SALEEM

CHIEF EDITOR : DANISH ALLAHABADI

PTO

سبق اردو نومبر 2025

100

ISSN 2321-1601

RNI UPURD/2016/67444

INTERNATIONAL PEER REVIEWED (REFEREED) JOURNAL

SABAQ E URDU (Monthly)

Infront of Police Chowki,G.T.Road,Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

EDITORIAL BOARD

PROFESSOR KHWAJA MD. EKRAMUDDIN

(patron)

INDIA

1.PROFESSOR NAJMA RAHMANI,
DEPT. OF URDU,DELHI UNIVERSITY,DELHI
E.Mail: nrehmani@urdu.du.ac.in
M.:99534 79211
2.PROFESSOR SHABNAM HAMEED
UNIVERSITY OF ALLAHABAD,PRAYAGRAJ
M.:9839055704
3.PROFESSOR SHAHZAD ANJUM
DEPT.OF URDU,JAMIA MILLIA ISLAMIA,NEW DELHI
M.:88008 63994
4.PROFESSOR EHSANUL HAQ (KAUSAR MAZHARI)
DEPT.OF URDU,JAMIA MILLIA ISLAMIA,NEW DELHI
E.Mail:mhaq@jmi.ac.in
M.:98187 18524
5.PROFESSOR ZEBA MAHMOOD
DEPT.OF
URDU,G.S.P.G.COLLEGE,SULTANPUR(UP)
M.:98392 22385
6.PROFESSOR SHAHAB ZAFAR AZMI
PATNA UNIVERSITY,PATNA
E.Mail:hodurd@patnauniversity.ac.in
M.:88639 68168
7.PROFESSOR JAHANGIR IQBAL
DEPT. OF PERSIAN,UNIVERSITY OF KASHMIR,SRINAGAR-190006
E.Mail:Jahangiriqbal@uok.edu.in
M.:70062 67565

FOREIGN

1.Prof. Halil Toker
Head Dept. Of Urdu Istanbul University,
Istanbul,Turkey
Email: khtoker1@gmail.com
2.Prof. Muhammad Kamran
Professor Institute of Urdu and Director Urdu Development Center,
University of the Punjab, Lahore, Pakistan
Email: drmkamran@gmail.com
3.Prof. Nasir Abbas Naiyer
Institute of Urdu Language and Literature,
University of the Punjab, Lahore
Email: nanayyar@gmail.com
4.Prof Dr. Gala Elsaid Mostafa Elhefnawi
Dept. of Urdu, Faculty of Arts,
Cairo University, Egypt
Email: ghefnawi@yahoo.com
5.DR.ALI BYAT,DEPT.OF URDU UNIVERSITY OF TEHRAN,bayatali@ut.ac.ir
6. Mukhayu Abdur Rahmanova
Tashkent State University of Oriental studies
Tashkent, Uzbekistan
Email: muhayabdurahman @yahoo.com
7.Dr.Arif Mahmud Kisana
Berberisvagen 10, 19734 BRO
Sweden
Email: arifkisana@gmail.com

PTO

This document was created with the Win2PDF “Print to PDF” printer available at

https://www.win2pdf.com

This version of Win2PDF 10 is for evaluation and non-commercial use only.
Visit https://www.win2pdf.com/trial/ for a 30 day trial license.

This page will not be added after purchasing Win2PDF.

https://www.win2pdf.com/purchase/